سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ ۲۶

تاریخ گولکنڈہ

از

عبد المجید صدیقی

ام اے - ال ال بی - استادِ تاریخ
جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۹۳۹ء

مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن

صفحات (۳۵۰)   قیمت ۸ روپے

فہرست مضامین

فہرست تصاویر

دیباچہ

میں ایک مدت سے گولکنڈے کی، جہاں میری پشتیں گذری ہیں، ایک مبسوط تاریخ لکھنا چاہتا تھا جو میرا فرض ہے کیونکہ یہ ایسی پُر مغز تاریخ ہے کہ بغیر اس کے مطالعے کے دکنی تمدّن وسیاست کی صحیح تلاش نہیں ہوسکتی لیکن افسوس ہے کہ اس پر اب تک قلم نہیں اُٹھایا گیا، اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے میں نے بھی اس میں بہت تاخیر کی۔ تاہم میں اس موضوع کا برابر مطالعہ کرتا رہا، اور بدفعات مضامین بھی لکھے تھے جو تقریباً ہر دَور اور عہد پر حاوی ہیں اور خیال تھا کہ انھیں مضامین کو جوڑ کر ایک کتاب کی شکل میں پیش کردوں لیکن جب میں ان مضامین کو جمع کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ کافی نہیں ہیں، بلکہ اس میں ابھی بہت کچھ کام کرنا ہے، کیونکہ اس موضوع کے مطالعے میں جن ماخذوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ کئی طرح کے ہیں کچھ تو مقامی ماخذ ہیں اور کچھ بیرونی مورخوں اور سیاحوں کے بعض مورخوں اور سیاحوں نے جنھیں پوری واقفیت نہیں تھی، بہت غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور بعض مورخوں نے دانستہ اشتہار بازی کی ہے اس طریقے سے قطب شاہی سلطنت کے نصب العین سے متعلق صحیح رائے قایم کرنا مشکل ہے۔ اس میں بڑی چھان بین کی ضرورت ہے جو آسان نہیں ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ باوجود اس محنت کے میں اس مضمون کا حق ادا نہیں کرسکا۔ ابھی اس کے بعض ماخذ ایسے ہیں جو میری دسترس سے باہر ہیں، اگر ان کا مطالعہ ہو تو اس تاریخ میں بیش بہا اضافہ ہوسکتا ہے۔

لیکن جو کچھ رطب ویابس ناظرین کے سامنے پیش ہے وہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا رہین منت ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف جن کی بدولت آج حیدرآباد میں علمی کام کرنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہورہی ہے، اس تالیف کے

اصل محرک ہیں سچ تو یہ ہے کہ موصوف کے شدید تقاضے اور اصرار سے یہ کتاب تیار ہوئی ورنہ اس میں بہت تاخیر ہوتی۔
اس کے علاوہ ہمارے ادبی کرم فرما پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی حوصلہ افزائی اور ادبی مشوروں کا میں
بہت شکر گذار ہوں موصوف نے ہر آڑے وقت میری حوصلہ افزائی کی، نیز مجھے بھوپال راؤ صاحب ام لے کا شکریہ ادا
کرنا ہے جن کی وجہ سے مجھے کرناٹک اور مادنا کے خاندان سے متعلق معلومات دستیاب ہوئیں یہ معلومات مدراس کے
مشرقی کتب خانے اور تلنگی ماخذوں سے حاصل ہوئی ہیں۔ آخر میں عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی اس سی عثمانیہ کا بھی
شکریہ ضروری ہے جنھوں نے مسودوں کی ترتیب، کاپیوں اور پروف کی اصلاح میں پوری مدد دی مولوی
عبدالحق صاحب کامل نے میرے دوسرے فرائض اپنے ذمے لے کر میرا کام بہت ہلکا کر دیا، ورنہ یہ کام جلد نہ ہو سکتا۔
مجھے افسوس ہے کہ لکھائی اور چھپائی کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں رہ گئیں جو بعض جگہ بد نما معلوم
ہوتی ہیں لیکن کتاب کے آخر میں ایک صحت نامہ منسلک کر دیا گیا ہے جس سے اس خرابی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

صدیقی

حمایت نگر روڈ حیدرآباد دکن
جمادی الاول ۱۳۵۸ھ
جون ۱۹۳۹ء

مُقدّمہ

گولکنڈے کی دو سَو سال کی تاریخ ہے، دکن کی اور ہمسر سلطنتوں کے ساتھ پندرھویں صدی کے آخری عشرہ میں اس کی داغ بیل پڑی تھی اور سترھویں صدی کے اواخر میں اس کا خاتمہ ہوا چونکہ یہ ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی گوشے میں واقع تھی اس لیے اپنے موقعہ محل کے اعتبار سے یہ ہندوستان کے بڑے سیاسی اور تمدنی مرکزوں سے بہت دُور تھی۔ اس کا بہت سوں کو علم نہیں تھا، اور اب بھی ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے بادلِ ناخواستہ اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو بہ مشکل تاریخِ ہند کے ایک گوشے میں جگہ ملتی ہے لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو سلطنتِ گولکنڈہ آندھرا دیش کی بہت بڑی سلطنت تھی۔ اس کی ایک وسیع تاریخ ہے جس کے ہر مد وجزر میں تمدن کی بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ وہ سلطنت تھی جس کا خوشگوار تمدن دو سَو سال تک تلنگانہ کے رہنے والوں کو گرویدہ کیے ہوئے تھا۔ اگرچہ بعض ممالک میں یہ "ہیروں کی سلطنت" مشہور تھی، اور وسطِ ایشیا کے تاجر صرف ہیروں کی وجہ سے اس کو جانتے تھے لیکن مغربی سیاحوں کو اس کا درخشاں تمدن کھینچ لاتا تھا جو سیاح شمالی ہندوستان دیکھتے تھے وہ گولکنڈہ دیکھنے کے لیے ضرور آتے تھے اور اپنے ساتھ نئے تاثرات لے جاتے تھے۔ اطالوی سیاح لوچی نے گولکنڈے کا نظارافروز مرقع کھینچ کر لکھا تھا "یہ ہے وہ گولکنڈہ جو دو تین صدیوں تک ہندوستان کا اعجوبہ بنا ہوا تھا۔"

قطب شاہی سلطنت کو اس لامرکزیت کی پیداوار سمجھنا چاہیئے جو پندرھویں صدی کے آخر میں تمام دکن پر چھاگئی۔ یہ ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا جس کی تاریکی میں دُور بیں اہلِ بصیرت بھی مستقبل کا صحیح پتا نہیں لگا سکے کہ دکن کس طرف جارہا ہے۔ یہ اصل میں سلطنتِ بہمنی کا افسوسناک زوال تھا جس نے دیکھتے دیکھتے تمام دکن کو متزلزل کر دیا۔ چودھویں صدی کے وسط میں یہ سلطنت قایم ہوئی تھی اور اپنے لایق بادشاہوں کی رہنمائی میں سَو سال تک پروان چڑھتی رہی۔ اس کے بانی دکن کے تاریخ ساز "اُمرائے صدہ" تھے جنھوں نے اپنے ایک برگزیدہ حلیف علاؤالدین حسن بہمن شاہ کو ۔۔ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں اپنا بادشاہ منتخب کرکے اس سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور رفتہ رفتہ اس کو مستحکم اور اقبال مند بنایا

فیروز شاہ بہمنی کے آخری عہد تک جو اس سلطنت کا بام عروج تھا اس کی رفتار ترقی میں کوئی فرق نہیں آیا چنانچہ اس زمانے میں اس سلطنت نے دکن کی خوابیدہ طاقتوں کو جگایا۔ تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلائی۔ لیکن فیروز شاہ کے جانشین احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد سے جو ۸۲۶ھ ۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوا تھا یہ سلطنت بد قسمتی سے طبقہ واری کش مکش کا شکار ہونے لگی جو بالآخر اس کے لیے پیام موت ثابت ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ملک کی آبادی دو مخالف فرقوں میں منقسم ہوگئی جو دکنی اور غیر دکنی کہلاتے تھے اول الذکر تو سلطنت بہمنی کے حقیقی حامل "امرائے صدہ" کی اولاد تھے جو اپنے کو دکن کا حقیقی وارث سمجھتے تھے کیونکہ انہیں کے آبا و اجداد نے دکن کو اپنا گھر بنایا اور بہمنی سلطنت کو سنوارا تھا۔ آخر الذکر میں نو وارد ترک و ایرانی افراد تھے جو حکومت کی مہمان نوازی سے فایدہ اٹھا کر چپکے چپکے سلطنت پر چھا گئے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں طبقوں میں رقابت پیدا ہوئی جو بالآخر بہت شدید ہوگئی۔ یہ بہت دلخراش منظر تھا کہ جو طاقتیں متحدہ طور پر ملک کی خدمت میں مصروف تھیں وہ اب ایک دوسرے کی رقابت میں ضائع ہونے لگیں اور اس سے ملک کو بہت نقصان پہنچنے لگا۔ اس کش مکش کا پہلا منظر علاء الدین ثانی کے عہد میں اور دوسرا منظر محمد شاہ لشکری کے عہد میں سامنے آیا جبکہ ان دونوں طبقوں میں سخت خونریزی ہوگئی۔ خلف حسن بصری اور محمود گاواں اسی کش مکش کا شکار ہوئے۔ مشکل یہ تھی کہ محمود گاواں نے جو محمد شاہ لشکری کا وزیر تھا تمام مملکت کچھ اس طریقے سے اپنے میں جمع کر لی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی شخص اس سلطنت کا رکھوال نہیں ہو سکا کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے کوئی صحیح جانشین نہیں پیدا کیے تھے جو اس کی کھلی خود غرضی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ محمود گاواں کے قتل کے بعد جو ۸۸۶ھ ۱۴۸۱ء میں ہوا سلطنت بہمنی کا فوراً شیرازہ بکھرنے لگا۔ جو لوگ اس سلطنت کے عمائد سمجھے جاتے تھے وہ علانیہ منحرف ہونے لگے! اور جب ایک سال کے بعد ہی محمد شاہ لشکری کا انتقال ہوگیا اور اس کا کمسن بیٹا محمود شاہ اس کا جانشین قرار دیا گیا تو اس انتشار میں اور اضافہ ہوا چنانچہ ۸۹۶ھ ۱۴۹۰ء میں جس کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہیئے تمام صوبہ دار جو مختلف صوبوں پر قابض تھے خود مختار ہوگئے اور اس طریقے سے نظام شاہی، عادل شاہی اور عماد شاہی سلطنتیں قایم ہوگئیں۔

اگرچہ اس گھٹا ٹوپ میں قطب شاہی سلطنت بھی قایم ہوئی تھی مگر عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں کی طرح اس سلطنت کو طبقہ واری کش مکش کی راست پیداوار سمجھنا صحیح نہ ہوگا! اول تو قطب شاہی سلطنت کے بانی

سلطان قلی قطب شاہ کو طبقہ واری کش مکش سے قطعاً تعلق نہ تھا کیونکہ بیدر میں اس کا ورود محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہوا تھا جبکہ محمود گاواں اور نظام الملک بحری مر گئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو طبقہ واری کش مکش کی آگ ابھی باقی تھی لیکن اس کے اکثر شعلے بجھ گئے تھے محمود گاواں کی اکھاڑا بندی کا خاتمہ ہو گیا تھا اور اب کسی جماعت بندی کے موقعے باقی نہ تھے چنانچہ جب سلطان قلی بہمنی دربار میں داخل ہوا تو اس کو کسی فرقہ بندی سے سابقہ نہیں پڑا گو محمود گاواں کے فریق کی طرح یہ بھی نووارد تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اہل بیدر نے ۸۹۶ھ/۱۴۹۱ء میں محمود شاہ پر یورش کی تھی تو حسن علی سبزواری اور سید مرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی نے بھی بادشاہ کی مدد کی اور اس کی جان بچائی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو نوواردوں کے ساتھ خاص ہمدردی اور اہل ملک کے ساتھ کوئی رقابت نہ تھی۔ برخلاف اس کے سلطان قلی نے اپنے بلند کردار کی وجہ سے ملک اور شاہی محل میں بہت جلد اپنا سکہ بٹھا دیا اور اسی وجہ سے اس کو سلطنت کی بڑی بڑی خدمتیں دی جانے لگیں اس کے علاوہ سلطان قلی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء میں تلنگانے کا صوبہ دار ہوا تھا جو سلطان محمود شاہ کی عطا تھی۔ برخلاف اس کے نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے بانی محمد شاہ لشکری کے عہد کے صوبہ دار تھے اور یہ اپنے صوبوں میں ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں خود مختار ہو گئے تھے جبکہ سلطان قلی تلنگانے کا صوبہ دار بھی نہیں ہوا تھا، نیز سلطان قلی نے اپنے مربی محمود شاہ کے انتقال کے بعد ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس زمانے تک نہ صرف یہ سلطنت بہمنی کا صوبہ دار رہا بلکہ اپنے بادشاہ کی ہر طرح مدد کی جو اس کی وفاداری کی دلیل ہے اس طریقے سے تلنگانے کی قطب شاہی سلطنت اواخر سولھویں صدی کی عام سیاسی رو سے علحدہ رہی اور اس کا پس منظر وہ نہیں تھا جو نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کا ہے۔

گولکنڈے کی سلطنت بڑے آب و تاب کے ساتھ قایم کی گئی تھی اس کی تعمیر میں وہ نصب العین شامل تھا جو متمدن سلطنت کے لیے ضروری ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کی تاسیس اور تعمیر ایسے افراد کے ہاتھوں سے ہوئی تھی جو بڑے تمدن کے حامل تھے اور بڑی خاندانی روایات کے ساتھ تلنگانے میں آئے تھے جب سلطنت قایم ہوئی تو اس کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا گیا جو اس کے جغرافیے، اور حدودی خصوصیات کے لیے مناسب تھا۔

پہلے تو قطب شاہوں نے اپنے کو اس سرزمین سے ایسا پیوست کیا کہ دو پشتوں کے بعد یہ بالکل دکنی ہو گئے تلنگی رعایا کو اپنا تمدن دیا اور ان کی روایتیں خود اختیار کر لیں مُلک کی رہنمائی کے لیے لایق ارباب بست و کشاد مامور کیے۔ سلطنت کو قدرتی حدود تک پہنچایا، مُلک میں بہترین تمدنی ذخائر جمع کیے۔ شہروں کی تعمیر کر کے اہلِ تلنگانہ کی تمام ذہنی و اخلاقی قوتیں ایک جگہ جمع کر دیں۔ مسجدیں۔ مدرسے۔ خانقاہیں اور کاروان سرائیں بنائی تھیں۔ باغ و عمارات کے ذریعے فنونِ لطیفہ کی اس قدر خدمت کی گئی کہ اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں اہلِ مُلک کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا اتنا اچھا سامان پیدا کیا کہ تلنگانے کے تمام طول و عرض میں ایک روشنی پھیل گئی، اسلامی علوم و فنون کے ساتھ اُردو اور تلنگی زبان کی اس طرح خدمت کی گئی کہ گویا یہ ان کی زبان ہے چنانچہ قطب شاہی دَور کو اُردو و تلنگی کا سنہری زمانہ کہنا چاہیئے، اور یہ ایسا پائدار تمدن تھا کہ گولکنڈے کے زوال کے بعد یہ فنا نہیں ہوا اب بھی تلنگانے کے طول و عرض میں قطب شاہی تمدن کے بہتیرے آثار اور نقوش پائے جاتے ہیں۔ تلنگانے کی معاشرت میں اس کے اجزا موجود ہیں۔ گولکنڈہ اُجڑنے کے بعد بھی اس سلطنت کے شاعر و ادیب جنوبی دکن یعنی کرناٹک میں اپنی جگہ کر کے شعر و سخن کی خدمت کرتے رہے اور بہت بڑا ادبی سرمایہ پیدا کیا جس کو قطب شاہوں کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔

حصّہ اوّل

سلطنت کی تاسیس

پہلا باب

قطب شاہی گھرانا

آبا و اجداد | سلطان قلی قطب شاہ جس کے مبارک ہاتھوں سلطنت گولکنڈہ کی بنیاد پڑی تھی ترکستان کے ایک بہت بڑے قبیلے قرا قونیلو کا رکن تھا۔ گولکنڈہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلے نے ترکستان کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی تھی اور وہاں سے پیشقدمی کرکے یہ قبیلہ مغربی ایران پر قابض ہو گیا تھا۔ قرا یوسف سکندر شاہ اور جہاں شاہ جیسی زبردست شخصیتیں اس قبیلے میں پیدا ہوئیں، جو ایران کی جلیل القدر حکمران تھیں۔ درو سط ایشیا کی تاریخ میں تیمور صاحبقران کے بعد انہیں کا درجہ تھا۔ اس قبیلے نے چنگیز خاں کا پرزور مقابلہ کیا تھا اور اس کی کبھی اطاعت اختیار نہیں کی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ابو سعید مرزا کے زمانے تک خود مختار رہے۔ قرا یوسف تیمور کا ہمعصر تھا جس نے تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرکے اپنے اور اپنے قبیلے کی ہستی قایم رکھی تھی۔ ترکستان کا یہی واحد قبیلہ تھا جس کے مقابلے میں تیمور اور اس کے جانشینوں کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑی تھی۔ جہاں شاہ نے شاہ رخ مرزا کو بارہا شکستیں دی تھیں جب اس کا انتقال ہوا تو یہی جہاں شاہ تیموری سلطنت کے ایک وسیع حصے پر مسلط ہو کر شاہ رخ کی تخت و تاج کا مالک ہو گیا تھا۔[1]

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری ترک قبیلوں کے احیا کا زمانہ ہے اسلام سے وابستہ ہونے کے بعد ان میں تہذیب و شائستگی

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۳۔ تاریخ فرشتہ ص ۱۶۷۔

پیدا ہوئی اور وہ منتشر ہو کر دنیا کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئے۔ قبیلۂ قراقونیلو کی ترقی بھی غالباً اسی زمانے میں ہوئی ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں اس قبیلے میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے اور یہ قبیلہ بحیثیت ہو کر شاہ راہ ترقی پر گامزن ہو گیا اس قبیلے کا سب سے پہلا سردار اغرخاں بن قراخاں بتایا جاتا ہے جس نے سب سے پہلے اس قبیلے کی تعمیر کی تھی۔ اکثر مورخ لکھتے ہیں کہ یہ شخص یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا[1]۔ اگرچہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے یہ لوگ ترکستان کے حاکم تھے، لیکن اس قبیلے کی اصل ترقی اغرخاں کے زمانے سے شروع ہوتی ہے جس نے اسلام قبول کر کے قراقونیلو قبیلے میں روح پھونکی تھی چنانچہ اغرخاں کی وجہ سے یہ لوگ ترکستان کے اکثر اقطاع پر قابض ہو گئے اغرخاں نے ستر سال بادشاہی کی۔ تورہ بیگ ترکستان کا والی ہو گیا تھا۔ یہ ترکستان کا وہ پر آشوب زمانہ تھا جب کہ اس ملک پر چنگیز خاں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل تورہ بیگ اس بڑھتی ہوئی آندھی سے گھبرا کر ماوراءالنہر کی طرف بھاگ گیا۔ مگر جب چنگیز خانی سیلاب سلطان خوارزم پر امنڈنے لگا تو تورہ بیگ نے کفار منگول کا مقابلہ ضروری سمجھا۔ اور اپنی بساط کے موافق چنگیز خاں کی مزاحمت کی اور اپنی سلطنت کو بچائے رکھا چنانچہ اسی پر زور مدافعت کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ کبھی چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حلقہ بگوش نہیں ہوئے[2]۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں حملوں سے ہٹ کر یہ مغربی ایران پر مسلط ہو گئے تھے اور ہمدان ان کا مرکز بن گیا تھا۔

قرا یوسف تورہ بیگ کی چھٹی پشت میں تھا جو اپنی خاندانی سلطنت کا جانشین ہوا۔ یہ وسط ایشیا کے جلیل القدر حکمرانوں میں سے ہے، جو تیمور صاحبقران کا ہمعصر تھا جب ۸۰۳ھ ہجری میں تیمور کے حملے شروع ہوئے تو اس قبیلے پر بڑی مصیبت آ گئی لیکن قرا یوسف کی عظمت تیمور کی سد راہ تھی۔ قرا یوسف نے تیموری افواج کی پوری مزاحمت کی۔ اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو بچائے رکھا بلکہ تیموری بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں اس نے ایران میں غیر معمولی طاقت

---

[1] حدیقۃ السلاطین قطب شاہی ص ۴۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص ۳۔

فراہم کرلی۔ تیمور کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں کے ساتھ متعدد معرکے ہوئے اور قرا یوسف کی تمام تر زندگی اسی جدال و قتال میں گذری۔ ان تیموری سیلابوں کے باوجود جن کے سامنے کسی طاقت کا ٹھیرنا محال تھا، قرا یوسف کی عظیم الشان سلطنت قایم تھی جو عراق و عرب کی آخری سرحد سے لیکر آذر بائیجان تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۸۲۳ھ (۱۴۲۰ء) ہجری میں اس کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے امیرزادہ سکندر کو جو سکندر ثانی کے نام سے مشہور ہے تخت نشین کیا گیا۔ جہاں شاہ سکندر کا بھائی ہے۔ جب سکندر کو اس کے بیٹے کیقباد نے قتل کردیا تو جہاں شاہ نے اپنی طاقت بڑھائی اور عراق عرب پر قابض ہوگیا، اور جب ۸۵۰ھ (۱۴۴۶ء) ہجری میں شاہ رخ مرزا کا انتقال ہوگیا تو اس کے لیے اور بھی راستے صاف ہوگئے۔ چنانچہ اس وقت تاج شاہی زیب سر کرکے اس نے اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کردیا اور اس قدر زور سے پیشقدمی شروع کردی کہ ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) ہجری میں یہ عراق عرب و عجم کے پورے ملک پر قابض ہوگیا اور اس کے حدود سلطنت آذر بائیجان سے دریائے عمان تک پہنچ گئے۔ ۸۵۹ھ (۱۴۵۵ء) ہجری میں یہ بغداد پر قابض ہوا، اور ۸۶۲ھ (۱۴۵۸ء) ہجری میں شاہ رخی تخت پر بیٹھ گیا۔[1]
قبیلۂ قراقوئنلو کی یہ غیر معمولی ترقی تھی۔ جہاں شاہ کو صرف یہ ڈر تھا کہ سکندر ثانی کے بیٹے شاہزادہ الوند اور کیقباد اس کی مخالفت کرینگے۔ ان شاہزادوں کے ساتھ اس نے کوئی دشمنی نہیں کی، بلکہ ان کے ساتھ ایک بزرگ خاندان کی طرح پوری ہمدردی کی۔ کیقباد کا تو انتقال ہوگیا تھا، مگر الوند اپنے باپ سکندر کا جانشین ہوگیا۔ جہاں شاہ نے نہ صرف اپنا موروثی ملک ہمدان اس کے سپرد کردیا، بلکہ اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی پیدا کرلیے۔ الوند کے بیٹے پیر قلی بیگ سے شاہزادہ یوسف کی بیٹی یعنی اپنی پوتی خدیجہ بیگم کی شادی کردی۔ ان سے اویس قلی اور اللہ قلی دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ان میں سے اویس قلی اپنے باپ پیر قلی کے انتقال کے بعد ہمدان کا والی ہوگیا۔ اویس قلی کی شادی ملک صالح کی بیٹی مریم خاتون سے ہوئی تھی جو اکابر ہمدان سے تھا۔ ان کے بطن سے گولکنڈے کا بانی سلطان قلی پیدا ہوا، اس کے نانا ملک صالح نے بچے کے خاندانی روایات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا نام سلطان قلی رکھا تھا۔[2] جو بعض جگہ محمد قلی بھی لکھا گیا ہے لیکن یہ صحیح

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۲۲ و ۲۴۔ [2] تذکرۃ الملوک خانی ص ۱۳۴۔

نہیں معلوم ہوتا۔ اس سلسلۂ نسب سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان قلی ترکستان کے ایک بہت ہی معزز اور جلیل القدر حکمران خاندان کا رکن ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب ایک طرف قرا یوسف اور سکندر ثانی تک پہنچتا ہے تو دوسری طرف یہ اپنی ماں کی طرف سے جہاں شاہ کی اولاد میں ہے! اس لیے اس خاندان قطب شاہیہ کو قرا یوسفیہ اور جہاں شاہیہ بھی کہتے ہیں[1]۔ مورخ فرشتہ کے نزدیک یہ سلسلۂ نصب زیادہ موثق نہیں ہے، وہ سلطان قلی کو قوم بہارلو سے منسوب کر کے میر علی شکر کو اس کا مورث اعلیٰ تصور کرتا ہے[2]۔

سلطان قلی کا دکن سے تعلق ہر تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان قلی کے دکن آنے کا بہت بڑا سبب خاندان جہاں شاہیہ کی تباہی اور قبیلۂ آق قونیلو کا ترکستان پر تسلط ہے۔ یہ ترکستان کا دوسرا حریف قبیلہ تھا جو دیار بکر کا حاکم تھا اس قبیلے کے اراکین اور زمیں قدیم زمانے سے قرا قونیلو قبیلے کے دشمن تھے، اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جہاں شاہ کا ہمعصر امیر حسن بیگ جو دیار بکر میں خاندان قرا یوسفیہ کی بیخکنی کے درپے تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں شاہ کی غالب طاقت کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں چلتی تھی۔ ۸۷۲ھ ۱۴۶۷ء ہجری میں جہاں شاہ کا اس قدر طوطی بول رہا تھا کہ سوائے اس امیر حسن بیگ کے ترکستان میں اس کا کوئی حریف نہ تھا لیکن جہاں شاہ کی بدقسمتی سے ایک موقع پر امیر حسن بیگ کی آرزو پوری ہوگئی۔ جب جہاں شاہ نے دیار بکر پر حملہ کیا تو حسن بیگ نے ملمع سازی کرکے صلح کر لی اور جھوٹی اطاعت کا اظہار کیا۔ جہاں شاہ نے غلطی سے اس اطاعت پر اعتماد کرکے دشمن سے غفلت کی اور عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا۔ اب حسن بیگ کو موقعہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر جہاں شاہ پر حملہ کر دیا جس میں ایران کا یہ بڑا تاجدار مارا گیا۔ اس کے بیٹے شاہزادہ یوسف اور شاہزادہ محمد گرفتار ہوئے اور تمام سامان شاہی دشمن کے ہاتھ لگا۔ جہاں شاہ کا جس نے ایران میں (۳۵) سال حکومت کی تھی اس طرح مارا جانا ہمدان کے خاندان قرا یوسفیہ کا

---

[1] حدیقۃ السلاطین۔ [2] فرشتہ ص ۱۶۷۔ لیکن گولکنڈہ کی مستند تاریخوں سے جو خود گولکنڈہ میں لکھی گئیں، اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ تاریخیں گولکنڈہ کے حالات کے لیے فرشتے سے زیادہ مستند ہیں۔ فرشتے نے گولکنڈہ کی تاریخ میں بہت غلطیاں کی ہیں۔

خاتمہ تھا۔ آق قویونلو، جہاں شاہ کی تمام سلطنت پر قابض ہو گئے اور قرایوسفی خاندان کے تمام اراکین کو قتل کرنے لگے۔ ہمدان کے اس چھوٹے سے خاندان کی تباہی آنکھوں کے سامنے تھی[1] اُس وقت ہمدان میں چونکہ پیر قلی اپنے باپ کے انتقال کے بعد وارث خاندان تھا، امیر حسن بیگ کی دشمنی کا نشانہ بن گیا۔ قرائن یہ تھے کہ اس کا بھی خاتمہ ہو جاتا" لیکن حالات کچھ موافق ہو گئے۔ اکابر ہمدان کی سفارش سے اُس کی جان بچ گئی۔ یوں بھی پیر قلی نہایت خاموش اور خانہ نشیں آدمی تھا۔ اکابر ہمدان نے حسن بیگ کو یہ سمجھایا کہ پیر قلی ایک خانہ نشیں اور بے ضرر آدمی ہے اس کو نقصان پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ اس سفارش کی بنا پر پیر قلی کو چھوڑ دیا گیا، اور اس طریقے سے ہمدان کے[2] اس قدیم خاندان کی ہستی باقی رہ گئی۔

جب تک حسن بیگ اور اس کا بیٹا خلیل سلطان زندہ رہے اس وقت تک ہمدان کے قرایوسفیہ خاندان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن جب ان کے انتقال کے بعد امیر یعقوب بادشاہ ہوا تو بُرے دن عود کر آئے۔ امیر یعقوب نے رعایا کی چھان بین شروع کی اور ہمدان کا جائزہ لیا۔ اس وقت اویس قلی کا بیٹا سلطان قلی سن شعور کو پہنچ چکا تھا، اور اس میں سیاسی قابلیت کے آثار نمودار ہو رہے تھے یعقوب کے ہمدردوں نے اسے سمجھایا کہ یہ شخص اپنے باپ اور دادا کی طرح خاموش نہیں بیٹھے گا بلکہ اس میں جہاں شاہی سطوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور جب اہل نجوم سے حالات دریافت کیے گئے تو انھوں نے سلطان قلی کا زائچہ کھینچ کر اس کی بادشاہی کی پیشین گوئی کی۔ اس سے امیر یعقوب بہت گھبرایا اور سلطان قلی کو مار ڈالنے کی کوشش کی۔ جب اویس قلی کو یہ خبر لگی تو اس نے اکابر ہمدان سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ ان لوگوں نے یہ رائے دی کہ امیر یعقوب پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے اس سے ہمیشہ جان و مال خطرے میں رہینگے، اور بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ سلطان قلی کو قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان بھیجا جائے چنانچہ اس رائے کے مطابق سلطان قلی کو قیمتی تحفے دیکر اس کے چچا اللہ قلی کے ساتھ جس کا نام بعض جگہ علی قلی بھی بتایا جاتا ہے ہندوستان بھیجا گیا۔[1]

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۲۵ و ۱۶۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۳۲۔ مدیقۃ العالم ص ۱۰۰۔

قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ سلطان قلی کے ہندوستان آنیکے یہی اسباب ہونے چاہئیں۔ گو ایک مورخ کا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کے ہندوستان آنیکا مقصد گھوڑوں کی تجارت تھا۔ یہ عراق کے گھوڑے لیکر ہندوستان آئے اور جب ہندوستان میں گھوڑوں کی قدر نہ ہوئی تو یہ بیدر آئے اور یہاں انھوں نے اپنے گھوڑے اچھے داموں فروخت کیے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس تجارت کے لیے وہ دو مرتبہ دکن آئے تھے[1]۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ سلطان قلی اور اس کا چچا ہمدان کے رئیس تھے تو ان کے متعلق گھوڑوں کی تجارت کا خیال کرنا کہاں تک قرین عقل ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ عراقی گھوڑے بھی تھے لیکن یہ کہنا کہ یہ گھوڑے تجارت کے لیے تھے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ گھوڑے تحفوں کے لیے آئے تھے۔ اُن کے ہندوستان آنیکا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے، اور وہ ان کے خاندان کا زوال ہے کیونکہ ہمدان کی دُنیا ان پر تنگ ہو رہی تھی، اور اس کی تمام تاریخوں سے تصدیق ہوتی ہے۔ سلطان قلی دو مرتبہ ہندوستان آیا تھا، اس سے پہلے وہ ایک مرتبہ اور اپنے چچا کے ساتھ آیا تھا، اور اپنے تحفوں کے ساتھ دربار دکن میں باریابی حاصل کی تھی، اور یہاں کے اوضاع و اطوار، اور طرز معاشرت سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اسی زمانے میں وہ دکن میں متوطن ہونا چاہتا تھا، مگر چچا کی وجہ سے مجبوراً اس کو عراق واپس ہونا پڑا[2]۔ گو یہ بتانا مشکل ہے کہ اس وقت پہلی مرتبہ دکن آنیکی وجہ کیا تھی۔ غالباً ہمدان کا سیاسی پیچ و تاب ان لوگوں کو مجبور کر رہا تھا کہ ہمدان سے باہر ایک دوسری دُنیا پیدا کریں۔ راستے میں یہ مسافر یزد پر سے گذر رہے تھے، یہاں ان کو یزد کے مشہور پیر طریقت حضرت شاہ نورالدین نعمت اللہ ثانی قدس سرہٗ سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ چونکہ حضرتؒ کی بیوی جہاں شاہ مقتول کی بیٹی تھیں اس لیے حضرتؒ کو سلطان قلی سے نزدیک کی قرابت ہوتی تھی۔ حضرتؒ نے اس سفر ہندوستان کے متعلق اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا، اور کہا کہ "ہم تم کو جنوب ہندوستان کے اقطاع عنایت کرتے ہیں"۔ اور

---

[1] تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۳۴۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص ۳۳ و ۳۴۔ حدیقۃ العالم ص ۱۱۔

جانماز کے نیچے سے چند اشرفیاں نکالکر اس کو دیں اور دعا دیکر رخصت کیا[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی نے شمالی ہند میں کہیں قیام نہیں کیا، بلکہ ترکستان سے کوچ کر کے سیدھا دکن آیا تھا۔[2] اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران و ترکستان میں لوگ بہمنی سلطنت سے ناواقف نہیں تھے اور جس زمانے میں سلطان قلی دکن آیا تھا، اس وقت محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا، جبکہ دکن میں باہر کے لوگ یعنی ترک اور ایرانی بہ کثرت تھے اور ان کی بہت آو بھگت ہوتی تھی۔ یوں تو فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت سے عجم کے علما دکن آنے لگے تھے، اور خود خواجہ حافظ شیرازیؒ کو بھی دعوت دی گئی تھی لیکن بہمنی سلطنت کے آخری دور میں تو بیدر تمام ممالک عجم کا بڑا زبردست مرجع بن گیا! اور ان لوگوں کی آمد و رفت سے دکن اور عجم کے ڈانڈے ملگئے تھے۔ ترکستان اور ایران کے اکثر اقطاع دربار دکن کی شان و شوکت اور اس کی علم نوازی سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں ان نو واردوں کے لیے کوئی کشش نہیں تھی، کیونکہ وہ ان دنوں طوائف الملوکی کا شکار بنا ہوا تھا۔ خاندان سادات و لودی کی کمزوری اور تیمور کے حملے سے دہلی کی پٹھان سلطنت کے تار و پود اس قدر بکھر گئے تھے کہ یہاں باہر کے نو واردوں کے لیے کچھ نہیں رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں سلطان قلی کی قسمت آزمائی لاحاصل تھی۔ گو بعض تاریخوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سلطان قلی پہلے شمالی ہندوستان میں ٹھیرا، اور جب اس کے ہمت شکن ماحول سے اس کے حوصلے پست ہو گئے تو پھر دکن آیا[3] اگر یہ صحیح سمجھا جائے تو سلطان قلی کا قیام شمالی ہند میں بہت مختصر ہوگا کیونکہ شمالی ہند کی کساد بازاری اس کو زیادہ دنوں تک نہیں ٹھیرا سکتی تھی! اس لیے ہر طرح سے اس کا بیدر آنا صحیح ہے۔ غالباً حکومت کو نو واردوں کی خبر ہو جاتی تھی، اور دربار میں ان کو بلایا جاتا تھا۔ کچھ اسی

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۲۲ و ۲۳۔ حدیقۃ العالم ص ۱۱۔

[2] تاریخ فرشتہ ص ۱۶۷۔

[3] تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۴۳۔ تاریخ قطب شاہی ص ۲۴۔

طریقے سے سلطان قلی اور اس کا چچا سلطان محمود شاہ بہمنی کے دربار میں جس کی اس زمانے میں شہرت تھی، باریاب ہو گئے۔[1]

---

[1] ۔فرشتہ وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ سلطان قلی، محمد شاہ ثانی کے عہد میں آیا تھا، چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ محمد شاہ لشکری کو ترک غلاموں کا بہت شوق تھا، اور اس نے بہت سے ترک غلام جمع کر رکھے تھے، اس لیے سلطان قلی بھی ترک غلاموں میں شریک ہو گیا" (تاریخ فرشتہ ص ۱۶۷)۔ اول تو دوسری تاریخوں سے، جیسے تاریخ قطب شاہی۔ تذکرۃ الملوک خافی۔ تاریخ قطبیہ اور تاریخ ظفرہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے عہد میں آیا تھا، بلکہ فرشتے کے علاوہ تمام تاریخیں بالاتفاق واضح کرتی ہیں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے انتقال کے بعد محمود شاہ بہمنی کے عہد میں آیا تھا چونکہ تاریخ قطب شاہی اور تاریخ قطبیہ، گولکنڈہ کے حالات میں فرشتے سے زیادہ مستند ہیں اس لیے محمود شاہ بہمنی کا عہد ہی قابل تسلیم ہوگا! اس کے علاوہ تذکرۃ الملوک میں سلطان قلی اور اس کے چچا کا دوسری مرتبہ آنا ۸۹۲ھ ہجری میں بتایا گیا ہے، جو صریحاً محمود شاہ کا عہد ہے۔ کیونکہ محمد شاہ لشکری کا انتقال ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء ہجری میں ہو گیا تھا (تذکرۃ الملوک خافی ص ۳۲۵)۔ مگر فرشتہ بھی اس کو تسلیم کرتا ہے کہ سلطان قلی کی تمامتر ترقی محمود شاہ کے عہد میں ہوئی ہے، اس لیے اگر ہم یہ تسلیم بھی کریں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے آخری عہد میں آیا تھا تو اس سے زیادہ حرج نہیں ہوتا، کیونکہ بالآخر سلطان قلی اپنی تمام سیاسی زندگی کے اعتبار سے محمود شاہ سے وابستہ ہے، لیکن فرشتے کے یہ الفاظ قابل غور ہیں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے ترک غلاموں میں شریک ہوا تھا۔ اول تو سلطان قلی کا ورود محمد شاہ کے عہد میں ثابت نہیں ہوتا، دوسرے سلطان قلی کا ترک غلاموں کی صف میں کھڑا ہونا خلاف قیاس اور خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ سلطان قلی ایران کے ایک بہت بڑے حکمران خاندان سے تھا جس کی فہرست میں قرا یوسف، سکندر ثانی اور جہاں شاہ جیسے جلیل القدر سلاطین پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں جبکہ سلطان قلی دکن آیا ہے، یہ خاندان قرا یوسفیہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ تاہم ان کی سیاسی عظمت ابھی باقی تھی۔ ہمدان ان کا لوہا مانتا تھا، ان کا مال و جایداد و اراضی ابھی باقی تھے چنانچہ جب سلطان محمود نے ان کو قیام دکن کے لیے مجبور کیا تو، اللہ قلی نے اپنے مال و جایداد کا عذر کر کے مجبوری ظاہر کی تھی۔ (تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۲۴) ان حالات میں

جب یہ دونوں مسافر بہمنی دربار میں وارد ہوئے تو محمود شاہ بہمنی نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں ہمدان کے شاہی خاندان سے ہیں تو ان کی بہت قدر و منزلت کیگئی۔ اللہ قلی بیگ نے تحفے پیش کیے جن کو بادشاہ نے منظور کیا۔ چند دنوں کے بعد ترکستان سے امیر یعقوب کے انتقال کی خبر آئی، اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لیے اچھا موقع تھا، اور اب یہ اپنی کوشش سے پھر اپنی عملداری قایم کرسکتے تھے۔ اس لیے اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی، مگر بادشاہ ان دونوں نوواردوں کی قابلیت اور وجاہت سے اس قدر متاثر تھا کہ ان کو جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اللہ قلی نے کہا کہ ترکستان میں ہمارے قبایل اور املاک ہیں، ہم ان کو نہیں چھوڑ سکتے، ہمارا وہاں جانا ضروری ہے۔ بادشاہ اللہ قلی بیگ کے اصرار سے مجبور ہوگیا، مگر یہ کہا کہ ... "اللہ قلی بیگ اگر تو میروی مختاری مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمید ہم"! اللہ قلی، بادشاہ کے ان الفاظ سے سہم کر رہ گیا۔ بھتیجے کی جدائی اس کے لیے حد درجہ دلخراش تھی۔ گھر واپس آکر سلطان قلی سے گفتگو کی سلطان قلی پہلے سے ترکستان سے بیزار تھا، اور آق قیونلو قبیلے کے تسلط سے اس کا دل ٹوٹا ہوا تھا، چنانچہ اپنے پہلے ورود ہی میں یہ دکن کے توطن کا خواہش مند ہوگیا تھا۔ اس دفعہ تو وہ کسی طرح واپس ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ بھتیجے کے اس رجحان کو دیکھکر اللہ قلی تنہا جانے پر مجبور ہوگیا۔ حالانکہ یہ جدائی

سلطان قلی کو ایک تُرک غلام سمجھنا خلاف واقعہ ہے۔ تمام قطب شاہی تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان قلی اور اس کا چچا قیمتی تحفوں کے ساتھ بہمنی دربار میں آئے تھے، اور اگر ان کی حیثیت شاہانہ نہیں تو غلامانہ بھی نہیں تھی۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھکر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی جب سلطان قلی اور اس کا چچا پہلی مرتبہ دکن آئے تھے تو ان کے لیئے تا قیام وظیفہ مقرر کیا گیا تھا جب یہ دوسری مرتبہ آئے تو ان کو مختلف عنایات سے سرفراز اور ان کو ٹھیرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا، اور اپنے پہلے ورود میں اسی نے دکن کے توطن کا ارادہ کرلیا تھا مگر چچا کی وجہ سے اس کو واپس ہونا پڑا۔

اس کے لیے بہت دردناک تھی جب دوسرے روز یہ لوگ محمود شاہ کے دربار میں داخل ہوئے تو بادشاہ نے پوچھا "اللہ قلی بیگ حکایت دیروزہ چوں شد و بچہ قرار یافت"؟ اللہ قلی نے اس کا جواب دیا۔

"امر از بادشاہِ دیں پناہ است ع ہر چہ شاہ اشارت کند سعادت ماست"

اس طرح اللہ قلی کو تحفے دیکر رخصت کر دیا گیا[1] اور سلطان قلی ہمیشہ کے لیے دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش ہوا، اور اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا، اور سلطان قلی سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ رہنا، اور عراق کا کبھی خیال نہیں کرنا سلطان قلی کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی جس کی وجہ سے اس نے دربار دکن میں بہت جلد رسوخ حاصل کر لیا[2] اگر فرشتے کا بیان صحیح سمجھا جائے تو، سلطان قلی کی ترقی اس کی علمی اور سپاہیانہ قابلیت کی بدولت ہوئی۔ اسی مؤرخ کے بیان کے مطابق سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا، اور بہت خوش خط لکھتا تھا اسی قابلیت کی وجہ سے بادشاہ نے اس کو

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۱۳۔

[2] تاریخ قطب شاہی میں سلطان قلی کی ترقی کا پہلا زینہ ایک شکار کا واقعہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا بیان ہے کہ ایک روز بادشاہ شکار کے لیے گیا۔ اور شکار کی کوشش کی۔ بادشاہ کے تمام درباریوں نے متعدد شکار کیے، لیکن بادشاہ کو کوئی شکار پسند نہیں آیا۔ اتفاق سے سلطان قلی کا شکار بہت اچھا ثابت ہوا، اور بادشاہ کے بہت پسند آیا اس سے خوش ہو کر بادشاہ نے سلطان قلی کو ایک سو پچاس عربی اور ترکی گھوڑے مع ساز و سامان عطا کیے اور خلعت عنایت کی اور اس کے اخراجات کے لیے کرنگل اور اس کے مضافات دیے گئے "اور خواص خان" خطاب سرفراز ہوا (تاریخ قطب شاہی ص ۷ ، ۳) لیکن یہ چیز غور طلب ہے کہ شکار کے ایک معمولی اور اتفاقی واقعہ کی بناء پر بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ اس کو غیر معمولی عنایات سے سرفراز کیا، بلکہ قیاس کہتا ہے کہ اس کی ترقی کے کچھ اور ہی اسباب ہونے چاہئیں۔

محلات شاہی کا محاسب بنایا۔ اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس خدمت کو سلطان قلی نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ شاہی حرم اس کے کام سے بہت خوش تھیں اور اس کی تعریف کرتی تھیں۔ اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اس اثنا میں تلنگانے سے یہ شکایت وصول ہوئی کہ وہاں بعض پرگنات میں چور اور ڈاکو لوٹ مار کر رہے ہیں اور رعایا ادائی مالگزاری میں کوتاہی کر رہی ہے، اگر ان کی خاطر خواہ سرکوبی نہ ہوئی تو ان پرگنوں کی مالگزاری وصول نہ ہوگی۔ بادشاہ نے ان پرگنوں کے لیے دو تین ہزار سوار بھیجنے کی کوشش کی جب سلطان قلی کو یہ قصہ معلوم ہوا تو اس نے بعض اہل حرم سے بادشاہ کے پاس اپنے متعلق سفارش کروائی اور یہ درخواست کی کہ اگر یہ خدمت میرے سپرد کیجاتی ہے تو میں بغیر فوج کے یہ خدمت انجام دیتا ہوں چنانچہ بادشاہ نے یہ درخواست منظور کی اور سلطان قلی اپنے چند متعلقین کو ساتھ لیکر تلنگانے کے پُر آشوب پرگنوں میں پہنچا، اور اکثر زمینداروں کو اپنے ساتھ ہموار کر کے ان پرگنوں کو اور ان کے ساتھ ان اقطاع کو جو اکثر اُمراسے متعلق تھے، پُر امن بنا دیے چوروں اور ڈاکوؤں کی خاطر خواہ سرکوبی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغی زمیندار ادائی مالگزاری کے لیے مجبور ہو گئے، اور یہ درحقیقت سلطان قلی کی بڑی قابلیت تھی کہ اس نے محض اپنے زور بازو سے یہ خدمت انجام دی۔ ایک اجنبی کے لیے جو تلنگانے سے قطعاً ناواقف ہو، زمینداروں کو اپنی سیاسی قابلیت سے ہموار کرنا، اور ان کی مدد سے وہاں اپنی جگہ پیدا کرنا بہت مشکل ہے، اور بہت بڑی قابلیت کی دلیل ہے۔ یہ اس کی آیندہ بادشاہی کا نشان تھا[1]۔ سلطان قلی کی ترقی کا بہلا زینہ شکار نہیں، بلکہ اس کی علمی، فوجی اور سیاسی قابلیت تھی، چنانچہ فرشتے کے قول کے مطابق اس واقعہ سے اس کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں طرح کی قابلیت موجود تھی، اس لیے فرامین میں اس کو "صاحب السیف والقلم" کہا جاتا تھا۔

---

[1] فرشتہ اس واقعہ کو محمد شاہی عہد کی طرف منسوب کرتا ہے، لیکن اگر سنہ کی تحقیق کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق محمود شاہ کے عہد سے ہے، کیونکہ سلطان قلی محمد شاہ کے انتقال کے تقریباً چار سال بعد آیا ہے۔

دوسرا باب

سلطنت کا آغاز

۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء کے غیر معمولی واقعے سے جبکہ اہل بیدر نے طبقے واری رقابت میں محمود شاہ بہمنی کو قتل کرنا چاہا تھا سلطان قلی کی عظمت دو بالا کر دی! اہل بیدر نے قلعے پر اچانک دھاوا بول دیا اور قلعے کے چاروں طرف کے راستے بند کر دیے تاکہ باہر سے کوئی مدد نہ آسکے! اگر اس وقت ترک و ایرانی مدد نہ کرتے تو بادشاہ کا خاتمہ ہو جاتا قلعے کے اندر حسن علی سبزواری اور سید مرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس سلحدار جوانوں کے موجود تھا، باہر سے امداد آنے تک اس نے حملہ آوروں کو روکے رکھا، اور بادشاہ کی جان بچائی! اس سچی وفا شعاری سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو قطب الملکؒ کا خطاب عطا کیا! اس کے تین سال بعد یعنی ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء میں مغربی ساحل پر ایک اور بغاوت کھڑی ہو گئی جو سلطان قلی کے لیے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی اس کی بدولت وہ تمام تلنگانے کے ممالک کا صوبے دار بن گیا، مغربی ساحل، جس میں گوا وغیرہ شامل تھے، بہادر گیلانی نامی ایک بہمنی امیر کے زیر اقتدار تھا۔ اس سیاسی انتشار کے زمانے میں یہ بھی اور اُمرائے بہمنی کی طرح سرکش ہو گیا! اس کی سرکشی سے نہ صرف بہمنی سلطنت کو شکایت پیدا ہوئی، بلکہ گجرات کی سلطنت کو بھی ایک ٹھیس لگ گئی کیونکہ اسی سنہ میں اس نے بنادر گجرات کی متعدد کشتیوں کو جو تجارتی مال سے پُر تھیں، لوٹ لیا تھا سلطان محمود والی گجرات نے محمود بہمنی کے دربار میں سفیر بھیجے اور شکایت کی تاکہ اس نقصان کی تلافی ہو۔ دکن کی حکومت یوں بھی اس کا تدارک ضروری سمجھتی تھی، گجرات کی شکایت سے بہادر کی سرکوبی اور بھی ضروری ہو گئی چنانچہ محمود بہمنی نے بذات خود بہادر گیلانی کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ قاسم برید

لہ تاریخ فرشتہ ص ۲۶۶ تاریخ قطب شاہی ص ۳۷ - ۳۹۔



سلطان قلی قطب شاہ

اس کے ساتھ شریک تھا یوسف عادل خاں۔ ملک احمد بحری۔ فتح اللہ عماد الملک وغیرہ نے مقدور بھر فوجوں سے بادشاہ کی مدد کی۔ بہمنی افواج قلعہ جام کھنڈی پہنچیں جو بہادر کے زیر تصرف تھا۔ قطب الملک دکنی کو جو تلنگانے کا گورنر تھا اس قلعے کی تسخیر کے لیے مقرر کیا گیا لیکن یہ بہت جلد دشمن کے حملے کا شکار ہو گیا۔ قلعے پر سے جب گیلانیوں کے حملے شروع ہوئے تو یہ ان کی زد میں آگیا، اور مر گیا! اس کے انتقال کے بعد سلطان قلی کو جس کا خطاب صرف خواص خاں تھا قطب الملک کا خطاب دیکر اس کی جگہ متعین کیا گیا۔ اور یہ ایسا مبارک خطاب تھا جو دو سو سال تک سلطان قلی اور اس کے جانشینوں کا خاندانی لقب ہو گیا، اسی خطاب کی بدولت بعد کو یہ قطب شاہ ہو گئے۔ قلعہ جام کھنڈی کی تسخیر کے بعد منگلیر اور مرچ پر قبضہ کیا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے پیشقدمی کی گئی اور کلہر پر تسلط کیا گیا۔ قلعہ پنالہ میں بہت سی بہمنی فوجیں کام آئیں۔ اس کی تسخیر میں خواجہ جہاں فخر الملک کے ساتھ سلطان قلی قطب الملک بھی تھا! اس قلعے میں بہادر گیلانی کو زبردست شکست ہوئی، چونکہ خواجہ جہاں اور قطب الملک نے اس میں خاطر خواہ حصہ لیا تھا، اس لیے ان کو خطابات دیے گئے اور خوشنودی کا اظہار کیا گیا۔ خواجہ جہاں کے نام کے ساتھ "مخدوم" کا لفظ اضافہ کیا گیا، اور جب بادشاہ اس مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو محمود شاہ گجراتی کو تحفے وغیرہ بھیجے اور چونکہ قطب الملک دکنی کے انتقال کی وجہ سے تلنگانے کی صوبہ داری خالی ہو گئی تھی اس لیے قطب الملک سلطان قلی کو ان خدمات کے صلے میں تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا، اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈے اور ورنگل کا اضافہ کیا گیا۔[1]

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی میں قلعہ مرچ کی تسخیر بھی سلطان قلی کی طرف منسوب کی گئی ہے چنانچہ اس تاریخ کا بیان ہے کہ اس قلعے پر ایک مرہٹہ سردار پوٹہ نائک مسلط تھا۔ سلطان قلی نے اس کا دو بدو مقابلہ کر کے اس کو زیر کیا۔ بادشاہ نے اس کارگزاری پر اظہار مسرت کر کے قلعے کا تمام مال غنیمت سلطان قلی کو عنایت کر دیا۔ یہ تمام فوجی کارگزاری سلطان کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی اور وہ تمام ممالک تلنگ کا صوبہ دار بنگیا (تاریخ قطب شاہی)۔ تاریخ قطب شاہی کے خلاف فرشتے کا خیال یہ ہے کہ سلطان قلی کو اسی موقع پر قطب الملک کا خطاب عطا ہوا تھا (تاریخ فرشتہ ص ۱۷۲)۔

سلطان قلی کی ترقی کا پہلا زینہ خواہ کچھ ہی ہو اس کی متعاقب ترقیوں کا ذمہ دار دکن کا سیاسی انتشار تھا جس سے فایدہ اٹھا کر یہ اور اس کے معاصر اُمرا، اور سپہ سالار خود مختار سلطنتیں قایم کر رہے تھے۔ انھی حالات میں سلطان قلی نے بھی ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قایم کرلی۔ سلطان محمود بہمنی کا عہد حکومت ایک سیاسی انتشار کا زمانہ تھا جو بہمنی سلطنت کے زوال کا باعث ہوا محمود شاہ بہمنی کے باپ محمد شاہ لشکری کے عہد سے بیدر میں غیر ملکیوں کا تانتا بندھ گیا تھا جن میں تُرک، مغل و ایرانی شامل تھے۔ یوں تو تمام سلاطین بہمنی علم و فن کے بڑے قدر دان تھے اور جو علما باہر سے آتے تھے ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کے عہد سے حالت دوسری ہوگئی تھی۔ علما کے علاوہ سیاسی لوگ بھی باہر سے آنے لگے اور ان کو مختلف خدمات اور اعزازات دیے جانے تھے۔ فرشتہ کے قول کے مطابق محمد شاہ کو تُرک غلاموں کا بہت شوق تھا، اور اس کے شوق کی وجہ سے تُرک و مغل کثیر تعداد میں مُلک میں بھرنے لگے۔ خلف حسن بصری، محمود گاواں، حسن علی سبزواری تو نمایاں شخصیتیں تھیں لیکن ان کے علاوہ بے شمار تُرک و ایرانی بیدر میں جمع ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مُلک کی تمام سیاست ان کے ہاتھ آ گئی، اور یہ لوگ اپنے اثر سے کام لیکر فوجی اور غیر فوجی خدمات اپنے ہاتھ میں رکھتے اور اپنے متعلقین کو دیا کرتے تھے، اور ان کے مقابلے میں دکن کے حقیقی فرزند جن کے آبا و اجداد سلطنت دکن کے معمار تھے، بے دست و پا ہو گئے تھے۔ دربار میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی محمود شاہ کے عہد میں دربار کا رنگ ایسا بدل گیا کہ اس میں صرف اجنبیوں کا جمگھٹا ہوتا تھا، اور اس کے برخلاف اہلِ مُلک کی کوئی رسائی نہ تھی یہ کشمکش اور خانہ جنگی کا سامان تھا۔ اہلِ مُلک جن کے ساتھ حبشی بھی شامل تھے اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے سرپٹ میدان میں آ گئے اور کشمکش کا بازار گرم ہو گیا یہ کشمکش محمد شاہ کے عہد سے یا زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو علاء الدین ثانی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی۔ خلف حسن بصری اور محمود گاواں اسی فرقہ وارانہ رقابت کے شکار ہوئے اور محمود شاہ کے عہد میں جب اس رقابت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اہلِ مُلک نے ۸۹۶ھ ۱۴۹۰ع ہجری میں خود بادشاہ کا خاتمہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ قلعے کے تمام رکھوالوں کو اپنے ساتھ ہموار کر کے قلعے پر دھاوا بول دیا، اور حالات اس قدر نازک تھے کہ بادشاہ کی جان کے لالے پڑ گئے۔ صرف تُرک اور ایرانیوں کی مدد سے فساد فرو ہوا، اور جب بادشاہ کی

جان بچ گئی تو اس نے اہل ملک کو سخت سزا دی مغلوں اور ترکوں کو حکم دیا کہ دکھنیوں اور حبشیوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کو قتل کریں اور ان کا مال لوٹ لیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو تین روز تک شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا چند بزرگوں کی شفاعت سے ان کو معاف کیا گیا۔

اس واقعہ سے حکومت کو سبق لینا چاہیے تھا۔ ترک و ایرانی بادشاہ کی ضرور مدد کرتے تھے لیکن وہ ملک کے حقیقی ہمدرد نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے سلطنت کو خیرباد کہدیا، اس طریقے سے سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا کیونکہ اول تو دکنی اور حبشی اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ ان میں ابھرنے کی سکت نہ تھی۔ دوسرے انھوں نے اپنی بے قدری و کس مپرسی سے مایوس ہو کر سلطنت کی مدد چھوڑ دی محمود شاہ نے باہر والوں پر بھروسہ کیا، اور ان لوگوں نے اس کو مجبور کر کے جگہ جگہ اپنی خود مختار سلطنتیں قایم کر لیں۔ فرشتے کے الفاظ میں قاسم برید نے محمود شاہ کو اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ اس کو بغیر اجازت پانی بھی میسر نہیں آتا تھا چنانچہ مرکزی حکومت پر قاسم برید کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا، امیر برید قابض ہو گیا اور شاہی خاندان کو ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیا۔ سلطنت کے ارد گرد بیرونی صوبوں پر دوسرے امرا، اور صوبہ دار قابض ہو گئے اور اس طریقے سے دسویں صدی ہجری کے اوائل، یا پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہمنی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ بیجاپور۔ احمد نگر اور برار کے ساتھ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بھی قایم ہو گئی۔

سلطنت گولکنڈے کی تاسیس بھی اسی سیاسی انتشار میں ہوئی تھی جو ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اگرچہ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں بہمنیوں کی مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہو گئی کہ اس کے تمام صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے لیکن نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہی سلطنت کا سیاسی شیرازہ بکھرنے لگا تھا چنانچہ ۸۹۵ھ ۱۴۸۹ء میں احمد نگر۔ بیجاپور اور برار کے بانیوں نے بالاتفاق سلطان محمود کا نام خطبے سے خارج کر کے اپنے نام داخل کر دیے اور پانچ نوبت بجوائے، اور یہ خود مختاری کا اعلان تھا[1]۔ اسی طرح سلطان قلی قطب کو بھی تلنگانے میں جہاں وہ

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۳۶۷ سکّے اور خطبے کے ساتھ پانچ نوبت بجوانا شاہی خود مختاری کا اعلان سمجھا جاتا تھا بہمنی سلطنت کے زمانے میں شاہی محلات میں

صوبہ دار تھا، اپنی خود مختار سلطنت قایم کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ احمد نگر، بیجاپور، اور برار کے شمالی صوبوں کے مقابلے میں تلنگانے کا جنوب مشرقی صوبہ اپنے قدرتی اور جغرافی خصوصیات کی بنا پر ایک جُداگانہ سلطنت بننے کے قابل تھا۔ اور یہ علاقہ مرکزی حکومت سے اس قدر دُور تھا کہ کسی گرفت میں نہیں آسکتا تھا لیکن سلطان قلی نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح ان حالات سے فایدہ نہیں اُٹھایا۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطان قلی کی خود مختاری بہت بعد کو عمل میں آئی اول تو یہ کہ جس زمانے میں احمد نظام شاہ اور یوسف عادل شاہ نے خود مختاری کا اعلان کیا تھا، سلطان قلی تلنگانے کا صوبہ دار ہی نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ بہادر گیلانی کے خاتمے کے بعد سنہ ۹۰۱ھ/۱۴۹۶ء میں ممالک تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا تھا اس وقت اس کی خود مختاری ناممکنات سے تھی۔ لیکن صوبہ دار ہونے کے بعد بھی اس نے فوراً اعلان خود مختاری نہیں کیا۔ تلنگانے میں اس کے صوبہ دار ہونے کے بعد اس نے کافی طاقت فراہم کر لی تھی گولکنڈے میں آنے کے بعد اس نے بیجانگر سے مقابلہ کر کے اپنے ہاتھ پیر خاطر خواہ مضبوط کر لیے تھے لیکن اس کے باوجود سلطان قلی کا جذبۂ وفاداری اور حق پرستی اس کو اعلان خود مختاری کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ حالانکہ مرکزی حکومت اس قدر کمزور تھی کہ اس کو کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا۔ شمال کے تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے، اور سلطان قلی کو اس سے خاطر خواہ ترغیب ہوتی تھی، نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شمال کے سلاطین احمد نگر و بیجاپور نے اس کو خود مختاری کے لیے بہت ابھارا لیکن سلطان قلی اپنے جذبۂ وفاداری سے مجبور تھا اس کی وفاداری اس واقعہ سے زیادہ واضح ہوتی ہے کہ جب سلطان محمود بہمنی نے والیِ بیجاپور، یوسف عادل خاں پر حملہ کر دیا تو سلطان قلی بادشاہ کے مطالبے پر فوراً چلا آیا، اور بادشاہ کی مدد کی[1] حالانکہ اس حملے کا سبب یہ تھا کہ یوسف نے بیجاپور میں شیعہ مذہب کی ترویج کی تھی اور بادشاہ اس کی ترویج کو دکن کی پُرانی روایت کے منافی سمجھتے تھے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ سلطان قلی خود شیعہ مذہب کا پیرو تھا، اور مذہباً اس کو

دن میں پانچ دفعہ نوبت بجتی تھی، اور یہ شاہی امتیاز تھا۔

[1] ـ تاریخ فرشتہ ص ۲ ـ ۳۔

بادشاہ کی مدد نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن اس نے وفاداری، ورزض شناسی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور اس کے علاوہ جب سلطان محمود پر بریدیوں کی خود غرضی کی وجہ سے اس قدر عرصۂ روزگار تنگ ہوگیا کہ اس کی روزمرہ ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں تو سلطان قلی اس کو خفیہ طور پر گولکنڈہ سے پانچ ہزار ہون بھیجا کرتا تھا اور جب تک سلطان محمود زندہ رہا ہے، غالباً یہ ہون ہر مہینے برابر بھیجے گئے[1]۔ بات یہ ہے کہ فرشتہ سلطان قلی کی عملی خود مختاری سے یہ نتیجہ نکالتا ہے۔ جب سے وہ تلنگانے کا صوبہ دار مقرر کیا گیا وہ یہاں بلا شرکت غیرے حکومت کرتا تھا۔ سلطان قلی کی عملی خود مختاری میں تو کوئی شبہ نہیں، کیونکہ نویں صدی کے اواخر میں بہمنی سلطنت اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ اس کے صوبہ دار اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے لیکن اس کی وفاداری کے اور واقعات کے ساتھ جو خود فرشتہ بیان کرتا ہے خود مختاری کا اعلان ایک بے جوڑ سی بات ہوگی۔ اگر اس کا اعلان خود مختاری صحیح بھی ہے تو اس کے ہمعصر سلاطین بیجاپور اور احمد نگر کے مقابلے میں بہت دیر میں یعنی تقریباً بیس بائیس سال کے بعد ہوا ہے، اور یہ خود اس کی وفاشعاری ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لیکن گولکنڈے کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی نے اعلان خود مختاری اپنے مربی سلطان محمود بہمنی کی زندگی میں نہیں، بلکہ اس کے انتقال کے بعد کیا تھا۔ تاریخ قطب شاہی کا مولف سلطان محمود بہمنی کا انتقال ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء ہجری میں بتاتا ہے[2]۔ اگر یہ سنہ صحیح ہے تو فرشتے کے بیان کے مطابق سلطان قلی کا اعلان خود مختاری سلطان محمود کے انتقال کے چھ سال بعد یعنی ۹۱۸ھ ہجری میں ہوا ہوگا۔ لیکن تاریخ قطبیہ میں سلطان محمود کا سنہ انتقال ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء ہے جو عام طور پر مشہور ہے۔ اور تاریخ قطبیہ کے مطابق یہی سنہ سلطان قلی کے اعلان خود مختاری کا سمجھنا چاہیے[3]۔

---

[1] ۔ تاریخ فرشتہ ص ۳۰۲۔ فرشتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان قلی نے ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں خطبے سے سلطان محمود کا نام خارج کر کے اپنا نام داخل کر دیا۔ اور قطب شاہ کا لقب اختیار کر کے پانچ نوبت بجوائے۔ لیکن گولکنڈہ کی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

[2] ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۵۔ [3] ۔ تاریخ قطبیہ ص ۲۱۔

چونکہ تاریخ قطبیہ، تاریخ قطب شاہی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، اس لیے سنہ کے بارے میں اس کا اختلاف کرنا واقعات ثابت کرنے کے لیے زیادہ مستند ہے۔ تذکرۃ الملوک خافی نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ دوسرے اُمرائے دکن خود مختار ہو گئے تھے لیکن سلطان قلی اپنی وفاداری پر قایم رہا[1]۔ اس کے علاوہ سلطان قلی نے اپنے مفوضہ پرگنات پر جو اس کی صوبہ داری میں دیے گئے تھے قناعت کی، اور شاہی علاقوں پر کبھی دست درازی نہیں کی۔ حالانکہ دوسرے سلاطین دکن نے کئی شاہی علاقے ہضم کر لیے تھے اور خود سلطان قلی کو ترغیب دی تھی کہ قریب تر علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی مملکت کی توسیع کرے، اور اس معاملے میں مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن سلطان قلی اس حرکت کو سخت بے وفائی خیال کرتا تھا کہ اگر مملکت کی توسیع مقصود ہے تو یہ کام غیر مقبوضہ علاقوں میں، جو ابھی تک سلطنت بہمنی کے تسلط میں نہیں آئے ہیں، ہونا چاہیے۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے تاریخ مرغوب القلوب سے خود سلطان قلی کے الفاظ نقل کیے ہیں جن سے اس کی وفاداری ثابت ہوتی ہے:—

"من خود اندیشہ می کردم کہ مملکت سلطان را بے رضائے او قابض و متصرف گشتن
نہایت نمک حرامی است عافیت رائے صواب نمائے مابرآں قرار یافت کہ ایں ولایت کہ
تو داری سرحد مملکت تلنگانہ و ولایت کفار است بہمیں پرگنات کہ سلطان بہ رضا و رغبت
بہ تو دادہ قانع شوی و شروع در تسخیر ولایت کفار نمائی کہ اگر بادشاہ حقیقی جل وجلالہٗ
خواستہ باشد کہ ترا مملکت و سلطنت دہد در غزا و جہاد کفار ان مظفر و منصور خواہد ساخت
بنابریں اصلاح چوں اُمرائے دیگر عمل در مملکت موروثی سلطان نکردم و شروع در جہاد
کفار نمودہ بہ تسخیر ممالک آنہا پرداختم"[2]

نیز مسجد صفا کا کتبہ سلطان قلی کی وفاشعاری کو پوری طور سے ثابت کرتا ہے۔ یہ مسجد ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء میں یعنی جس سال محمود شاہ کا

---

[1] تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۳۷۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۲۷۔

انتقال ہوا تھا، تعمیر ہوئی تھی۔ غالباً یہ گولکنڈے کی پہلی مسجد ہے۔ اس کے کتبے میں سلطان قلی نے اپنے نام کی جگہ سلطان محمود کا نام درج کیا تھا چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"بناء ہذالمسجد الجامع فی زمان السلطان الاعظم المتوکل علی اللہ البہمنی ابی الغازی محمود شاہ ابن محمد البہمنی۔"

اگرچہ ۹۰۱ھ ۱۴۹۵ء سے جبکہ سلطان قلی تلنگانے کا صوبہ دار بنایا گیا تھا اس نے تلنگانے میں سکونت اختیار کرلی تھی لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا اس نے اوائل ہی سے گولکنڈے کو اپنا مستقر قرار دیا تھا۔ قطب شاہی تاریخوں سے مترشح ہوتا ہے کہ صوبہ داری کے زمانے میں گولکنڈہ اس کا مستقر نہیں تھا، بلکہ اس کی قیام گاہ گولکنڈہ سے فاصلے پر کسی اور جگہ تھی جس کا تعین کرنا بہت مشکل ہے لیکن جہاں تک گولکنڈے کا تعلق ہے وہ اس وقت پائے تخت قرار دیا گیا ہے جبکہ سلطان قلی نے خود مختاری کا اعلان کیا تھا کیونکہ تمام مورخ بالاتفاق واضح کرتے ہیں کہ سلطان قلی نے قلعے اور شہر کی تعمیر سے فارغ ہوکر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا اور ظاہر ہے کہ اعلان خود مختاری ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء میں ہوا ہے۔ تاریخ قطبیہ میں اس کی صراحت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قلعے اور شہر کی تعمیر اس وقت ہوئی ہے جبکہ وہ تلنگانے کی بعض فتوحات سے فارغ ہوچکا تھا اور اس کی فتوحات کے چرچے سنکر بے شمار لوگ اس کے اردگرد جمع ہوگئے، اور ان کی سکونت کے لیے ایک شہر کی ضرورت داعی ہوئی۔ قلعے اور شہر کی تعمیر کا اصلی محرک وجیانگر کی ہمسایہ سلطنت کے حملوں کا ڈر تھا اور ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے وجیانگر پر آسانی سے حملے ہوسکیں اور جب فوجیں جنوب سے واپس آئیں تو اُن کو قریب ہی قیام و آرام کا موقعہ مل سکے۔ اس لیے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ گو یہ تلنگانے کا مرکز نقل نہیں ہے، لیکن جغرافی اعتبار سے یہ ایسا موقعہ تھا کہ اس کے ذریعے سے ایک طرف بریدی اور عادل شاہی مغربی طاقتوں کا مقابلہ ہوسکتا تھا، اور دوسری طرف جنوبی سلطنت وجیانگر کی روک تھام ممکن تھی۔ گولکنڈے اور اس کے قلعے کا وجود پہلے سے پایا جاتا ہے، اس کو قدیم زمانے میں مانگل[1] کہتے تھے، ممکن ہے کہ یہ قدیم سلطنت چالوکیہ کا ایک صوبہ رہا ہو۔

[1] گولکنڈہ کے ایک کتبے میں جو نواب نیکنام خاں کی قبر پر نصب کیا گیا ہے اس مقام کو "منگلوارم" لکھا گیا ہے۔

جب سلطنت چالوکیہ کا خاتمہ ہوگیا، اور اس کی جگہ دکن میں منتشر راجدھانیاں قایم ہوئیں تو گولکنڈہ یا مانگل میں بھی ایک راجدھانی قایم ہوگئی تھی۔ چنانچہ تمام تاریخوں میں یہاں کے ایک راجہ کا نام دیورائے بتایا جاتا ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ گولکنڈہ سلطنت ورنگل کا مشرقی صوبہ ہوگا، اور دیورائے اصل میں ورنگل کا راجہ ہے جس کے بزرگوں نے گولکنڈے کا قلعہ بنایا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی دیواریں مٹی کی تھیں۔ بہمنی سلطنت کی توسیع کے ساتھ جب ورنگل تک قبضہ ہوگیا تو گولکنڈہ اس سلطنت میں ضم ہوگیا۔ محمد شاہ اول بہمنی کے عہد میں (۷۶۰ھ / ۱۳۵۸ء تا ۷۷۶ھ / ۱۳۷۵ء) ورنگل کے راجہ نے گولکنڈے کا قلعہ بہمنی سلطنت کے سپرد کردیا۔ اس زمانے سے یہ سلطنت بہمنی کا بہت اہم قلعہ سمجھا جاتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس قلعے کے ذریعے سے تمام مشرقی حدود کی حفاظت اور مشرق میں فوجی نقل و حرکت ہوتی تھی۔ جس وقت سلطان محمود بہمنی نے سلطان قلی قطب کو تلنگانے کا صوبہ دار بنایا تو اس صوبہ داری کے ساتھ گولکنڈہ اس کی جاگیر میں دیا گیا تھا۔ جس سال سلطان محمود بہمنی کا انتقال ہوا اسی ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء میں سلطان قلی قطب نے گولکنڈے کو "محمد نگر" سے موسوم کر کے اپنا پایۂ تخت قرار دیا، اور اس کو آباد و مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ گولکنڈے کی پہاڑی پر قلعے کا ضروری استحکام پہلے سے موجود تھا اور پچھلے راجگان اس کو قلعے کے طور پر استعمال کرتے تھے، مگر سلطان قلی قطب نے اس کو اپنے اغراض و مقاصد کے مطابق کافی مضبوط کرلیا، اور قلعے سے باہر ایک مستحکم فصیل بنا کر شہر گولکنڈے کی بنا ڈالی۔ اگر قلعے کی بنیاد قطب شاہی نہیں ہے تو شہر کا قطب شاہی ہونا یقینی ہے جو اس کے آثار قدیمہ سے ظاہر ہے۔ فصیل کے اندر ضروری عمارتیں بنائی گئیں، کچھ محل تعمیر ہوئے اور ایک جامع مسجد بنائی گئی جو اپنے حمام اور دیگر ضروریات سے مزین تھی۔ مسافروں کے لیے مسافر خانوں کا انتظام تھا۔ ان تعمیرات سے شہر کی رونق اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہاں باہر سے ہزاروں آدمی آکر بسنے لگے۔ چنانچہ قطب شاہی تاریخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "چند روز میں یہ شہر رشک ہر دیار و غیرت افزائے سایۂ بلاد و امصار ہوگیا[1]۔"

فتوحات تلنگانے کا بہمنی صوبہ جو سلطان قلی کے تفویض کیا گیا تھا وہ اپنے طول و عرض میں بہت مختصر تھا۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۵۵۔ تاریخ قطبیہ ص ۲۱۔

مغرب میں اس کے حدود گولکنڈہ کے قرب وجوار سے شروع ہوتے تھے اور مشرق میں یہ ورنگل سے آگے نہیں تھے کیونکہ ورنگل سے آگے مشرق میں جو اقطاع قطب شاہی سلطنت میں شامل ہوئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جو خود سلطان قلی قطب شاہ نے فتح کیے تھے۔ فی نفسہٖ تلنگانہ جس کا قدیم نام "آندھرا" ہے جنوبی ہند کا ایک وسیع خطہ ہے جو اپنے طول و عرض، جغرافی خصوصیات اور قدیم تاریخ کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا اصلی پھیلاؤ شمال سے جنوب کی طرف ساحل کارومنڈل کے برابر چلا گیا ہے۔ اس کے شمال میں چاندا، اور اوڑیسہ کا وہ حصہ شامل ہے جو ضلع سکاکول سے ملحق ہے۔ مغرب میں محمد آباد (بیدر) اور جنوب میں کرناٹک واقع ہیں۔ جس وقت سلطان قلی اس تلنگانے کا صوبہ دار ہوا ہے اس کے تمام مشرقی اقطاع ورنگل سے مچھلی پٹم تک ہندو راجگان کے زیر تصرف تھے اور جنوبی حصہ تمام تر وجیانگر کے زیر نگیں تھا لیکن اقتضائے حال اس ملک کی ترقی کا خواہاں تھا، اور ضرورت اس بات کی تھی کہ یہاں مغرب سے مشرق تک منتشر راجدھانیوں کو توڑ کر ایک مجموعی حکومت قایم کی جائے۔ اس کے علاوہ گولکنڈے کی روز افزوں سلطنت جس کی رہنمائی اب سلطان قلی قطب شاہ کے ہاتھ میں آگئی تھی اپنی محدود چاردیواری میں بند نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ اس کو اپنے قدرتی حدود تک پہنچنا ضروری تھا نیز سلطان قلی قطب شاہ ہندوستان کا بڑا سیاسی مدبر تھا۔ صوبہ داری کے دوران میں (تقریباً ۲۴ کا زمانہ ہے) اس نے تسخیر ملک کی بہت زیادہ کوشش نہیں کی بلکہ صرف مفوضہ علاقوں کا خوش اسلوبی سے انتظام کیا، اور اپنے صوبے میں امن قایم رکھا اس زمانے میں غالباً بیجانگر کے مقابلے اور دربار بیدر کی سیاسی الجھنیں اس کو روکتی تھیں صوبہ داری کے زمانے میں اس کو سلطان بہمنی کی تائید میں یوسف عادل خاں پر حملہ کرنا پڑا، اور دستور دینار کی سرکوبی کے لیے بادشاہ کا ساتھ دیا[1]۔ ممکن ہے کہ یہ اسباب اس کو مشرق میں پیشقدمی کرنے سے روکتے ہوں لیکن ۹۲۴ھ (۱۵۱۸ء) ہجری میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد جب وہ خود مختار ہوگیا تو اس نے قلعۂ گولکنڈہ کی تعمیر کر کے اس کو مستحکم کر لیا۔ اور جب اس طرح اس کے

۱۔ دستور دینار حبشی گلبرگہ کا گورنر تھا محمود شاہ کے عہد میں اس نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔

کل وئیرز ے مضبوط ہوگئے تو مشرقی تلنگانہ کے مختلف قلعوں پر دار کرنے شروع کر دیے۔ جن قلعوں پر اس نے حملے کیے تھے ان میں سب سے پہلے راج کونڈ کا نام آتا ہے، اس کے محاصرے میں سلطان قلی کے اکثر سیاسی عہدہ دار کام آئے، لیکن بالآخر یہ مسخر ہوگیا، اور یہاں کا والی وینکٹی نائک گرفتار ہوگیا، اور اس کے بعد دیورکونڈے کے مضبوط قلعے کی تسخیر ہوگئی، لیکن اس تسخیر سے وجیانگر کی بلائے بے درماں سر پر آگئی۔ کشن رائے نے جو وجیانگر کا راجہ تھا سلطان قلی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے تلنگانے کے جنوب مشرقی حدود پر حملہ کر دیا، سلطان قلی کے لیے اس کی مزاحمت آسان نہ تھی لیکن سلطان قلی کی پختہ کاری سے قطب شاہی فوج کامیاب ہوگئی اور وجیانگر کی فوج بھاگ گئی۔ اس سے فارغ ہوکر جنوبی قلعے پانگل پر حملہ کیا گیا جو دریائے کرشنا کے قریب واقع ہے۔ وجیانگر کی پیشقدمی کو روکنے کے لیے اس پر قبضہ کرنا ضروری تھا، بڑے معرکے کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا۔ اور گھنپورہ جو پانگل اور کوبلکنڈہ کے درمیان واقع ہے بہت توجہ کا محتاج تھا۔ پانگل سے گھنپورہ کی طرف فوجیں بڑھیں اور اس کو مسخر کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کوبلکنڈہ بھی فتح ہوا جو جنوب میں کرشنا، اور تنگبھدرا کی وادیوں پر قابو رکھنے کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ یہ دونوں قلعے قریب قریب واقع ہیں۔ ان فتوحات سے فارغ ہوکر سلطان قلی، گولکنڈہ واپس ہوا لیکن چند سال کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کھم میٹ کا راجہ قطب شاہی حدود پر دست درازی کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں سلطان قلی نے خود پیشقدمی کی۔ چونکہ کھم کی فوجی طاقت باقی تھی اس لیے قطب شاہی فوج سے بڑا معرکہ ہوا۔ بالآخر کھم میٹ کی منہزم طاقت شمالی تلنگانے کی طاقتوں سے متحد ہوگئی اور سلطان قلی کے مقابلے میں آمادہ پیکار ہوگئی۔ جو راجے لڑنے کے لیے متحد ہوئے تھے ان کے نام ہکجارام۔ رامچندر۔ سری چندر بتائے جاتے ہیں۔ ان کی متحدہ فوج تقریباً تین لاکھ پیدل اور تیس ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔ مقابلہ آسان نہ تھا۔ سلطان قلی بڑھتا ہوا دیلے گوداوری کے کنارے پہنچ گیا، اور اس زور سے مقابلہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایک بڑے علاقے پر قبضہ ہوگیا، بہت سا مال غنیمت ملا۔ اور شمالی طاقتوں سے صلح ہوگئی لیکن جب سلطان قلی گولکنڈہ واپس ہوا تو کشن رائے نے قطب شاہی حدود میں دست درازی شروع کردی، اس کے ساتھ مقابلے ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ، بلم کنڈہ اور کونڈبیر کے بڑے قلعے

مسخر ہو گئے۔ آخر میں نلگنڈہ کی لڑائی قابل ذکر اور دلچسپ ہے جو یہاں کے راجہ ہری چند سے ہوئی تھی۔ اس قلعے کا سخت محاصرہ ہوا، اور بڑی کشمکش کے بعد یہ فتح ہوا۔ اس طرح تقریباً تیس سال کے دوران میں سلطان قلی نے ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کیے اور سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے بندر گاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا، اور گولکنڈے کو ایک بہت ہی باعظمت سلطنت کی صورت میں منتقل کر دیا۔ اس کے متعلق خود اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"الحال قریب شصت سال باشد کہ شب و روز با کفار غزا نمودہ بہ توفیق و تائید او سبحانہ از سرحد ورنگل تا بندر مچھلی پٹم و راج بندری قریب شصت و ہفتاد قلعہ و حصار رفیع و مستحکم مثل قلعہ کوئل کنڈہ۔ دیورکنڈہ و پانگل وغیرہ بہ ضرب شمشیر آبدار و تصرف اولیائے دولت ابد پیوند در آوردم"[1]

۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء آواخر جمادی الاول میں دکن کے اس جلیل القدر حکمران کا انتقال ہوا۔ اس کی موت کا باعث اس کا بیٹا جمشید قلی تھا۔ انتقال کے بعد یہ لنگر حوض فیض اثر میں سپرد خاک کیا گیا جہاں اس کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء تک سلطان قلی قطب شاہ نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی منجملہ ان کے ابتدائی چوبیس سال اس کی صوبہ داری کے ہیں اور باقی خود مختاری اور بادشاہی کے۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی اس میں شامل کر لیا جائے جبکہ وہ سلطان محمود کے دربار میں بیدر آیا تھا تو اس طریقے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال دکن کی سیاسی خدمت کی تھی جو خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے کیونکہ اس ابتدائی دور میں بھی اس نے تلنگانے کے سرکشوں کی سرکوبی کی تھی اور اسی زمانے سے یہ اس خطۂ ملک کی سیاست سے وابستہ رہا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس پچاس یا ساٹھ سال کی مدت میں سلطان قلی قطب شاہ نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتے میں منسلک کر کے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۵۰۔

کر دی تھی جو تمدنی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ تلنگانے کی بہت بڑی خدمت تھی کہ اس کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتے میں منسلک کیا گیا۔ سلطان قلی کی فتوحات سے پہلے یہاں مختلف وحدتیں اور راجدھانیاں تھیں، ہر قلعہ اور حصار ایک راجہ اور نایک کے زیر نگیں تھا، اور اس سے جو نقصان پہنچ رہا تھا وہ ظاہر ہے۔ اب یہ اس کے جانشینوں کا کام تھا کہ اس متحدہ سلطنت کو نظم و نسق کے زیور سے سنوارتے۔



سلطان جمشید قلی قطب شاہ

تیسرا باب

عہد انتشار

سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال جو تقریباً ساٹھ سالہ عہد حکومت کے بعد نناوے سال کی عمر میں ہوا تھا کسی طرح بے وقت نہیں کہا جا سکتا۔ نیز گولکنڈے کی نوخیز سلطنت مستحکم ہو چکی تھی اور اس کے حدود مشرق میں مچھلی پٹم تک پہنچ گئے تھے لیکن یہ انتقال ایسے وقت میں ہوا ہے جبکہ سلطان کے متعدد بیٹے دعویدار سلطنت تھے اور خانہ جنگی کا پہلے سے سامان ہو چکا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ کے چھ بیٹے تھے[1]، فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لیے نامزد تھا اور جس کی قابلیت کے ساتھ سلطنت اور والیِ سلطنت کی تمام اُمیدیں وابستہ تھیں، باپ کی زندگی میں مر چکا تھا۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے مجبوراً حیدر قلی کے دوسرے بھائی قطب الدین کو ولیعہدی کے لیے نامزد کر دیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین میں کچھ منچلاپن اور سلطنت کا خاطر خواہ جذبہ نہیں تھا جو سلطنت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے اور یہ تینوں باپ کی زندگی سے سلطنت کے مدعی اور اپنے بھائی قطب الدین کا خاتمہ کر کے سلطنت پر مسلط ہونا چاہتے تھے۔ چھٹا اور سب سے چھوٹا بیٹا ابراہیم قلی تھا جو سب سے زیادہ لایق تھا۔ اس کے بلند کردار اور قابلیت کی وجہ سے سلطان قلی نے اس کو سلطنت کے مختلف

[1] تاریخ قطب شاہی۔ فرشتہ سلطان قلی کے صرف تین بیٹے بتاتا ہے جمشید قلی حیدر قلی اور ابراہیم جو صحیح نہیں ہے۔

کاروبار سپرد کر رکھے تھے چنانچہ سلطان قلی کے انتقال کے وقت یہ دیورکنڈے میں تھا۔ عبدالکریم نے باپ کے خلاف کھلی بغاوت کردی اور ملک سے باہر جاکر گولکنڈے کے خلاف بڑا فساد برپا کردیا یعنی جب حدود سلطنت میں اس کی ایک نہیں چلی تو بیجاپور جاکر باغیانہ مواد فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تمام کوششیں بارور نہیں ہوئیں اور بالآخر بیجاپور کے علاقے میں مرگیا! اور اس کے بعد جمشید قلی اور دولت قلی کی بھی بدنیتی حکومت کو معلوم ہوگئی۔ غالباً دولت قلی سے ایسی ناشایستہ حرکات سرزد ہوئی تھیں کہ لوگ اس کو "دیوانہ ملک زادہ" کہتے تھے اس مخدوش رویے کی وجہ سے سلطان قلی قطب شاہ نے ان دونوں کو مختلف قلعوں میں قید کردیا تھا تاکہ آپس میں میل جول ہونے نہ پائے، اور یہ قطب الدین پروار کر کے ملک میں فتنہ و فساد برپا نہ کریں جمشید گولکنڈے کے قلعے میں اور دولت قلی بھونگیر کے قلعے میں مقید تھے چونکہ دولت قلی مرکزی حکومت سے بہت دور تھا اس لیے وہ بے بس تھا، چنانچہ وہ کسی سازش میں حصہ نہیں لے سکا اور بھونگیر کے قلعے میں عمر بھر قید رہا اور قید ہی میں مرا لیکن جمشید قلی کا خود قلعے گولکنڈہ میں مقید ہونا اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا! اس نے قید میں سے سازش کا جال پھیلادیا! اس وقت اس کو اپنے بھائی قطب الدین سے زیادہ ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ قطب الدین جیسے کمزور آدمی کو راستے سے ہٹانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ اس کے باپ کی طرف سے تھی جو قطب الدین کی طرف مائل تھا۔ جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اگر سلطان قلی طبعی موت سے مرے تو قطب الدین کے لیے راستہ صاف ہوجائیگا۔ ممکن ہے کہ زندگی میں وہ قطب الدین کو اپنا جانشین بنادے! اس لیے سب سے پہلے جمشید نے خود باپ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کو اس کام کے لیے مقرر کیا، اس شخص نے موقع پاکر جبکہ سلطان قلی مسجد صفا میں نماز پڑھ رہے تھے حملہ کر کے قتل کردیا! اس وقت یہ مسجد صفا، یا جامع مسجد جو خود سلطان قلی قطب شاہ کی بنائی ہوئی ہے زیر تعمیر تھی۔ یعنی اس کے بعض حصے تعمیر کیے جارہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان اس وقت معماروں کو ضروری ہدایات دیکر نماز میں مشغول

لہ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۵۔

ہوئے تھے کہ محمود ہمدانی کے حملے کا شکار ہو گئے۔[1] باپ کے مرنے کے بعد[2] جمشید قید سے باہر نکلا، اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے تمام کل و جزء اپنے ہاتھ میں کر لیے۔ چونکہ قطب الدین ایک خاموش آدمی تھا، اور اس کے پست حوصلوں کی وجہ سے اس کے کوئی ہمدرد بھی نہ تھے۔ اس لیے اس موقعے پر قطب الدین اور اس کے چند ہمدردوں کی طرف سے کوئی جنبش نہ ہوئی۔ جمشید کے آدمیوں نے فوراً اس کے گھر پر دھاوا بول دیا، اور اس کے گھر میں گھس کر اس بے گناہ اور بدقسمت ولیعہد سلطنت کو اندھا کر دیا۔[3]

سنہ ۹۵۰ھ مطابق ۱۵۴۳ء میں جمشید قطب شاہ جس کا اصل نام یار قلی جمشید خاں تھا گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا اور ۹۵۷ھ مطابق ۱۵۵۰ء تک سات سال اس نے حکومت کی۔ گولکنڈہ کی دوسو سال کی زرین تاریخ میں یہ سات سالہ عہد حکومت کچھ ایسا کریہہ منظر پیش کرتا ہے گویا اس پوری تاریخ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ تخت نشیں ہونے کے بعد جمشید نے رعایا و برایا کو خوش کرنے کی کوشش کی، مختلف انعامات سے سرفراز کیا، اپنے نام کا خطبہ پڑھایا، دیگر سلاطین دکن کی طرف سے تعزیت و تہنیت وصول ہوئی، مگر اس کے باوجود راعی و رعایا میں وہ خوشگوار تعلقات نہیں پیدا ہو سکے جو اس کے پیشرو کے عہد حکومت میں تھے۔ اول تو جمشید کے ہاتھ دو آدمیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے، ایک طرف تو وہ اپنے

لہ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۷۱ لہ۔ تاریخ فرشتہ مقالہ سوم ص ۱۶۸۔

لہ۔ فرشتہ ان تمام واقعات کو حذف کر کے صرف سلطنت کی حرص و آز کو اس فعل قبیح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جمشید فرزند اکبر تھا، اور اس طرح اس کو اپنے کسی دوسرے بھائی سے کوئی خدشہ نہ تھا۔ باپ کو قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی عمر غیر ضروری طور پر طویل ہو رہی تھی، اور یہ حکومت کی آرزو میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس لیے قدرتی طریقۂ کار کے مقابلے، جو بہت سست ہوتے ہیں آسان اور سریع ذرایع سے کام لیکر باپ کا اپنے وقت سے پہلے خاتمہ کر دیا، اور اپنے حسب منشا تخت حاصل کر لیا۔ لیکن اس بیان کی گولکنڈہ کی تاریخوں سے تصدیق نہیں ہوتی۔

باپ کے خون کا ذمہ دار تھا تو دوسری طرف اپنے بھائی قطب الدین کو اندھا کر کے اس کو بے دست و پا کرنے کی قبیح ذمہ داری اس کے سر تھی۔ پدرکشی ایسا قبیح فعل ہے کہ قدیم و جدید کوئی تمدن اس کو گوارا نہیں کر سکا بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسے پدرکش ہر طرح ملعون رہے، اور عوام میں کبھی ان کی ہر دلعزیزی نہیں ہو سکی جمشید کے دامن پر محمود ہمدانی کا تیسرا خون بھی تھا۔ یہ ایک تیسرا شخص ہے جس نے انعام و اکرام کی بُری لالچ میں سلطان قلی قطب شاہ کو قتل کیا تھا لیکن اس کی آرزو پوری نہ ہوئی، اور یہ بھی جمشید کی تلوار کے گھاٹ اترا جب یہ سلطان کو قتل کر کے جمشید کے پاس پہنچا تو کہا جاتا ہے کہ اس واقعے کو چھپانے کے لیے اس نے اس کو تلوار سے قتل کر کے ایک گڑھے میں دفن کر دیا، تاکہ یہ راز سربستہ فاش نہ ہو اس طرح یہ قاتل بھی اس کی حرص و آز کا شکار ہوا یہ قبیح افعال جو بہت جلد طشت ازبام ہو گئے، جمشید کو ملک میں کبھی ہر دلعزیز نہیں کر سکے ملک میں ہر جگہ ان واقعات کے چرچے تھے۔ بوڑھے اور بچے اس کو طعن و تشنیع سے یاد کرتے تھے! اگرچہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی ہمیشہ مسرت و شادمانی کا پیام لاتی ہے اور افراد مملکت انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی کی رسم بجائے مسرت کے ملک میں غم و غصہ بڑھاتی رہی۔ لوگ سلطان مرحوم کی مظلومانہ موت اور قطب الدین کی بے بسی پر آنسو بہانے لگے۔ اُمرا و عہدہ دار دربار میں شریک تو ہوئے لیکن وہ دل سے خوش نہیں ہوئے اور بادل ناخواستہ بیعت کی اس کے علاوہ جمشید کی تلخ طبیعت نے بھی اس فضا کو اور مکدر بنا دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جمشید، باپ کی زندگی میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ جب مرنے کے وقت سلطان قلی کی عمر نناوے سال کی تھی تو جمشید ساٹھ سال سے کم نہ ہو گا، اور یہ ساٹھ سال اس کے کچھ اچھی طرح نہیں گذرے تھے۔ ابتدائی بچپن کا حال تو نہیں معلوم ہو سکتا، لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب اس کے بُرے جذبات کا پتا چلا شروع سے ہی اس کو قید و بند میں رکھنے کی کوشش کی گئی چنانچہ سلطان قلی کے مرتے تک یہ قید میں تھا، اور زندگی کے بُرے دن کاٹے تھے۔ ظاہر ہے کہ قید و بند کی روحانی اور جسمانی تکلیفیں انسان کی طبیعت پر بُرا اثر کرتی ہیں جس شخص کی اُٹھان اور پرورش بہت تنگ و تاریک فضا میں ہو، وہ کبھی فراخ دل اور بلند خیال نہیں ہو سکتا چونکہ جمشید کی زندگی کا بڑا حصہ قید اور تلخ کامیوں میں گذرا تھا، اس لیے اس کا

تنگ دل اور ترش مزاج ہونا ضروری تھا، ایک ساٹھ سالہ آدمی تخت نشین ہونے کے بعد اپنی ساٹھ سالہ بدمزاجیوں کو جو اس طویل زمانے سے طبیعت میں مرکوز ہوئی ہوں، دور نہیں کر سکتا۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمشید نے بہت تند مزاج اور ترش روئی پائی تھی۔ اور ہر چیز کو کوتاہ نظری سے دیکھتا تھا، اور معمولی باتوں کے لیے امرا و عمائد پر اس بُری طرح بگڑتا تھا کہ تمام درباری نہ صرف اس سے بیزار ہو گئے تھے[1]، بلکہ دربار چھوڑ کر بھاگ گئے اور اکثر لوگ ایسے تھے جو اس کے دوسرے بھائیوں کو تخت نشین کرنے کی سوچنے لگے اور ہر طرف سازش کا سامان ہونے لگا۔

ملک کا یہ حال تھا کہ ہر جگہ ایک بے چینی سی محسوس ہوتی تھی، اور سلطنت کے ذمہ دار عہدہ دار جمشید کے دوسرے بھائیوں کو تخت نشین کرنے کی کوشش میں تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈے سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا، برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈے کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والیِ احمد نگر کی تائید سے رفع ہو گیا، اور ابراہیم ناکام ہو کر بیجانگر چلا گیا، لیکن ملک برید اس حملے کے بعد سے گولکنڈے کی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے کافی طور پر واقف ہو گیا اور اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ گولکنڈے کی سلطنت کے مختلف حصوں پر کئی حملے کر دیے اور سلطنت کو خوب ستایا۔ دولت قلی کی طرف سے علیحدہ خطرہ لگا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ مرکزی حکومت سے بہت دور تھا، لیکن بعض ہمدرد اس کو قید سے چھڑا کر تخت نشین کرنا چاہتے تھے۔ یہ تمام حالات گولکنڈہ کی فضا کو اس قدر تلخ اور مکدر کیے ہوئے تھے کہ سلطنت کو بہت کم اطمینان نصیب ہو سکا۔ خصوصاً سلطان قلی قطب شاہ کے عین بعد ہی اس تاریک دور کا آنا ایک بیّن فرق کر دیتا تھا۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ سلطنت گذشتہ دور کی خوشحالی اور طمانیت سے محروم ہو گئی۔ چونکہ جمشید کے قبیح اثرات اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہے تھے، اس لیے یہ بے اطمینانی اور خانہ جنگی جمشید کے مرنے کے بعد بھی جاری رہی۔ اور

---

[1] فرشتہ کہتا ہے کہ جمشید بات بات پر لوگوں کو قتل کرتا تھا۔ اس بیان میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت تک اس کا سلسلہ چلا جب تک کہ اس کا بھائی ابراہیم قطب شاہ بیجانگر سے واپس آکر تخت گولکنڈہ پر جلوہ افروز نہ ہوا۔

جمشید قطب شاہ کے عہد کی لڑائیاں گولکنڈہ کی اس ناگوار سیاسی فضا کی وجہ سے جبکہ گھر میں بے چینی اور باہر سے ہر وقت حملوں کا ڈر لگا رہتا تھا، اس عہد میں سلطنت کی کوئی توسیع نہ ہوسکی۔ جو حدودِ سلطنت سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئے تھے اس میں کوئی اضافہ نہ ہوسکا اگرچہ سلطنت کی فوجی طاقت وہی تھی جو سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں پائی جاتی تھی اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمشید قطب شاہ بھی ایک اچھا سپاہی تھا، لیکن پہلے عہد کا سا ولولہ نہ تھا جمشید کی اخلاقی حالت فوج کی تنظیم اور کارکردگی پر بُری طرح اثر انداز تھی۔ فوجوں میں جو کچھ طاقت تھی، وہ یا تو خانہ جنگی کی نذر ہوئی یا دکن کے سلاطین کی باہمی رقابتوں کا جواب دیتی رہی، اس لیے سلطنت کی توسیع کہاں ممکن تھی!

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جب دکن میں پانچ سلطنتیں قایم ہوئیں تو شروع سے ہی ان میں رقابت کا سامان پیدا ہوگیا، اور رحمانہ جنگیاں ہونے لگیں جو ان حالات کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جمشید کا عہد تو بس انھیں لڑائیوں سے پُر ہے اور اس کا سلسلہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوچکا تھا۔ جمشید قطب شاہ کے عہد میں سب سے پہلی لڑائی اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم کی وجہ سے ہوئی تھی، یہ اپنے باپ کے آخری زمانے میں دیوکنڈے میں تھا۔ جمشید نے اس کا بھی خاتمہ کرنا چاہا، کیونکہ یہ اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ لائق تھا، اور جمشید کو اپنے اس بھائی سے بہت خطرہ تھا۔ لیکن ابراہیم دیوکنڈے سے بھاگا، اور والیِ بیدر کی مدد سے گولکنڈے پر حملہ کردیا جو جمشید کے لیے بہت پریشان کن تھا، مگر احمد نگر کی امداد سے جمشید کامیاب ہوگیا۔ یہ برہان کی اس بروقت امداد سے اس قدر خوش ہوا کہ اظہارِ ممنونیت کے لیے احمد نگر جا کر اس سے ملاقات کی۔ احمد نگر میں جمشید کی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ آؤبھگت کی گئی۔ چتر و آفتاب گیری اور "شاہ" کا خطاب پیش کیا گیا تھا۔ اس نے دعوتیں تو قبول کیں لیکن شاہی اعزازات قبول نہیں کیے، اور اس کے جواب میں حسبِ ذیل اشعار کہے تھے:۔

مرانیست باچتر شاہی نیاز خطابے نخواہم بہ عمر دراز
کہ شاہان ملک دکن بالتمام گرفتند از آں چتر شاہی بنام
کہ از روئے مردی و مردانگی ہماں روز شمشیر و فرزانگی
ربودند گوئے از سپہر دو رنگ زمیدانِ مردی بہ چوگانِ جنگ
چو من ضرب دست شجاعت بہ شاہ نمایم بگیرم خطاب و کلاہ
من آنگہ کنم چتر شاہی قبول کہ گیرم ز دشمن بہ عون رسول

چونکہ اس زمانے میں سرحدی نزاع، اور خصوصاً شولاپور کی وجہ سے بیجاپور اور احمد نگر کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے اس لیے برہان نظام شاہ کے لیے جمشید قطب شاہ کی دوستی اور اتحاد خاص معنیٰ رکھتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شاہ طاہر نے احمد نگر کو برید کے مقابلے میں گولکنڈے کی مدد کے لیے ابھارا تھا اور جب جمشید، برہان سے ملنے کے لیے احمد نگر گیا تو وہاں اس کی حد سے زیادہ آؤ بھگت کی گئی اور اس کے جذبۂ خودداری کی داد دی گئی اور یہ تمام ذرایع حصول اتحاد کے لیے استعمال کیے گئے۔ اور اتفاق سے اسی زمانے میں جبکہ جمشید احمد نگر میں مہمان تھا شولاپور پر حملہ کرنے کا مسئلہ گرم تھا اور فوجی تیاریاں ہو رہی تھیں جمشید کی آمد بہت غنیمت سمجھی گئی چنانچہ برہان نظام شاہ نے ایک طرف جمشید قطب شاہ کو اپنے ساتھ لیا، اور دوسری طرف اپنے ہمسایہ رئیس عماد الملک کو شریک کار کرکے غالباً ۹۵۱ھ ۱۵۴۴ء میں شولاپور پر دھاوا بولدیا۔ ابراہیم عادل شاہ اول اس سیاسی اتحاد سے بالکل بے خبر تھا، اس کو توقع نہ تھی کہ دکن کی تین سلطنتوں کی متحدہ فوجیں اچانک شولاپور پر چڑھ دوڑیں گی۔ چونکہ ابراہیم عادل شاہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اس لیے دشمنوں کی توجہ کو پراگندہ کرنے کے لیے فوراً احمد نگر کے مقبوضہ ضلع پرینڈہ پر حملہ آور ہوگیا، اور دونوں حریف فوجیں پرینڈہ پر برسرپیکار ہوئیں ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں بھی تھیں۔ بیجاپور کی فوجوں نے اس قدر ڈٹ کے مقابلہ کیا کہ معرکہ بہت سخت ہوگیا اور طول کھینچ رہا تھا۔ اس موقع پر جمشید اور اس کی فوجوں نے بڑا کام کیا، اس نے آگے بڑھ کر دشمن کی سپاہ پر کئی وار کیے

اور حریف کی فوجیں تتر بتر کردیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، چونکہ برید بیدر کی طرف بھاگا تھا، جمشید نے اس کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا، اور بہت سا مال غنیمت لیکر گولکنڈہ واپس ہوا۔ جمشید کی یہ امداد، اور اس کا دلیرانہ حملہ احمد نگر کے لیے باعث ممنونیت تھا، اس لیے احمد نگر کی سلطنت نے گولکنڈے کی رفاقت کبھی نہیں چھوڑی۔

اس شکست کے بعد علی برید خاموش نہیں رہا، اور احمد نگر سے زیادہ گولکنڈے سے انتقام لینے کی کوشش کی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس ہزیمت میں جمشید کا زیادہ حصہ تھا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جمشید نے بیدر کی دیواروں تک برید کا سخت تعاقب کیا تھا، اس لیے برید نے اس سے انتقام لینے کے لیے غالباً ۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء میں گولکنڈے پر حملہ کردیا لیکن گولکنڈے میں قوت مدافعت کافی تھی، جمشید نے اس موقع پر ایک خاص تدبیر سے کام لیا۔ گولکنڈے میں تو اس کی ہلکی سی مدافعت کی، یعنی قلعے کو دوسرے سپہ سالاروں کے سپرد کرکے خود دوسرے راستوں سے بیدر پہنچ گیا، اور وہاں حملہ کر بیٹھا جب برید کو یہ خبر پہنچی تو وہ فوراً بیدر کو بچانے کے لیے بھاگا۔ بنچرو اور کلبگور کے درمیان جمشید اور برید کی فوجوں کا سامنا ہوا۔ لڑائی بہت شدید ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ عین لڑائی میں جمشید ہاتھی سے نیچے اتر گیا، اور اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوجانے سے کچھ دیر کے لیے فوج میں بدحواسی پھیل گئی لیکن بالآخر گولکنڈے کی فوجیں دشمن پر غالب رہیں اور دونوں فوجیں اپنے اپنے مستقر کو واپس ہوگئیں۔[۱]

ان متعدد ہزیمتوں کے باوجود برید بخنت نہیں بیٹھا، بلکہ اس کا جذبۂ انتقام ہر روز تیز ہوتا گیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح گولکنڈے کی قوت توڑے چونکہ ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور سے اس کا اتحاد تھا اس لیے بیجاپوری فوج کی مدد سے غالباً ۹۵۳ھ ۱۵۴۶ء میں قلعۂ میدک پر قبضہ کرلیا، اور وہاں چالیس ہاتھی اور سات ہزار ہون مال غنیمت حاصل کیے۔ جمشید نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی پہلے تو بیدر پر حملہ کرنا چاہا،

[۱] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۴۔

لیکن آخر کو، کولاس پہنچکر بریدی سلطنت کے مختلف حصوں پر چھاپے مارنے شروع کیے تاکہ برید پریشان ہوکر میدک چھوڑدے۔ برید آٹھ ہزار فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے آیا۔ نارائن کھیڑ کے قریب یہ دونوں فوجیں ملیں اور بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ جمشید نے بڑھ کے حملے کیے تو بریدی فوج کے بہت سے پہلو منتشر ہوگئے چنانچہ بہت دنوں کے لیے میدان میں خاموشی چھاگئی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ عین الملک کا بیٹا جو برید کے بڑے سپہ سالاروں میں سے تھا برید کو چھوڑکر گولکنڈے کی فوجوں سے ملگیا۔ اس دوران میں گولکنڈے کے بڑے مشہور جنرل جگدیو راؤ نے جو تاریخوں میں اعظم جگدیو راؤ لکھا جاتا ہے، جمشید کو یہ رائے دی تھی کہ کولاس کے قرب وجوار میں قدرتی پہاڑ پر ایک نیا قلعہ تعمیر کرکے اپنے قدم مضبوط کرلے چونکہ یہ بہت اچھی تجویز تھی اس لیے یہاں پر بادشاہ کے حکم سے جگدیو راؤ نے نئے قلعے کی تعمیر کرلی تھی جب نارائن کھیڑ کی جنگ شروع ہورہی تھی، اس وقت یہ نیا قلعہ تیار ہوچکا تھا، اور جب یہ جنگ ذرا تھم گئی تو جمشید اس قلعے کے معاینے کے لیے کولاس گیا، اس کی عدم موجودگی سے فایدہ اٹھاکر برید نے اچانک حملہ کردیا۔ گولکنڈے کے جنرل جن میں عین الملک کا بیٹا بھی تھا کھانے پینے میں معروف ہوگئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈے کی فوجوں کو بری طرح شکست ہوئی اور عین الملک کا بیٹا مارا گیا، اور منہزم فوج کولاس تک بھاگ آئی جمشید نے فوراً منتشر فوجوں کو یکجا کرکے برید پر پیشقدمی کی لیکن برید اس مقابلے کے لیے تیار نہ تھا، وہ بیدر بھاگ گیا۔ جمشید نے نارائن کھیڑ حسن آباد وغیرہ پر قبضہ کرلیا قلعۂ کولاس کو فوجوں اور اسلحہ سے مستحکم کیا، اور یہ تمام ولایت جگدیو راؤ کے تفویض کرکے گولکنڈہ واپس ہوا۔

اگرچہ برید کو ان لڑائیوں میں شکست ہوتی رہی، لیکن اس کا بار بار حملہ کرنا پریشانی کا باعث تھا، اور سلطنت کو ہمیشہ باخبر رہنا پڑتا تھا گولکنڈہ آنیکے بعد جمشید نے صورت حال پر غور کرکے برید کے استیصال کی تدبیریں سوچیں، اور برہان نظام شاہ کو اس معاملے کی طرف توجہ دلائی کہ کسی طرح برید کا خاتمہ کرنا ضروری ہے ورنہ اس کی ریشہ دوانیوں اور بار بار کے حملوں سے دکن کا سیاسی مطلع ہمیشہ غبار آلود رہیگا، اور کسی سلطنت کو اطمینان حاصل نہ ہوگا۔ برہان نے اس رائے سے اتفاق کیا، اور تجویز یہ ہوئی کہ چو طرف سے

حملہ کرکے برید کے تمام اقطاع مسخر کرلینے چاہئیں چنانچہ اسی ۹۵۳ھ ۱۵۴۶ء میں برہان نے قلعۂ اوسہ، اور اودگیر پر حملہ کر ہی دیا، اور ادھر سے جمشید قطب شاہ اپنی فوجوں کے ساتھ کولاس پہنچ گیا۔ پہلے اوسہ جاکر برہان نظام شاہ سے ملاقات کی جو دونوں سلاطین کے لیے مسرت کا باعث تھی اور اس کے بعد برہان کی رائے سے قلعۂ میدک پر جو ابھی تک برید کے قبضے میں تنہا حملہ کر دیا۔ قلعے کے محاصرے میں بہت دیر لگی اور بڑی خونریزی کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا۔ اس قلعے کی تسخیر سے جمشید کو بہت سا مال غنیمت حاصل ہوا۔ دوسری طرف برہان کے حلیف عماد شاہ نے اوسہ، اور اودگیر فتح کر لیے۔ جب اس طرح برید کو سخت پریشانی ہوئی تو وہ بیجاپور سے مدد کا طالب ہوا چونکہ احمد نگر کی رقابت میں بیجاپور کی سلطنت برید کے اتحاد کو ضروری سمجھتی تھی اس لیے ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ایک جنرل اخلاص خاں کے ماتحت پانچ ہزار کی ایک مضبوط فوج برید کی امداد کے لیے روانہ کی۔ برید اس فوج کے ساتھ قلعۂ کولاس پر حملہ آور ہو گیا۔ جمشید قطب شاہ کے عہد کا یہ بہت بڑا معرکہ تھا۔ جمشید نے اس کے مقابلے کے لیے اپنی فوج کی باضابطہ صف آرائی کی اور خود قلب لشکر میں کھڑا رہا، اور میمنہ و میسرہ پر شفقت خاں، عین الملک اور جگدیو راؤ کو متعین کیا گیا۔ دشمن کی طرف سے برید اور اس کے معاون جنرل اخلاص خاں نے خاطر خواہ زور دکھایا لیکن گولکنڈے کی فوجوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ جگدیو راؤ، اور عین الملک کی کارگزاری قابل تعریف تھی۔ برید کو بڑی ہزیمت ہوئی اور وہ بیدر بھاگ گیا۔ جمشید بہت کچھ مال غنیمت حاصل کرکے گولکنڈہ واپس ہو گیا۔[1]
اگرچہ کولاس کی اس لڑائی میں برید کو خاطر خواہ شکست دی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود جمشید اور برہان کے حقیقی مقاصد پورے نہیں ہوئے۔ برید کی طرف سے آئندہ سیاسی انتشار کا ڈر لگا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کی بر وقت امداد سے برید کو تقویت حاصل ہو گئی، ورنہ ۹۵۲ھ ۱۵۴۶ء کی لڑائیوں میں جو ہم اوپر

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۲۱-۱۲۲۔

دیکھ آئے ہیں، برید کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا، اس لیے گولکنڈہ واپس آنیکے بعد جمشید قطب شاہ نے پھر اس معاملے پر غور کیا، اور اس وقت اس کو برید کے علاوہ ایک اور دشمن کی یکسوئی ضروری معلوم ہوئی، اور وہ بیجاپور کی سلطنت تھی جو برید کی تائید کرتی تھی، اور جب تک اس کی یکسوئی نہ ہوتی، برید کا استیصال ناممکن تھا چنانچہ اس معاملے میں برہان نظام شاہ سے مشورہ کیا گیا کہ کسی طرح بیجاپور کو برید کی مدد سے باز رکھنا چاہیے نظام شاہ سے کہا گیا کہ بیجاپور سے اس معاملے میں خط و کتابت کرے۔ اس زمانے میں احمد نگر اور بیجاپور کے تعلقات کچھ زیادہ کشیدہ نہ تھے اس لیے برہان نظام شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کو فوراً اس مضمون کا خط لکھا کہ برید کے شر و فساد سے ہمیشہ دکن کا مطلع غبار آلود رہتا ہے اس سے نہ صرف بیگناہ خلق اللہ کا ناحق خون ہوتا ہے بلکہ سلاطین دکن کو بھی اطمینان نہیں ہوتا، لہذا برید کا خاتمہ کرنا سب کے لیے مناسب ہے[1] ابراہیم نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور بجائے برید کے احمد نگر، اور گولکنڈے کی تائید پر آمادہ ہو گیا چنانچہ تجویز یہ ہوئی کہ نظام شاہ قندھار پر حملہ کرکے جو برید کا بڑا قلعہ تھا مسخر کرے اور ابراہیم سے یہ کہا گیا کہ بجائے خاموش بیٹھنے کے ویجیانگر کی ہندو سلطنت پر حملہ کرکے ممکنہ فتوحات حاصل کرے، چنانچہ ۹۵۴ھ ۱۵۴۷ء میں پھر سلاطین دکن نے چوطرف سے فوج کشیاں شروع کر دیں برہان نے فوراً پیشقدمی کرکے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ برید پریشان ہو کر امداد کے لیے بیجاپور بھاگا۔ چونکہ اس وقت اس کے شر و فساد کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا، اس لیے ابراہیم نے مدد کرنے کی بجائے اس کو بیجاپور میں گرفتار کر لیا، اور خود ویجیانگر کی طرف پیشقدمی کی اور یہاں اس نے بہت سے قلعے فتح کر لیے۔

لیکن اس اثنا میں احمد نگر، اور بیجاپور کی دیرینہ رقابت پھر عود کر آئی۔ برہان کو یہ ڈر ہوا کہ ویجیانگر کی فتوحات سے بیجاپور کی طاقت غیر معمولی طور پر بڑھ جائیگی اور احمد نگر کے لیے خطرناک ہوگی، اس بڑھتی ہوئی طاقت کا فوری سد باب کرنے کے لیے برہان نے شولاپور پر حملہ کر دیا۔ بیجاپور کو چھوڑ کر ابراہیم شولاپور کو

---

[1] دکن کی سیاست ہمیشہ عادل شاہی اور بریدی سلطنتوں کی دست درازیوں سے مکدر رہتی رہی۔

بچانے کے لیے بھاگ آیا، اور یہ دونوں جمشید قطب شاہ کو امداد کے لیے بلانے لگے اور برید علیحدہ جمشید سے التماس کر رہا تھا کہ خدا کے لیے اس کو قید سے چھڑایا جائے جمشید کے لیے یہ صورت حال بہت نازک تھی چونکہ احمد نگر سے اس کے دیرینہ تعلقات تھے اس کے مقابلے میں وہ بیجاپور کی مدد نہیں کر سکتا تھا لیکن برید کی بجاجت سے متاثر ہو کر اس کو رہا کرنے کی کوشش کی اور اس غرض کے لیے ذرا فریب سے کام لیا۔ بیجاپور کے ایلچی کو مدد کی ترغیب دلائی کہ میں اس شرط پر مدد کر سکتا ہوں کہ برید کو رہا کر دیا جائے اس لالچ میں ابراہیم نے برید کو رہا کر دیا جب برید رہا ہو گیا تو امداد کا سوال پیدا ہوا۔ تمام عمائد سلطنت نے یہ رائے دی کہ اس وقت کسی کی مدد نہ کرنی چاہیے بلکہ برید کو ساتھ لیکر گولکنڈے کی طرف کوچ کر دینا چاہیے چنانچہ جمشید نے اس وقت کسی کی مدد نہیں کی بلکہ گولکنڈے کی طرف مراجعت کر دی چونکہ بیدر راستے میں پڑتا تھا اس لیے کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ برید نے اظہار ممنونیت میں جمشید کی بڑی آؤ بھگت کی، نذرانے پیش کیے جن میں قیمتی جواہرات بھی تھے جمشید نے یہ جواہرات ملازمین میں تقسیم کر دیے اور خود گولکنڈہ واپس ہو گیا۔ سلاطین دکن کی باہمی رقابت سے برید کا خاتمہ ہو سکا نہ جالویریا فتوحات حاصل ہوئیں۔ دوسری طرف شولاپور میں جنگ کی آگ بھڑکتی رہی۔[1]

---

[1] اس واقعے کے متعلق فرشتے نے نہایت مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس موقع پر جمشید نے احمد نگر کی امداد کے لیے بیجاپوری علاقوں پر حملہ کر دیا تھا، اور دکن کے علاقے میں ایک قلعہ بنا لیا تھا۔ ابراہیم نے برہان اور والی ویجانگر سے مزاج سے صلح کر کے جمشید کا مقابلہ کیا، اور اس کو شکست دیدی بیجاپور کے مشہور جنرل اسد خاں لاری نے اس کا گولکنڈے کی دیواروں تک پیچھا کیا، چنانچہ فرشتے کے بیان کے مطابق خود جمشید اس لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا، اور اس کا ہونٹ اس بری طرح کٹ گیا کہ وہ کھانے پینے سے معذور ہو گیا تھا، اور دوسروں کے سامنے کھانا نہیں کھاتا تھا۔ لیکن گولکنڈے کی تاریخوں سے ان واقعات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بیجاپور، اور اسد خاں لاری کی مدح سرائی میں یہ فرشتے کا مبالغہ معلوم ہوتا ہے (تاریخ فرشتہ ص ۱۶۹)۔

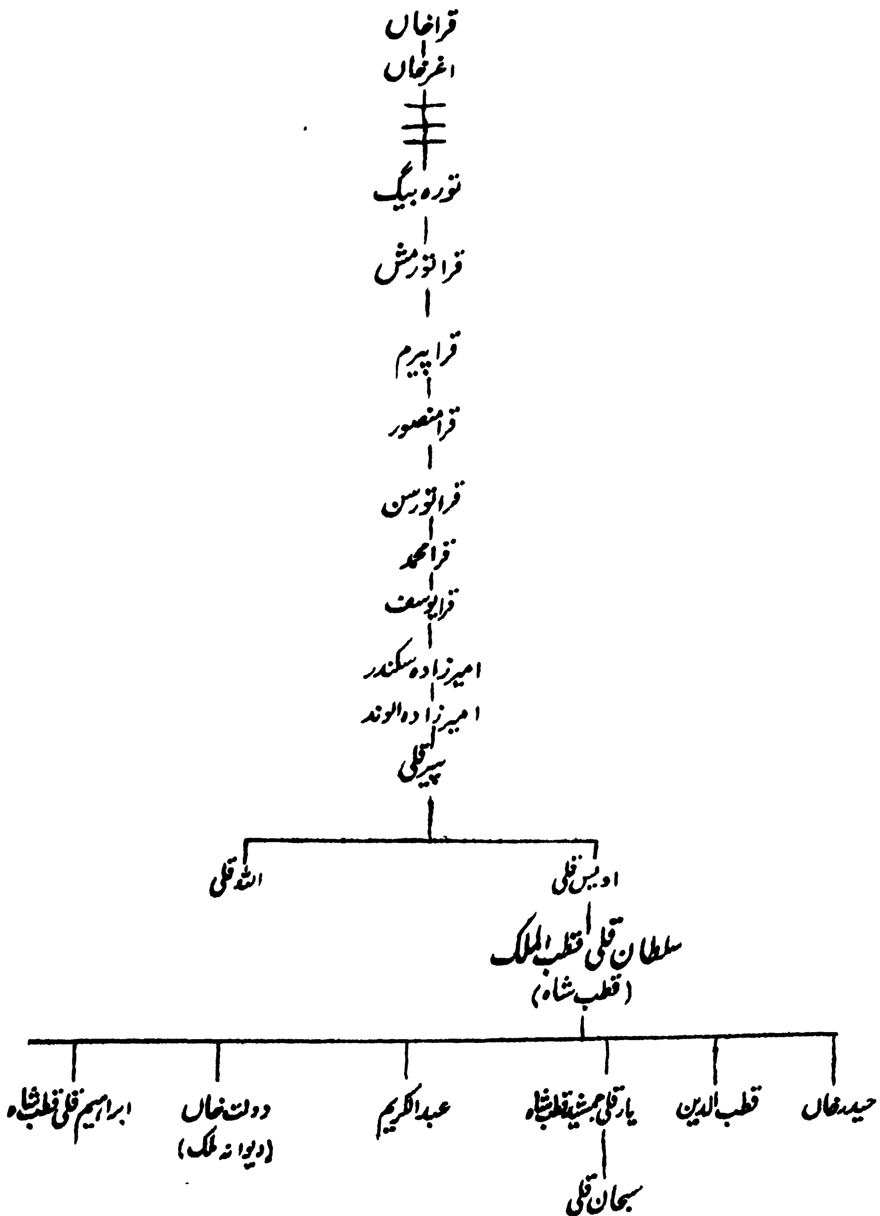
بیدر سے واپس آنیکے بعد جمشید کے دو تین سال آرام میں گذرے، اور یہ اس کے اطمینان کا زمانہ تھا۔ چار پانچ سال کی متواتر جنگ و جدال کے بعد اس زمانے میں اس کو عیش و آرام نصیب ہوا تھا لیکن یہ بہت دنوں تک جاری نہیں رہا۔ دو سال کے بعد جمشید بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا جو اس کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ فرشتہ تو یہ مرض، دق بتاتا ہے، لیکن تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمے سے بالآخر ۹۵۵ھ ۱۵۵۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ صرف سات سال اس نے حکومت کی، سلطان قلی قطب شاہ کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر جو گنبد ہے وہ اپنی تعمیر کاری میں انوکھی شان رکھتی ہے۔

چونکہ حصول تخت و تاج کے لیے جمشید سے بہت قبیح افعال سرزد ہوئے تھے، اور اس کی طبیعت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ آخر عمر میں گولکنڈے کی سیاسی فضا بہت تلخ ہو گئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے گرد و پیش میں اس کے اچھے اوصاف بھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے پائے جاتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ فوجی تنظیم اس کی نہایت اچھی تھی، اور وہ خود بھی اس قدر جری سپاہی تھا کہ فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا، اس نے اکثر لڑائیوں میں خود پیشقدمی کی اور آگے بڑھ بڑھ کے وار کیے اور دشمن کے دل توڑ دیے چنانچہ اس دلیری اور جرأت کا نتیجہ تھا کہ سوائے نارائن کیڑ کی جنگ کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت نے کام خراب ہوا، گولکنڈے کی فوج اس کو کبھی شکست نہیں ہوئی، اور دکن کے سلاطین ہمیشہ اس کی امداد کے طالب رہے، اس چیز کو جمشید اپنے لیے بڑا طغرائے امتیاز سمجھتا تھا جب برہان نے اس کو خطاب اور شاہی اعزازات دینے چاہے تو اس نے انکار کر دیا، اور کہا کہ:-

"مجھے اس کی ضرورت نہیں! مجھ میں شجاعت اور سپاہیانہ جوہر ہیں، وہی میرے لیے طغرائے امتیاز ہیں!"

اس سے نہ صرف اس کی شجاعت، بلکہ انتہائی خود داری ثابت ہوتی ہے۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید قطب شاہ میں علمی قابلیت بھی تھی، وہ ایک اچھا شاعر تھا، بعض دفعہ اس نے فی البدیہ اشعار بھی کہے تھے۔



نوٹ:۔ یہ شجرہ "کلام الملوک" مولفۂ میر سعادت علی صاحب رضوی سے لیا گیا ہے۔ ۱۲

حصّۂ دوم

سلطنت کا استحکام

چوتھا باب

ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے

ابو المظفر ابراہیم قطب شاہ جو ۹۵۷ھ ۱۵۵۰ء میں تخت نشین ہوا تھا گولکنڈے کی سلطنت کا حقیقی معمار ہے۔ اس کو گولکنڈے کی تعمیر اور توسیع کا واقعی ذمہ دار سمجھنا چاہیے لیکن یہ ان حکمرانوں میں سے ہے جن کو حصول سلطنت تو کجا خود اپنی بقا کے لیے زندگی کے سخت تلاطم سے گزرنا پڑا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کشاکشِ زیست کا ایک دلچسپ مُرقع ہے۔ جب گولکنڈے کے بانی مبانی سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو اس کے جانشینوں کی خود غرضی کی وجہ سے گولکنڈے کے در و دیوار پر تاریکی چھا گئی۔ سیاست کے تار و پود جگہ جگہ سے بکھرنے لگے۔ راعی و رعایا کے خوشگوار تعلقات باقی نہ تھے۔ لایق لوگ یا تو پابہ زنجیر تھے، یا ملک چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور رعایا جنگیوں کا بازار گرم تھا۔ یہ جمشید قطب شاہ کے عہد کا جملہ ماحصل ہے۔ ابراہیم قطب شاہ انھیں افسوسناک حالات کا شکار تھا، اس کو پہلے اپنی جان بچانے کے لیے سلطنت کے حدود سے دُور بھاگنا، اور ایک غیر مُلک میں پناہ لینی پڑی۔ جلاوطنی کی تمام مشکلات برداشت کرکے اور مختلف مزاحمتوں کا مقابلہ کرکے اُس کا گولکنڈے کے تخت پر اجلاس کرنا ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کو تخت نہ ملتا تو قطب شاہی خاندان کا جمشید قطب شاہ کے بعد ہی خاتمہ ہو جاتا اور گولکنڈے کی دو سو سالہ عظمت کبھی نہ پیدا ہوتی۔

ابراہیم قطب شاہ سلطان قلی کا چھٹا اور سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کی پاکیزہ زندگی بچپن سے اس کو ممتاز رکھتی تھی۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے خلاف اس ہونہار شہزادے نے شروع ہی سے کچھ ایسی سنجیدگی اور باپ کے ساتھ

وفاشعاری ظاہر کی کہ سلطان قلی قطب شاہ اس سے بہت خوش تھا ایسی تاریک فضا میں جبکہ اس کے بڑے بھائی سلطنت کے خواب دیکھتے تھے اور باپ کے خلاف بغاوت کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے ابراہیم کی سنجیدگی اور شرافت اس کی آیندہ عظمت کا پیام دیتی تھی معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاکیزہ رجحانات کو دیکھ کر سلطان قلی قطب شاہ نے نہ صرف اس کی تعلیم و تربیت میں کافی دلچسپی لی بلکہ عملی تجربوں کے لیے سلطنت کے بعض انتظامی کام بھی اس کے تفویض کر رکھے تھے۔ چنانچہ یہ سلطان قلی قطب شاہ کے آخری زمانے میں دیورکنڈے میں متعین تھا[1] تاکہ وہاں امن قایم کرے چونکہ یہ مشرقی قطاع سلطان قلی کے عہد میں فتح ہوئے تھے یہاں غالباً خاطر خواہ امن نہیں تھا اور کچھ تعزیری انتظامات کی ضرورت تھی یہ بتانا مشکل ہے کہ ابراہیم دیورکنڈے میں کب مامور کیا گیا تھا لیکن تاریخ کا یہ بیان کہ باپ کے انتقال کے وقت ابراہیم سنِ شعور کو نہیں پہنچا تھا[2] صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دیورکنڈے کے انتظامات کی تفویض جو اس تاریخ سے معلوم ہوتی ہے وہ اس چھوٹی عمر میں ممکن نہیں ہے۔ نہ صرف نظم و نسق بلکہ اس انتظامی قابلیت سے جو اس نے یہاں ظاہر کی تھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی کے انتقال کے وقت، بلکہ اس سے پہلے جبکہ یہ دیورکنڈے میں متعین کیا گیا تھا، اس کی عمر کافی ہوگی۔

ابراہیم کے اصل سیاسی جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ اس کو اپنے باپ کے انتقال کے بعد وسلطنت چھوڑ نے بڑے اور ایک غیر ملک میں پناہ لینی پڑی تھی۔ بیجانگر سے غیر ملک میں جو ایک ہندو سلطنت تھی اپنی جگہ پیدا کرنا اور وہاں سے سلطنت کے حصول کی کامیاب تدبیر اختیار کرنا، ابراہیم کی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہے۔ اس کے پاکیزہ اخلاق اور سیاسی عظمت کا اثر یہ تھا کہ کئی آدمی اس کے ساتھ ہر قسم کا ایثار کرنے اور بیجانگر کی ہولناک بادیہ نوردی میں اس کے ساتھ ہر قسم کی مصیبت جھیلنے کے لیے آمادہ ہو گئے جمشید کے انتقال کے بعد جب گولکنڈے کی بساط الٹی تو دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں جو اس وقت زندہ تھے، گولکنڈے کی سلطنت میں ابراہیم کے ساتھ عام ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اور عجیب بات ہے کہ جب ابراہیم کے قطب شاہی کاروان نے گولکنڈے کی طرف پیشقدمی کی تو لوگ جوق جوق اس کے گرد

---

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۷ ۔ [2] ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳ ۔

جمع ہونے لگے اور سلطنت کا سیاسی مطلع خود بخود صاف ہوگیا۔ ان دشمنوں کے باوجود ابراہیم قطب شاہ کا بلا کھٹکے
قلب شاہی تخت پر جلوس کرنا بہت بڑا واقعہ تھا جس میں قدرتی حالات کے ساتھ خود ابراہیم کی ذاتی قابلیت اور
تدبر کو بڑا دخل ہے جو اس کے دوسرے بھائیوں میں مفقود تھے۔

اگرچہ جمشید اپنے باغیانہ رویے کی بنا پر باپ کی زندگی میں قید تھا لیکن یہ اس کی جسمانی قید تھی اور
اس کا ذہن اور دماغ اپنے کام میں مصروف تھا۔ قید و بند میں بھی اس نے اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے۔ اس کے
نزدیک حصول سلطنت کا سب سے زیادہ سریع اور آسان طریقۂ کار یہ تھا کہ باپ کا طبعی موت سے پہلے خاتمہ کردے
کیونکہ اس کو یہ معلوم تھا کہ سلطان اتنا ہی جیو تو اور زندہ رہے تو اس کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ اس دوران میں
قطب الدین کو اپنے ہاتھ پیر مضبوط کرنے کا کافی موقع مل جاتا اور اغلب یہ تھا کہ سلطان قلی اپنی کبرسنی کا لحاظ کرکے قطب الدین کو
خود اپنی زندگی میں تخت نشین کردے۔ ایسے بدنام اور قبیح افعال سے کام لے کر جمشید قطب شاہ ۹۵۰ھ (۱۵۴۱ء) میں سلطنت کے
تخت پر بیٹھ گیا۔ گو اس طریقے سے وہ سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن بہت سی مزاحمتیں اور باقی تھیں۔ ایک طرف
تمام رعایا و برایا کو ہموار کرنا تھا جو اس کے شنیع افعال سے کبھی خوش نہیں ہوئے۔ دوسرے سلطنت کے اور دعویدار
باقی تھے جن کو راستے سے ہٹانا بھی ضروری تھا۔ ان دعویداروں میں دولت قلی اور ابراہیم تھے۔ ان کے متعلق ڈر یہ تھا کہ اگر
یہ اپنی حالت پر چھوڑ دیے جائیں تو ممکن ہے کہ ایسے لوگ جو جمشید سے ناخوش تھے، دولت قلی اور ابراہیم کا ساتھ دیں
اور ان کو بادشاہ بنانے کی کوشش کریں۔ دولت قلی تو بھونگیر میں قید تھا، اس کی قید سخت کردی گئی لیکن ابراہیم کا مقابلہ
بہت مشکل تھا اور اس سے ڈر کی کافی وجہیں تھیں۔ اول تو ابراہیم مقید نہ تھا، دوسرے اس کی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔
جہاں دوسرے بھائی اپنے باغیانہ رویے کی وجہ سے مقید و مطعون تھے، ابراہیم نہ صرف آزاد تھا بلکہ امور سلطنت کے
انصرام کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ ایسے سلطنت کے دعویدار کو راستے سے ہٹانا، اور اس سے اطمینان حاصل کرنا جمشید کے
بس کی بات نہ تھی، اس کے پاس اب وقت صرف یہ چارہ کار تھا کہ مختلف طریقوں سے ابراہیم کو گولکنڈہ طلب
کرے، چنانچہ یہی کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جمشید کا بلاوا ابراہیم کے لیے بہت معنیٰ خیز تھا جب قطب الدین کو، جو جائز وارث تھا، اندھا کرکے بے دست و پا کیا گیا تو ابراہیم کو جمشید سے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ ابراہیم کو جمشید سے ڈرنے کی کافی وجہ تھی، اس کی سلامتی اس بات میں تھی کہ وہ دیورکنڈے سے بھاگ کر کسی اور جگہ جان بچائے۔ اس بارے میں اس نے ان ہمدردوں سے رائے لی جو اس کے ساتھ تھے، اور ہر ایثار کے لیے تیار تھے جمید خاں حبشی، سیدجی سلحدار، دلاور خاں، کاماجی برہمن، وہ ہمدرد تھے جنھوں نے ابراہیم کا آخری وقت تک ساتھ دیا، اور ہر مصیبت جھیل کر اس کو بالآخر تخت سلطنت پر بٹھایا۔ ان ہستیوں کے نام اور کارناموں کی وضاحت کیے بغیر ابراہیم قطب شاہ کی تاریخ پوری نہیں ہوتی۔ ان لوگوں نے اس کو بیدر جانے کی صلاح دی، تاکہ والیِ بیدر سے مل کر اپنی بقا کی تدبیر سوچے۔ ابراہیم پہلے بیدر گیا، اور برید سے امداد لی تھی برید نے ابراہیم کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا تھا۔ علی برید کو ابراہیم سے کوئی ہمدردی تو نہ تھی، لیکن بریدیوں کی خاص سیاست ایسے موقعے کی متلاشی رہتی تھی چونکہ وہ خود طاقتور نہ تھے، اس لیے اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو آپس میں لڑا کر اپنا بچاؤ کرتے تھے۔ اس دعویدار سلطنت کے بیدر آنے سے برید کو گولکنڈے پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اگر برید اور ابراہیم کا متحدہ حملہ گولکنڈے پر کامیاب ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ ابراہیم کا بادشاہ ہونا برید کے لیے زیادہ مفید ہوتا، اور گولکنڈے میں برید کے بہت اثرات پیدا ہو جاتے۔ چنانچہ تمام منصوبوں کی پیش رفت میں برید اپنی فوجوں کے ساتھ ۹۵۷ھ میں گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے آگیا۔[1]

اس وقت ابراہیم کو دوسرے ہمسایہ سلاطین کی بہ نسبت کچھ بریدہی سے توقع تھی۔ جمید خاں اور سیدجی وغیرہ نے جو رائے دی تھی، وہ بے محل نہ تھی، اور کامیابی کی توقع غالباً اسی وجہ سے تھی کہ جمشید اپنے شنیع افعال سے بہت بدنام تھا چنانچہ جب بریدی افواج گولکنڈے کی طرف بڑھیں تو قلعے کی دیواروں تک کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور ابراہیم و برید نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ محاصرے کے دوران میں فریقین میں برابر کے معرکے ہوئے اور فریقین کا

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۸۔

کافی نقصان ہوا لیکن اس کے باوجود جمشید کی کامیابی بڑے خطرے میں تھی کیونکہ جو فوجیں اس کے تحت کام کرتی تھیں وہ اس سے خوش نہ تھیں مگر خوش قسمتی سے برہان نظام شاہ والیِ احمد نگر نے اس موقع پر گولکنڈے کی امداد بہت ضروری سمجھی۔ شاہ طاہر نے برہان کو یہ مشورہ دیا کہ اگر علی برید گولکنڈے پر قابض ہو جائے تو ممکن ہے کہ تمام دکن پر اس کا سکہ چلے۔ احمد نگر کی ایک بڑی فوج گولکنڈے کی طرف بڑھ آئی، اس کا محرک کچھ شیعہ مذہب کی حمایت اور کچھ برید کی مخالفت تھی؛ اور برید کی توجہ کو منعطف کرنے کے لیے اس فوج نے یہ کام کیا کہ قلعۂ کوہیر کا محاصرہ کر لیا۔ احمد نگر کی یہ نقل و حرکت برید کے لیے پریشان کن تھی، خود بیدر معرض خطر میں تھا، اس لیے برید نے مجبوراً گولکنڈے کا محاصرہ اٹھا لیا، اور کوہیر کو بچانے کے لیے بھاگا۔ اس طرح سے گولکنڈہ بال بال بچ گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ برید نے بھاگتے ہوئے ابراہیم کے گھوڑے، ہاتھی اور دیگر سامان حرب سمیٹ لیا، اور مغرب کی راہ لی[1]۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کو ابراہیم سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ اپنے مطلب کے لیے گولکنڈہ آیا تھا۔

جب ابراہیم کی کوششیں گولکنڈے کی ہمسایہ اسلامی طاقتوں کے اتحاد سے بارور نہ ہو سکیں بلکہ برید کے طرز عمل سے اس کا پانسہ اُلٹا پڑا تو اس کے سامنے بالآخر دیجیانگر کے سوا کوئی اور پناہ گاہ نہ تھی۔ بیدر سے اب کوئی توقع نہ تھی۔ احمد نگر کا یہ حال تھا کہ شاہ طاہر کے اثر سے یہ جمشید کی مدد پر تیار تھا، اور بیجاپور بہت دُور تھا۔ اس سے پہلے ایک دوسرے بھائی عبدالکریم نے یہاں لاحاصل کوشش کر لی تھی۔ ان حالات میں ابراہیم کی دُور بیں نظر دریائے تنگبھدرا کے نیچے پڑی۔ اگرچہ سلطنت بہمنی اور سلطنت دیجیانگر دونوں ایک ہی زمانے میں قایم ہوئی تھیں، لیکن آخرالذکر سلطنت میں کچھ ایسی استقامت تھی کہ گو سلطنت بہمنی کا بہت جلد شیرازہ بکھر گیا لیکن یہ جنوبی سلطنت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قایم تھی۔ اس زمانے میں اس سلطنت کا مشہور حکمران رام راج جس کو دکن کے مورخ رامے اعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں، اپنے زمانے کا بڑا اقبال مند راجہ تھا۔ اگر قطب شاہی مورخوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ رام راج کسی زمانے میں سلطنت گولکنڈے کا

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۹۔

جاگیردار، اور سلطان قلی کا ملازم تھا[1] تو ابراہیم کے لیے اس سے بہتر پناہ گاہ نہ تھی۔ رام راج ابراہیم سے ضرور واقف ہوگا، اور اسی وجہ سے اس کے ہمدردوں نے اس کو وجیا نگر کی طرف بھاگنے کی صلاح دی ہوگی۔

ابراہیم کا وجیا نگر بھاگنا اچھا منصوبہ ضرور تھا لیکن پائے تخت تک اس کی رسائی آسان نہ تھی۔ دشمن چاروں طرف گھات میں لگے ہوئے تھے جمشید کی فوجیں تعاقب کر رہی تھیں۔ جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اگر شہزادہ ابراہیم ہاتھ سے نکل جائے تو یہ ہمیشہ کے لیے سنگ راہ ہوگا، اور اس کو کبھی باامن زندگی نصیب نہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ ابراہیم فوجی تعاقب سے تو بچ گیا لیکن جنوبی فاصلے طے کر کے دریائے تنگبھدرا عبور کرنے لگا تو اس کو دوسرے دشمنوں سے سابقہ پڑا۔ جمشید نے ابراہیم کا راستہ روکنے کے لیے اُن رہزنوں سے کام لیا جو جنگل اور دریاؤں کی وادیوں کو اپنا مامن بنائے ہوئے تھے۔ دریائے تنگبھدرا کی وادی میں ان دنوں نارائن ماما پنڈت نامی رہزنوں کا ایک سردار رہتا تھا، اور یہ دونوں سلطنتوں کی درمیانی حدود میں خود مختار حیثیت رکھتا تھا۔ اس موقعے پر یہ جمشید قطب شاہ کا معاون ثابت ہوا۔ اس نے ابراہیم کے تمام راستے بند کر دیے اور جمشید کو ان مفرورین کی اطلاع کر دی۔ جمشید کے لیے یہ اچھا موقعہ تھا، اس نے حبیب خاں کے بھائی تغرش خاں کے ہمراہ پانچ ہزار ہون اور شاہی خلعت وغیرہ ماما پنڈت کے پاس بھیج دیے، نیز ایک ہاتھی اور دو سو سوار روانہ کیے[2]۔ اس شاہی حوصلہ افزائی سے ماما پنڈت کی طاقت بہت بڑھ گئی اور گولکنڈے کے پناہ گزینوں کے لیے صورت حال بہت نازک ہوگئی تھی۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ حمید خاں اور سید محمد نے اس مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پاکر رام راج کو اپنے آنے کی خبر کر دی۔ اس اطلاع پر رام راج فوراً امداد کے لیے کھڑا ہوگیا، اور پنڈت کو لکھا کہ شہزادہ ابراہیم کو چھوڑ دیا جائے، ورنہ سرتن سے جدا کر دیا جائیگا۔ اس فرمان سے پنڈت نے ابراہیم کو چھوڑ دیا[3]۔ یہ پناہ گزیں دریا عبور کر کے وجیا نگر پہنچ گئے۔ رام راج نے ان کی غیر معمولی آؤ بھگت کی،

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۰۔ تاریخ قطبیہ ص ۵۶۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱۔ [3] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱۔

اور اگر تاریخ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو پہلے رام راج نے شہزادہ ابراہیم کے استقبال کے لیے اکابر سلطنت کو جن میں اس کے عزیز و اقارب شامل تھے آگے بھیجا، اور یہ لوگ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کو نہایت احترام کے ساتھ شہر لائے اور جب ابراہیم شہر میں پہنچا تو رام راج نے اس کی غیر معمولی عزت کی اور اپنے برابر میں تخت پر بٹھایا، اور اتنی مدارات کی جو ولی نعمت زادے کے ساتھ کرنی چاہیے تھی۔[1]

ابراہیم کو اپنے بھائی جمشید کے انتقال تک وجیانگر میں سات سال رہنا پڑا تھا۔ یہ سات سال کی جلا وطنی ابراہیم کی زندگی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے ذریعے سے رام راج برید کی طرح گولکنڈے کی مخالفت کا ضروری سامان جمع کرنا چاہتا ہو، اور اسی وجہ سے اس نے ابراہیم کے ساتھ غیر معمولی مدارات کی ہو لیکن اس میں خود ابراہیم کی قابلیت اور سلیقے کو بہت کچھ دخل ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں، وجیانگر کی جلا وطنی ابراہیم کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی یہاں اس کی نہ صرف جان بچگئی بلکہ حصول سلطنت کی بہت سی راہیں پیدا ہوگئیں۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو دکن کی ایک بڑی سلطنت کا ناخدا ہونے والا تھا، وجیانگر کی سی بڑی سلطنت اور اس کا سیاسی ماحول بہت کچھ مطالعے کے قابل تھا۔ وجیانگر کے رکھ رکھاؤ اور اس کا تمدن جو عبدالرزاق ایرانی کے سیاحت نامے سے واضح ہوتا ہے اپنے میں بڑی کشش رکھتا تھا۔ اور فرشتے کے قول کے مطابق خود بہمنی سلاطین بھی اپنے زمانے میں اس سلطنت کو دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ چنانچہ مجاہد شاہ بہمنی اپنے حملے کے دوران میں وجیانگر کو بچشم خود دیکھنے کے لیے گیا تھا۔[2] کچھ عجب نہیں کہ ابراہیم قطب شاہ نے یہاں سیاست اور تمدن کے بے شمار سبق سیکھے ہوں جو اس کے درخشاں عہد حکومت سے ظاہر ہوتے ہیں گولکنڈے کی سیاست جس مسالے سے تیار کی گئی تھی اس میں اسلامی عناصر کے ساتھ تلنگانے اور کرناٹک کے بہت کچھ عناصر شامل تھے۔ اور اسی وجہ سے یہ سلطنت تلنگانے کی جغرافی اور قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ ایسی پیوست ہوگئی تھی کہ اہل تلنگانہ اس کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱۔ [2] فرشتہ مقالۂ سوم ص ۲۹۷۔

شہزادہ ابراہیم کو بیجا نگر میں بہت سے واقعات پیش آئے، منجملہ ان کے عین الملک کنعانی کا واقعہ ہے یہ شخص بیجاپور کے بڑے امرا میں سے تھا، لیکن بعض اسباب کی بنا پر جو اس کی روگردانی کا باعث ہوئے، ویجیا نگر کا ملازم ہوگیا۔ چونکہ یہ ایک دلیر سپاہی تھا، اور اس کے ساتھ چار ہزار سوارہ فوج بھی تھی اس لیے رام راج اس کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس کو اپنا بھائی کہتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز عین الملک، رائے اعظم سے ملکر دربار سے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں شہزادہ ابراہیم کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگئی، حمید خاں اور سیدحی شہزادے کے ساتھ تھے، راستہ بہت تنگ تھا دونوں طاقتیں وقت واحد میں ایک ہی راستے سے گزرنا چاہتی تھیں، قرون وسطی کا جذبۂ شجاعت اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ ایک فریق دوسرے کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دے، اور چپ چاپ راستہ دیدے۔ عین الملک کے ساتھ اس کا پورا دستۂ فوج تھا، حمید خاں اور سیدحی نے کہا کہ دکن کے رواج کے مطابق دشمن کا مقابلہ کرکے راستہ پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ کمزوری سمجھی جائیگی! چنانچہ تاریخ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم کے مٹھی بھر آدمیوں نے لڑ لڑا کر راستہ نکال لیا اور رام راج کے پاس پہنچ گئے۔ رام راج نے ان کی دلاوری کی بڑی داد دی! لیکن عین الملک انتقام کے لیے اُسی جگہ کھڑا رہا تاکہ جب ابراہیم دربار سے لوٹے تو اس کا مقابلہ کیا جائے۔ جب رام راج کو معلوم ہوا تو اُس نے عین الملک کے نام احکام بھیجے کہ وہاں سے چلا جائے، اور جب وہ اس کے بعد بھی نہیں گیا تو تہدیدی احکام بھیجے گئے اور دھمکی دیگئی کہ ویجیا نگر سے نکال دیا جائیگا۔ اس دھمکی کے بعد وہ وہاں سے ٹلا۔[1][2]

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱۔

[2] فرشتہ: عین الملک کا نام "عنبر خاں" بتاتا ہے، ممکن ہے عین الملک کا نام "عنبر خاں" ہو۔ لیکن اس کا مزید بیان یہ ہے کہ اسباب مخالفت صرف راستے تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ رام راج نے عنبر خاں کی جاگیر کے اکثر حصے ابراہیم کی ضروریات کے لیے دے رکھے تھے۔ اس وجہ سے عنبر خاں ابراہیم کا مخالف ہوگیا تھا، جب راستے میں مڈبھیڑ ہوگئی تو سخت کلامی کے ساتھ لڑائی ٹھن گئی اور اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کو اپنے خنجر کے وار سے قتل کر دیا اور

ادھر ۹۵۷ھ؁ میں جمشید کا انتقال ہوتے ہی گولکنڈے میں ایک سیاسی افراتفری مچ گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ کمزور طنابیں جو جمشید کے عہد میں اجزائے مملکت کو کسی قدر مربوط کیے ہوئے تھیں،[1] اس کے مرتے ہی منتشر ہو گئیں اور گولکنڈے کی سلطنت چند روز کی مہمان معلوم ہونے لگی، گو ان حالات میں شاہی محل نے بڑا حصہ لیا۔ مرحوم بادشاہ کی بیوی بلقیس زماں اور غدیجہ دوراں نے بعض عمائد سلطنت سے مشورہ کر کے جمشید کے بیٹے کو تخت نشیں کرنے کی کوشش کی جن لوگوں نے بلقیس زماں کے ساتھ اتفاق کیا تھا وہ فرشتہ کے الفاظ میں مصطفٰے خاں اردستانی، صلابت خاں ترک اور دیگر عمائد تھے۔ جمشید کا بیٹا سبحان قلی جو اس وقت سلطنت کے لیے نامزد کیا گیا، اس قدر چھوٹا تھا کہ گولکنڈے کے اکثر مدبر اس کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لڑکے کی عمر سات سال تھی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ صرف دو سال کا شیر خوار بچہ تھا،[2] گو یہ عمر صحیح نہیں ہے، لیکن سات سال کی عمر میں بھی وہ حکومت کے قابل نہ تھا، اس لیے جب سبحان قلی تخت نشیں کیا گیا تو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بلقیس زماں نے سیف خاں عین الملک کو احمد نگر سے بلا کر وکالت اور پیشوائی کی خدمت جلیلہ تفویض کرنے کی کوشش کی۔ غالباً سیف خاں گولکنڈے کا پرانا متوسل تھا، ممکن ہے کہ شاہی خاندان سے اس کا تعلق ہو، اور جمشید قطب شاہ کے طرز عمل سے بیزار ہو کر احمد نگر کی ملازمت اختیار کر لی ہو۔ اس وقت یہ کوشش

اس کے بھائی جو انتقام کے لیے آئے تو ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ نیز فرشتہ نے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کا علم جس کو دکن میں "بیرق" کہتے ہیں، حاصل کر لیا، اور اس کو اپنا نشان فتح سمجھ کر گولکنڈہ لے گیا، اور اسی کو اپنی سلطنت کا پرچم بنایا (تاریخ فرشتہ روضۂ چہارم ص ۱۷۰) لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابراہیم کی اولوالعزم زندگی اس چھوٹی سی جھڑپ اور کامیابی کو کہاں تک اپنا سرمایۂ حیات سمجھتی تھی! گولکنڈے کی تاریخوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

[1] تاریخ فرشتہ ص ۱۶۹۔ [2] تاریخ فرشتہ مقالۂ سوم ص ۱۷۰۔

کیگئی کہ سبحان قلی کے سن رشد کو پہنچنے تک عین الملک کی مدد سے حالات بدستور قایم رکھے جائیں اور امور سلطنت خوش اسلوبی سے انجام پائیں۔[1]

ان حالات میں اگر سبحان قلی اچھی عمر کا ہوتا تو غالباً جمشیدی دور حسب حال رہتا لیکن اس کی کمسنی کی وجہ سے ارباب سیاست کا ایک بڑا طبقہ اس حکومت کا مخالف ہوگیا۔ جگدیو راؤ، جگپت راؤ، بھری خاں جملۃ الملک اس زمانے کے بڑے عمائد تھے اور ان میں جگدیو راؤ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ سبحان قلی کا دشمن نہیں تھا، بلکہ اس کی کمسنی سے ڈر کر دوسرے ورثا کو تخت دینا چاہتا تھا چنانچہ اسی زمانے میں جبکہ سبحان قلی کی رسم تخت نشینی ادا ہو رہی تھی اور سیف خاں عین الملک ابھی احمد نگر سے نہیں آیا تھا یہ عمائد سلطنت اپنے منصوبے کی پختہ و پز کرنے لگے، اور کوشش کی کہ سیف خاں کے آنے سے پہلے اپنے منصوبے کی تکمیل کرلیں۔ جگدیو راؤ نے اپنے ساتھیوں کو دولت قلی کے لیے آمادہ کرلیا۔ یہ منصوبہ اس طرح اچھا تھا کہ دولت قلی کی عمر اس وقت کافی تھی، اور سبحان قلی کے مقابلے میں یہ زیادہ لائق تھا، اور اس کا ٹھکانا سلطنت سے قریب تھا یعنی بھونگیر کے قلعے میں قید تھا۔ لیکن ابراہیم کے مقابلے میں اسے کوئی اہمیت نہ تھی، ابراہیم زیادہ لائق تھا، بچپن سے اس کو ذمہ دارانہ کام تفویض کیے گیے تھے، اور دولت قلی اپنی بداعمالی کی بنا پر سلطان قلی قطب شاہ کے عہد سے قید تھا، اور جمشید کے عہد میں تو اس کی قید اور بھی سخت کردی گئی تھی، اور ملک میں اس کے کوئی ہمدرد بھی نہ تھے۔ اس بنا پر جگدیو راؤ اور اس کے شرکا کار بجائے دولت قلی کے شہزادہ ابراہیم کو اپنا مرکز خیالی بناتے تو بہتر ہوتا، اور کئی خانہ جنگیوں کا سدباب ہوجاتا جو ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت ہونے والی تھیں۔ کیونکہ سبحان قلی اور اس کے ہمدرد سیف خاں عین الملک کی طاقت کے مقابلے میں دولت قلی کو بھونگیر کے قلعے سے باہر نکال کر تخت نشین کرنا آسان نہ تھا، اس کوشش میں خانہ جنگی کا سامان ہوگیا، اور سیف خاں کے آنے سے پہلے

جگدیو راؤ، اپنی طاقت کے ساتھ بھونگیر پہنچ گیا اس نے قلعے کی فوج اور تانگو اڑیوں کو اپنے ساتھ ہموار کر لیا، اور قلعہ دار کو اپنا ہم خیال بنا کر دولت قلی کو قید سے باہر نکالا، اور بھونگیر میں اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پیر مضبوط کرنے کے لیے بھونگیر کے آس پاس کئی قلعے فتح کر لیے اور اپنا قدم جما لیا[1] اب جگدیو راؤ کو عین الملک کا سخت مقابلہ کرنا تھا، لیکن اس دوران میں سیف خاں عین الملک گولکنڈہ پہنچ گیا کچھ تو سبحان قلی، اور اس کی ماں بلقیس زماں کی تائید، اور کچھ اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لیے عین الملک کا فرض تھا کہ جگدیو راؤ، اور اس کے امیدوار دولت قلی کو مغلوب کرے، چنانچہ اس کام کے لیے گولکنڈے کی بڑی فوج ترتیب دی گئی، اور سیف خاں کی سرکردگی میں اس کی نقل و حرکت شروع ہوئی۔ اگرچہ جگدیو راؤ اس وقت کئی قلعوں پر قابض تھا لیکن گولکنڈے کی شاہی فوج کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہ تھی اس نقل و حرکت سے گھبرا کر جگدیو راؤ نے قریب کی عماد شاہی سلطنت سے مدد مانگی۔ ظاہر ہے کہ دکن کی باہمی رقابت ہمیشہ ایسی امداد کے لیے تیار رہتی تھی، چنانچہ عماد شاہی سلطنت کا مشہور سپہ سالار تفال خاں، جگدیو راؤ کی امداد کے لیے آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیف خاں نے اس فوج کا راستہ روکنے کی کوشش کی تاکہ وہ بھونگیر نہ پہنچ سکے، اور جگدیو راؤ کی طاقت نہ بڑھے۔ سیف خاں کی یہ تدبیر کامیاب ہو گئی، عماد شاہی فوج شمال سے بھونگیر کی طرف پیشقدمی کر رہی تھی کہ سیف خاں نے گولکنڈے سے بڑھ کر موضع شنکرم[2] پر اس کا راستہ روکا، اور اس موقع پر جو گھمسان کا معرکہ ہوا ہے وہ تاریخ کے الفاظ میں :-

"در ہیچ زماں سلاطین و بادشاہ عظیم الشان بہ آں مشابہ کارزار نشان نداده اند"[3]

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی سخت لڑائی تھی اور اس میں بے شمار سپاہی کام آئے تھے۔ عین الملک کامیاب ہو گیا

---

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۱۔

[2] یہ موضع شنکرم کریم نگر سے جانب جنوب سات میل کے فاصلے پر واقع ہے، اس کے اردگرد پہاڑیاں ہیں۔

[3] ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۱۔

اور یہ پیشقدمی اس قدر معقول تھی کہ اس کے بعد قلعہ بھونگیر میں جگدیو راؤ کی منفرد طاقت کا مقابلہ کرنا اس کے لیے بہت آسان تھا۔ تفال خاں کی منہزم فوج نے بھونگیر کی طرف راہ فرار اختیار کی تو عین الملک نے اس کا تعاقب کیا۔ بھونگیر کے قلعے کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور قلعے کا محاصرہ شروع کر دیا۔ تفال خاں کی منہزم فوج قلعے کے اندر محصور ہو گئی تھی چونکہ بھونگیر کا قلعہ ایک پہاڑ پر واقع ہے اور محصورین کو قلعے پر سے وار کرنیکا اچھا موقعہ ملتا ہے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ جگدیو راؤ کے حملوں سے عین الملک کی فوجوں کو بہت نقصان پہنچنے لگا، اور اس قدر نقصان پہنچا کہ عین الملک نے صلح کرنیکی کوشش کی لیکن جگدیو راؤ نے صلح سے انکار کر دیا، حالانکہ جگدیو راؤ کے لیے یہ اچھا موقعہ تھا۔ اس انکار سے عین الملک نے محاصرہ اور سخت کر دیا جو گولکنڈے کی آیندہ تاریخ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اگر صلح ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کے دو حصے ہو جاتے۔ محاصرے کے بعد محصورین کی رسد گھٹنے لگی اور یہ اپنی رسد سے اس قدر تنگ ہوئے کہ بالآخر جگدیو راؤ، اور دولت قلی نے قلعے کے دروازے کھول دیے اور عین الملک سے امان طلب کی لیکن دولت قلی کی قسمت میں عمر بھر قید لکھی تھی، وہ پھر قید کر دیا گیا، اور جگدیو راؤ کو پابہ زنجیر کر کے گولکنڈے کے قلعے میں مقید کر دیا گیا۔



سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ

پانچواں باب

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی

عین الملک کی کامیابی سے جس کا گذشتہ باب میں ذکر ہوا ہے ایک خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا لیکن آیندہ حالات نے سیاسی فضا کو اور پیچیدہ بنا دیا۔ یہ پیچیدگی ابراہیم کے لیے فائدے سے خالی نہ تھی۔ جب عین الملک بھونگیر کے معرکے سے واپس ہوا تو اپنی اس کامیابی اور اپنے غیر معمولی اقتدار کے باعث بہت مغرور ہو گیا، اور گولکنڈے کے عمائد اور خاندانی اُمرا کے ساتھ جابرانہ برتاؤ کرنے لگا۔ اس سے تمام اُمرا و عمائد سلطنت مکدر ہونے لگے اور سب کی نظر ابراہیم قطب شاہ پر پڑنے لگی[1]۔ عین الملک کے جابرانہ سلوک سے متنفر ہو کر اہل گولکنڈہ نے محل پر حملہ کر کے دولت خانہ لوٹ لیا[2]۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات ایک نئے انقلاب کے متقاضی تھے جن توقعات سے مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں، سبحان قلی کی بادشاہی کے لیے تیار ہوئے وہ اب پادر ہوا ہو کر رہ گئے چنانچہ ان سنجیدہ شخصیتوں کے سامنے، جو ملک کے حقیقی بہی خواہ تھے سوائے شاہزادہ ابراہیم کے اور کوئی مرجع امید باقی نہیں تھا۔ حکومت کے ممکنہ تجربے ہو چکے تھے۔ سلطنت کے تمام امیدواروں کو آزما لیا گیا جو لائق شخصیتیں

---

[1] فرشتہ ان تمام واقعات کو حذف کر کے اہل گولکنڈہ کی شورش پر زور دیتا ہے جو سبحان قلی کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی (تاریخ فرشتہ روضہ چہارم ص ۱۷۰)۔

[2] تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ عین الملک نے طفل سلطنت کو بالائے طاق کر کے اختیارات خود حاصل کر لیے تھے (تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۷۰)۔

امورِ سلطنت کی اہل سمجھی گئی تھیں وہ غدار ثابت ہوئیں اس لیے ان تمام تجربوں کے بعد یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت سلطنت گولکنڈہ کے لیے شہزادہ ابراہیم ہی تنہا ناخدائے سیاست ہو سکتا ہے چنانچہ مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں نے فوراً ابراہیم کو گولکنڈہ آنیکی دعوت دی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر اس وقت ابراہیم نہ آئے تو گولکنڈہ خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر منتشر ہو جائیگا۔ مصطفیٰ خاں کی اس جنبش پر دیگر عمائد بھی چپکے چپکے اتفاق کرنے لگے اور ابراہیم کو اپنے ارادے سے واقف کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں میں ابراہیم کی خدمت میں کئی عرائض پہنچ گئیں کہ گولکنڈہ سبحان قلی کی بادشاہی سے راضی نہیں ہے[1] اور سیف خاں عین الملک نے اُمرا کو تنگ کر رکھا ہے۔ عین الملک اور جگدیو راؤ کی باہمی کشمکش سے مُلک کو علحدہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس لئے ملک کی نجات آپ کے ہاتھ میں ہے[1]۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو جنبش مرکزی حکومت میں ہو رہی تھی وہ بہت جلد مُلک کے دوسرے گوشوں میں بھی محسوس ہونے لگی۔ ابھی ابراہیم بیجانگر سے نکلا نہیں تھا کہ کوئل کنڈے کے باشندوں نے اس موقعے پر ابراہیم کی مدد کرنا اپنا فرض عین سمجھا[2]۔ کوئل کنڈے کی ان پڑھ آبادی میں سلطنت کی بہبودی کا یہ احساس اور مردم شناسی حیرت سے خالی نہیں ہے کہ ان لوگوں نے سلطنت گولکنڈے کے مستقبل کا لحاظ کر کے دوسرے دعویداران سلطنت کو نظر انداز کر دیا اور شہزادہ ابراہیم کو

---

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳۔

[2] ۔ کوئل کنڈے کے قلعے میں حال میں جو کتبہ دریافت ہوا ہے اُس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کوئل کنڈہ نے اپنے طور پر ابراہیم کو مدد دینے کی تیاری کی تھی۔ کتبے میں دو نام آتے ہیں ایک پیرو میاں دوسرے سید علی میاں جو اس پاکیزہ منصوبے کے علمبردار تھے۔ ان لوگوں نے کوئل کنڈے کے تمام سپاہی اور عہدہ داروں سے ابراہیم کی تائید کا سخت وعدہ لیا اور قسم لی کہ وہ ابراہیم کے معاملے میں سبحان قلی اور دولت قلی کی تائید نہ کرینگے۔ جب اس طرح تیاری ہو گئی تو انھوں نے ابراہیم کو اپنے پاس بلایا تھا (رپورٹ آثار قدیمہ ۱۳۲۸ف)۔ کوئل کنڈہ محبوب نگر سے چودہ[۱۴] میل کے فاصلے پر جانب جنوب مغرب واقع ہے۔

ترجیح دی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کو مرکزی حکومت کی سازش سے ضرور فائدہ پہنچا لیکن کوئل کنڈے کی امداد کو بھی جو بر وقت حاصل ہوئی تھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابراہیم کی تمام تر پیشقدمی جو پانگل سے شروع ہوئی تھی، اہل کوئل کنڈہ کی امداد پر منحصر تھی۔ ابراہیم نے اسی جگہ اپنی طاقت بڑھائی اور اس کو اتنا اطمینان ہو گیا کہ اس نے بلا کھٹکے مرکزی حکومت کا رُخ کیا، اور تخت پر قبضہ کر لیا۔

جب گولکنڈے سے مختلف عرایض ابراہیم کے پاس پہنچیں تو اس نے اپنے ہمدردوں سیدجی خان اعظم، اور حمید خاں کے مشورے سے گولکنڈے کی طرف کوچ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ قدرت نے ابراہیم کے لیے خاص حالات پیدا کر دیے جو اس کے حصول سلطنت کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے، ورنہ جمشید قطب شاہ کی اس قدر جلد موت واقع نہ ہوتی اور ابراہیم قطب شاہ کو گولکنڈے کی سلطنت حاصل کرنیکا موقع نہ ملتا۔ ظاہر ہے کہ جب ابراہیم، بیجانگر کی طرف بھاگا تھا تو اس کے ذہن میں حصول سلطنت کی کوئی امید نہ ہوگی اور نہ ان حالات کا وہم و گمان ہوگا۔ ان تمام سازشوں کے باوجود جو اس کی تائید میں پختہ ہوگئی تھیں کئی مشکلات باقی تھیں اور گولکنڈہ پہنچ کر تخت سلطنت پر قدم رکھنے تک مختلف زحمتوں کا سامنا کرنا تھا، اور یہ مشکلات اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ضرور ڈراتی ہونگی۔ رام راج کی مخالفت تو تاریخ سے معلوم ہوتی ہے جو درحقیقت ہمدردی پر مبنی تھی کہ آیندہ خطرات کی پیش بندی کر کے جو حصول سلطنت کے راستے میں حائل تھے، رام راج ابراہیم کی پیشقدمی نامناسب سمجھتا تھا لیکن ابراہیم کی اولوالعزمی ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی اور اس کے ساتھی حمید خاں اور سیدجی جنھوں نے اپنی تمام عمر ابراہیم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی، ہر خطرے کے لیے آمادہ تھے۔ انھوں نے نہایت جرأت کے ساتھ شہزادے کو نقل و حرکت کے لیے کھڑا کر دیا۔ اس طریقے سے یہ جلا وطن گولکنڈے کے سفر کے لیے آمادہ ہو گئے تو رام راج نے اپنے دیرینہ روابط اور رونا شعاری کے لحاظ سے شہزادہ ابراہیم کی مدد کی اور اپنے بھائی نکنا راے کی سرکردگی میں اس نے دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل کی ایک بڑی فوج پیش کی اور شہزادے کے ساتھ جانیکا حکم دیا۔ لیکن حمید خاں اور سیدجی کی حمیت نے اس امداد کو گوارا

نہیں کیا۔ یہ لوگ رام راج کی امداد کے بغیر آمادۂ سفر ہو گئے۔[1]

ابراہیم قطب شاہ اور اس کے ساتھی ویجیانگر سے کوچ کر کے سب سے پہلے پانگل پہنچے جو اس زمانے میں سلطنت ویجیانگر کے حدود میں داخل تھا۔ تلنگانے کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے یہ ایسا مقام تھا جہاں سے گولکنڈے کے سیاسی ماحول کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا تھا۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ یہاں ہر حرکت کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں نے یہاں چند روز قیام کر کے دور سے تمام سیاسی فضا کا مطالعہ کیا، اور یہ دریافت کیا کہ ملک میں ان کا کہاں تک خیر مقدم ہو سکتا ہے اور پانگل سے اس نے تمام تلنگانے میں اپنے آنے کی خبر پہنچا دی۔

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید — نوید فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید

جمال بخت ز روئے ظفر نقاب انداخت — کمال عدل بہ فریاد داد خواہ رسید

جب لاسلکی پیاموں کی طرح اس کی آمد آمد کی خبریں دور دور پہنچنے لگیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام تلنگانے کے طول و عرض میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور لوگ جوق جوق بادشاہ کی دید کے لیے آنے لگے کہ گویا اس کے خیر مقدم کے لیے تیار بیٹھے تھے۔[2] تھوڑے ہی عرصے میں ابراہیم کے اردگرد تین ہزار سوار اور پانچ ہزار پیدل جمع ہو گئے اور اس پر طرہ یہ کہ اسی جگہ اس کو کوئل گنڈہ کی غیبی امداد کی خوشخبری پہنچائی گئی[3] یہاں گولکنڈے سے مصطفیٰ خاں اور

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳ — ۱۳۴۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۵۔

[3] فرشتے کا بیان یہ ہے کہ جب ابراہیم کی جماعت تلنگانے کی سرحد پر پہنچی ہے تو سب سے پہلے مصطفیٰ خاں اس سے آکر ملا، اور ابراہیم نے اس کی قابلیت اور اعلیٰ خدمات کا اعتراف کر کے اس کو میر جملہ کی خلعت عطا کی، اور مصطفیٰ خاں کا کچھ ایسا اثر تھا کہ لوگ ابراہیم کی بادشاہی کے لیے راضی ہو گئے۔ اور اس نے ہندو تاجروں سے دو لاکھ ہون قرض لیکر ضروری مصارف کا انتظام کیا تھا (تاریخ فرشتہ ص ۱۷۰)۔ ممکن ہے کہ مصطفیٰ خاں کی ملاقات پانگل میں

اس کے بعد صلابت خاں بھی تین ہزار فوج کے ساتھ ابراہیم کی امداد کے لیے آ گئے اور ان کے پیچھے کئی اُمرا پہنچ گئے اور اس طرح ابراہیم کے پاس سات ہزار فوج جمع ہو گئی۔

پانگل کے بعد ابراہیم قطب شاہ کا دوسرا مقام کوئل کنڈہ تھا جہاں یہ قطب شاہی کارواں صدہا اُمید و بیم کے ساتھ نازل ہوا اگرچہ اس وقت کوئل کنڈے کی حیثیت ایک معمولی موضع سے زیادہ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو ابراہیم قطب شاہ کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی زمانے میں کوئل کنڈے کا قلعہ فوجی مستقر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں سے سلطنت کے جنوبی حصوں پر گرفت رکھی جاتی تھی تاکہ سلطنت وجیانگر کی ہر پیشقدمی کا بروقت سدباب ہو سکے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت یہ کوئل کنڈہ اپنے تمام اعضائے سیاسی کے ساتھ ابراہیم کی مدد کے لیے تیار ہو گیا، اور سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم کی تمام کامیابی کچھ اسی تائید کی وجہ سے تھی، ورنہ اس کی پیشقدمی کوئل کنڈے تک کچھ آسان نہ تھی اِس قلعے کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی آمد سے یہاں پر ایک سنسنی پھیل گئی، اور اس کی امداد کے لیے ایک زبردست اتحاد ہو گیا، تمام سپاہی اور نائکواڑی جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اس سیاسی خدمت کے لیے تیار ہو گئے اور یہ اپنا فرض سمجھنے لگے کہ ابراہیم کو گولکنڈے کے تخت پر بٹھا دیں۔ یہ ایسا خوشگوار ماحول تھا کہ اس قطب شاہی جماعت کو یہاں آنیکے بعد یہ محسوس ہوا کہ ان کی منزلِ مقصود یہی ہے۔

ہوئی ہو، اور اسی جگہ اس کو خلعت عطا ہوئی ہو۔ لیکن یہ کہنا کہ اہل تلنگانہ محض مصطفےٰ خاں کے اثر سے ابراہیم کی بادشاہی کے لیے تیار ہوئے تھے صحیح نہیں ہے، گو مصطفےٰ خاں کی سیاسی اور مالی امداد سے جو بر وقت ہوئی تھی، اور ممکن ہے کہ کوئل کنڈے کے اہم اتفاق میں بھی اس کا ہاتھ ہو، لیکن اس بات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس تمام سیاسی ہل چل میں خود ابراہیم کی زبردست شخصیت بھی کام کر رہی تھی اور دوسرے دعویداران سلطنت کے مقابلے میں اپنا لوہا منوا رہی تھی۔

کیونکہ یہ ایسی اچھی پناہ گاہ تھی کہ اگر ابراہیم کو اپنی پیشقدمی میں گولکنڈے کی دیواروں کے پاس شکست بھی ہوجاتی تو وہ یہاں واپس آکر دم لے سکتا اور پھر قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔ اس لیے ابراہیم یہاں بہت دنوں تک ٹھیرا رہا، اور ممکنہ طاقت فراہم کی غالباً یہاں وہ دو مہینے رہا، اس دوران میں اس کو باہر سے بھی بہت کچھ مواد فراہم ہوتا رہا۔ چار ہزار جنگجو سوار جو امرا و خوانین پر مشتمل تھے اس کے اردگرد جمع ہوگئے، ان میں اکثر گولکنڈے کے اکابر تھے جو ابراہیم کے لیے دوڑے آئے تھے۔[1]

ابراہیم قطب شاہ کی روز افزوں طاقت، مرکزی حکومت کو بہت خوف دلا رہی تھی اور اس کا اثر اس قدر چھا رہا تھا کہ ہر طبقہ اپنے مستقبل کی سوچ رہا تھا جو لوگ اس وقت سبحان قلی اور عین الملک کے رسمی ہوا خواہ تھے وہ نئے تاجدار کے لیے بیتاب ہوگئے، اس لیے عین الملک کے لیے مدافعت کا سامان کرنا ضروری ہوگیا۔ دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے ہری خاں۔ جگپت راؤ۔ حاجی خاں سرنوبت اور اخلاص خاں حبشی متعین کیے گئے، اور عین الملک کے ساتھ پیشقدمی کی غرض سے خداوند خاں حبشی۔ علم خاں، سنجر خاں، مقبول خاں اور تاج خاں رکھے گئے، اس طریقے سے یہ مدافعتی فوج گھنپورہ پہنچ گئی لیکن عین الملک کے کوچ کرتے ہی یہ معلوم ہوا کہ خود گولکنڈے میں سازش ہوگئی۔ اکثر نائکواڑی ابراہیم کی امداد کے لیے تیار ہوگئے، یہاں ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ابراہیم کی خدمت میں ایک متفقہ درخواست اس مضمون کی روانہ کی کہ "اگر آپ جگدیو راؤ کو قید سے رہا کرتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کے لیے آمادہ ہیں" اور آیندہ امید میں جگدیو راؤ کو قید سے رہا کر دیا، اور جو لوگ ابراہیم کے مخالف تھے وہ اکثر قتل کر دیے گئے چنانچہ ہری خاں۔ اخلاص خاں اور حاجی کے سر نیزوں پر چڑھا کر شہر میں گھمائے گئے۔ خود سبحان قلی کو قید کر دیا گیا، اور شاہی خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا گیا۔ اس ضروری انتظام کے بعد ان لوگوں نے ابراہیم کو گولکنڈہ آنے کی دعوت دی۔ اس طریقے سے ابراہیم کے لیے گولکنڈے تک تمام

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۵۔

راستے صاف ہوگئے۔ اب عین الملک کے لیے کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی، کیونکہ ان دو زبردست طاقتوں کا مقابلہ اس کے قابو سے باہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان حالات سے مجبور ہو کر اس نے ابراہیم سے معافی مانگنے کی کوشش کی[1] لیکن ابراہیم سمجھتا تھا کہ عین الملک اس کا کبھی دوست نہیں ہوگا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں:-

"استدعائے عین الملک از صمیم قلب نہ بود"[2]

چنانچہ ابراہیم نے اس کو آنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کو لکھا کہ "میں خود آ رہا ہوں وہاں ملاقات ہو جائیگی" اس سے عین الملک بہت گھبرایا، اور بھاگنے کے سوائے اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار نہ تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم قطب شاہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔ پانچ ہزار سوار اور چند سرداروں کے ساتھ جو اس کے ہمراہ تھے کولاس کے راستے سے سلطنت گولکنڈے کی سرحد سے باہر چلا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ وہ سلطنت برار میں سکونت پذیر ہوا۔ اگرچہ عین الملک کے جانے سے نقصان ضرور تھا، اس کے اغوا سے گولکنڈے کے بعض دیرینہ آدمی اس کے ساتھ چلے گئے اور بہت سا قطب شاہی سامان اس کے ساتھ غائب ہوگیا، لیکن اس کے فرار ہونے سے ابراہیم کی رہی سہی مشکلات کا خاتمہ ہوگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے راستے میں عین الملک کی تنہا مزاحمت باقی رہ گئی تھی جو گولکنڈے کے راستے میں کسی جگہ خونریزی کا باعث ہوتی۔ لیکن اب مطلع بالکل

---

[1] تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ عین الملک نے کوئل کنڈے کا محاصرہ کر لیا تھا، لیکن جب گولکنڈے کی سازش کی اطلاع ملی تو پانچ ہزار قطب شاہی سواروں کے ساتھ کولاس کے راستے سے ملک کے باہر بھاگ گیا (تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۳۹)۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو، لیکن تاریخ قطب شاہی کا بیان یہ ہے کہ اس نے گھنپورے سے ابراہیم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ "بندہ کو آستاں بوسی کی اجازت دیجائے" (تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۷)۔

[2] تاریخ قطبیہ ص ۶۷۔

صاف تھا جگدیو راؤ کی ایک آدھ بغاوت جو ابراہیم کے تخت نشین ہونے کے بعد ہوئی، وہ آسانی سے فرو ہوگئی۔
جب امین خاں دبیر نے کوئل کنڈہ آکر عین الملک کے بھاگنے کا ذکر کیا، اور گولکنڈے کے تمام حالات بیان کیے تو ابراہیم نے کوچ شروع کردیا۔[1]

قطب شاہی خاندان کے حقیقی وارث تخت کا سات سال کی جلا وطنی کے بعد گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے آنا۔ تلنگانے کا ایک مسرت خیز واقعہ تھا جس کا اندازہ آج چارسو سال کے بعد نہیں کیا جاسکتا! اس نوجوان بادشاہ کی آمد سے جو اپنے تمام شاہی اوصاف کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین تھا تلنگانے کے جسدِ مُردہ میں جان آگئی۔ تمام اہلِ گولکنڈہ اس وقت سے چشم براہ تھے جبکہ پانگل میں اس کا نزدل اجلال ہوا تھا، ان چند مخالفوں کو چھوڑ کر جو یا تو قید تھے یا شہر بدر ہو چکے تھے، گولکنڈے کا بچّہ بچّہ انتہائی شادمانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسرت کی جو لہریں کئی مہینوں سے پانگل کی سرحد سے تمام تلنگانے کے طول وعرض میں منتشر ہورہی تھیں آج ایک مرکز پر جمع ہوگئی تھیں۔ شاعر قصیدہ ہائے مبارکباد لکھ رہے تھے، گوئیے مسرت کے گیت گا رہے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ جب ابراہیم قطب شاہ کا جلوس گولکنڈے کے قریب پہنچا تو عام لوگوں کے علاوہ تمام اکابر سلطنت استقبال کے لیے قلعے کے باہر موجود تھے جگدیو راؤ اور دوسرے نائکواڑیوں نے قلعے کی تمام کنجیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھدیں اور قلعے میں تشریف لانے کی درخواست کی چنانچہ ۱۲ رجب ۹۵۷ھ کو دوشنبہ کے دن رسم تخت نشینی ادا کی گئی جو گولکنڈے کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا کیونکہ آج سات سال کا تاریک دَور اور خانہ جنگیاں ختم ہوگئی تھیں۔ یہ وہ تاریخ تھی جو سلطنت گولکنڈے کو آیندہ غیر معمولی ترقیوں کا پیام دے رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کی اصل تعمیر ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئی جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جاکر مکمل ہوئی اگر ابراہیم قطب شاہ کو

---

[1] تاریخ قطبیہ ص ۷۷۔

تخت سلطنت نصیب نہ ہوتا تو نہ صرف اس سلطنت کو یہ عظمت نصیب نہ ہوتی بلکہ حالات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا بہت جلد خاتمہ ہو جاتا۔ رسم تخت نشینی کے بعد ان لوگوں کو جنھوں نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا مناصب جلیلہ سے سرفراز کیا گیا اور بارہ[۱۲] ہزار ہون غربا و مستحقین میں تقسیم کیے گئے۔

چھٹا باب

سلاطین دکن کی باہمی کشمکش

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے گولکنڈے کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کو دورِ استحکام سمجھنا چاہیے۔ تاسیس کے بعد ہر سلطنت کو انتظامی اور دفاعی بند وبست کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ مستقل بنیادوں پر کھڑی ہو اور حکومت کے فرایض خاطر خواہ انجام دے۔ اس کی بقا ہی استحکام میں ہے۔ گھر کے اندر اچھا نظم ونسق قایم کیا جائے تاکہ ملک میں امن وامان نصیب ہو، اور اہلِ ملک کو ذہنی واخلاقی تربیت کے ضروری مواقع ہاتھ آئیں۔ دوسری طرف بیرونی خطروں سے ملک کی حفاظت ہو سکے۔ ابراہیم قطب شاہ سلطنتِ گولکنڈے کا معمار ہے۔ اس میں سیاست کی خداداد قابلیت تھی نیز وجیانگر کی جلاوطنی سے اس کی نظریں ایسی وسیع ہو گئی تھیں کہ وہ اب سیاست کے تمام ہتھکنڈے جانتا تھا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک میں کہاں استحکام کی ضرورت ہے، اور ہمسایہ سلطنتوں کے مقابلے میں کیا مدافعتی مسلک اختیار کرنا چاہیے تاکہ گولکنڈے کی سلطنت محفوظ رہے، اور اس کو آگے بڑھنے کا موقع ملے۔ اس کو شروع ہی سے اس بات کا بھی تجربہ تھا کہ سلطنت کو نظم ونسق کے زیور سے کس طرح سنوارنا چاہیے۔ مصطفےٰ خاں اردستانی کو جس نے ابراہیم کے ساتھ پوری وفاداری کی تھی، بہت ترقی دی گئی۔ بادشاہ نے اپنی بہن سے مصطفےٰ خاں کی شادی کر دی جو بہت بڑی عزت تھی اور تمام امورِ سلطنت اس کے سپرد کر دیے۔ اس کو ہر جگہ خانِ اعظم رُکن السلطنت لکھا جاتا ہے، غالباً خانِ اعظم اس کا خطاب تھا، اور اس وقت تو یہ سلطنت کا میر جملہ بنایا گیا، اور بعد کو ترقی کر کے پیشوا ہو گیا۔ اس تمام عہد میں مصطفےٰ خاں کی سیاست چھائی ہوئی تھی اور ہر معاملے میں اس کے مشورے شریکِ حال تھے۔

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد دکن کا سیاسی مطلع بیحد غبار آلود ہو گیا، اور دکن کی سلطنتوں میں بین المملکتی لڑائیاں اس قدر زور و شور سے شروع ہوئیں کہ ان کی روک تھام بہت مشکل ہو گئی۔ قطب شاہی سلطنت ان سیاسی الجھنوں سے کنارہ کش نہیں رہ سکتی تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے پیشرؤوں نے سیاستِ دکن سے متعلق کوئی ایسا خارجی مسلک اختیار نہیں کیا تھا جو سیاسی دُور اندیشی کے ساتھ مستقبل کی صحیح رہنمائی کر سکتا۔ اگرچہ جمشید قطب شاہ نے احمدنگر سے رشتۂ اتحاد جوڑنے کی کوشش کی تھی اور برہان نے برید کے مقابلے میں گولکنڈے کی مدد بھی کی لیکن اس کو مستقل مسلک نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ابراہیم سے پہلے دکن کے بین المملکتی تعلقات اس قدر پیچیدہ نہیں تھے اور نہ گولکنڈے کو ان الجھنوں میں پڑنے کی کوئی ضرورت تھی لیکن ابراہیم کے عہد میں دکن کے بین المملکتی تعلقات بہت پیچیدہ ہو گئے۔ بیجاپور کے تخت پر ابراہیم عادل شاہ اول متمکن تھا، اور احمدنگر میں برہان کا بیٹا حسین نظام شاہ اول ابھی ابھی تخت نشین ہوا تھا۔ چونکہ یہ سلطنتیں پاس پاس واقع ہوئی تھیں اور یہ ایک دوسرے کی رقیب تھیں اس لیے ایک کا دوسرے پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ بعض سلطنتوں کے درمیان آئے دن سرحدی نزاعیں ہوتی تھیں جو ہر سلطنت کے لیے مہلک تھیں چنانچہ ضلع شولاپور و کلیان کے لیے احمدنگر اور بیجاپور میں بارہا لڑائیاں ہوئیں اور فریقین نے اپنی امداد کے لیے دوسری سلطنتوں کو بھی دعوت دی، اور اس میں بیجاپور کی ہمیشہ زیادتی تھی۔ وجیانگر کی ہندو سلطنت نے بیجاپور کی تائید میں احمدنگر کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ان حالات میں گولکنڈے کو اپنا ایک خارجی مسلک مشخص کرنا ضروری تھا۔ ابراہیم قطب شاہ نے وسیع نظر پائی تھی مصطفےٰ خاں کے سیاسی مشوروں سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلے تو بیجاپور کے مقابلے میں احمدنگر کی تائید کرنی چاہیے کیونکہ آخرالذکر سلطنت بیجاپور کی بہ نسبت بہت کمزور تھی اور اس کو بیجاپور سے بہت نقصان پہنچ رہا تھا، اور وجیانگر کی وجہ سے تو اس کو اس قدر نقصان پہنچا کہ برسوں تک اس کی تلافی نہ ہو سکتی تھی۔ اس طریقے سے دکن کا توازن معرض خطر میں تھا۔ اگر احمدنگر کی سلطنت بالکل مغلوب ہو جاتی تو بیجاپور کا پلہ بھاری ہو جاتا، اور یہ صورت آیندہ گولکنڈے کے لیے بھی خطرے سے خالی نہ ہوتی۔ اس طرح یہ گولکنڈے کا فرض تھا کہ بیجاپور کی مخالفت اور احمدنگر کی کمزور سلطنت کی مدد کرے۔ مصطفےٰ خاں کی دُور اندیشی کی بدولت ملک کا یہ مستقل مسلک

قرار دیا گیا، اور اس کی پابندی کی گئی۔

اس اتحاد کے لیے خود گولکنڈے کی طرف سے پیشقدمی کی گئی۔ مصطفےٰ خاں کو احمد نگر بھیجا گیا، اور باہمی اتحاد کی تجویز پیش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلک احمد نگر کے لیے بھی بہت مفید مطلب تھا، چنانچہ اس کا پرجوش خیرمقدم کیا گیا، چونکہ اتحاد کے لیے بالمشافہ گفتگو بہت اچھی ہوتی ہے اس لیے ۹۶۵ھ میں ابراہیم قطب شاہ اور حسین نظام شاہ والیِ احمد نگر گلبرگے کے باہر ملے اور اتحاد قایم کیا گیا۔ اس ملاقات میں یہ طے ہوا کہ متحدہ یلغار کرکے گلبرگہ اور بیدر عادل شاہی سلطنت سے حاصل کیے جائیں۔ دوسرے جنوب کی سلطنت وجیانگر کا خاتمہ بھی قطب شاہی مسلک کا ایک بڑا ضمیمہ تھا۔ اس سلطنت کا دائمی خطرہ نہ صرف دکن کی ہر سلطنت کے لیے سوہانِ روح تھا بلکہ دوسری خرابی یہ تھی کہ دکن کے مسلمان سلاطین اپنی آپس کی رقابت میں وجیانگر کو اپنا شریک کار بناتے تھے، چنانچہ وجیانگر کی شرکت سے بعض بعض اسلامی سلطنتوں کو غیر معمولی نقصان پہنچ گیا۔ غالباً ابراہیم قطب شاہ اور مصطفےٰ خاں کی دور اندیش سیاست نے پہلے سے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ جنوب کی ہندو سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے تو اچھا ہے۔

گلبرگے کا محاصرہ

حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے اتحاد سے احمد نگر کو بہت تقویت ہوگئی اور اس کی بدولت احمد نگر نے اپنے پرانے منصوبے رو براہ کرلینے کی فوراً کوشش شروع کردی۔ غالباً اسی غرض کے لیے دونوں نے اپنی ملاقات کا موقع محل بھی گلبرگہ تجویز کیا تھا تاکہ اگر یہ چیز طے ہو جائے تو فوراً گلبرگے کا محاصرہ شروع کر دیا جائے۔ بالمشافہ گفتگو کے بعد دونوں فوجوں نے گلبرگے کا محاصرہ شروع کر دیا۔ عادل شاہی فوجوں سے جو اس وقت گلبرگے میں تھیں جنگ شروع ہوگئی، چونکہ محاصرہ کرنے والی فوجیں زیادہ تھیں اس لیے عادل شاہی فوجوں پر سختی گذرنے لگی اور شہر کے محصورین بہت پریشان ہوئے اور گلبرگہ مسخر ہونے میں کوئی بات نہیں تھی۔ اس اڑے وقت میں ابراہیم عادل شاہ نے رام راج والیِ وجیانگر کو اپنی امداد کے لیے طلب کیا، اور وجیانگر سے ایک بڑی ہندو فوج بیجاپور کی امداد کے لیے پہنچ گئی، اور معلوم نہیں کہ اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوتا لیکن رام راج نے ابراہیم قطب شاہ کو اس جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ عادل شاہی تاریخوں میں

اس کا ذکر نہیں ہے[1]، تاہم صورتِ حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابراہیم نے اس وقت رام راج سے مخالفت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اول تو رام راج اور ابراہیم کے پرانے تعلقات تھے، دوسرے بڑی بات یہ تھی کہ گولکنڈے کے جنوبی اور مشرقی حدود دبجیانگر سے ملتے تھے، اور ڈر تھا کہ وجیانگر کی ہندو فوجیں ابراہیم قطب شاہ کی مخالفت میں جنوب اور مشرق سے گولکنڈے پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ گولکنڈے کے عمائدنے بھی بادشاہ کو یہی رائے دی کہ کنارہ کشی کرنی چاہیے۔ اور رام راج نے بھی یہی لکھا تھا[2]۔ اور یہ ڈر خلاف قیاس نہیں تھا، کیونکہ اسی اثنا میں یہ معلوم ہوا کہ رام راج کا بھائی ؑتیم راج نے چند عادل شاہی افسروں کے ساتھ گولکنڈے کے حدود میں دست درازی شروع کر دی ہے، یعنی پانگل کے قریب پہنچ کر لوٹ مار کر رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم ابھی ہمہ جہتی مدافعت کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ عادل شاہی فوج کے مقابلے کے لیے اڑ جاتا تو نہ صرف گلبرگے کے مقام پر گھمسان کا رن پڑتا، بلکہ اس کی سلطنت کے جنوبی اور مشرقی حصے اس کے ہاتھ سے نکل جاتے۔ اس لیے ابراہیم قطب شاہ نے ایسے موقع پر دوعملی سے کام لیکر دونوں پہلو بچانا ضروری سمجھا۔ لیکن اس نے احمد نگر کے اتحاد کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور اخلاقی ذمہ داری ہمیشہ محسوس کی۔ دریائے کرشنا، اور بھیما کے سنگم پر ابراہیم عادل شاہ اور رام راج سے ملاقات کی اور مصالحتی گفتگو سے کام لیکر عادل شاہی اور وجیانگر کی فوجوں کو رخصت کر دیا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ گولکنڈے کا مورخ کہتا ہے کہ ان حملہ آوروں کو جو احمد نگر پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے اپنی تقریر سے اس طرح متاثر کیا کہ وہ دونوں اپنی سلطنتوں کو واپس ہو گئے[3]۔ اس ہتھکنڈے سے ابراہیم نے ایک طرف احمد نگر کو بچا لیا، اور دوسری طرف

---

[1] - ابراہیم زبیری نے بساتین السلاطین میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ [2] - تاریخ قطب شاہی ص ۱۴۲۔

[3] - تاریخ قطب شاہی ص ۱۴۴۔ لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ گلبرگے کے محاصرے کے دوران میں جو احمد نگر اور گولکنڈے کی فوجوں نے کیا تھا، محصورین مغلوب ہو رہے تھے تو ابراہیم اچانک محاصرہ اٹھا کر گولکنڈہ واپس ہو گیا تا کہ گلبرگے کے قبضے سے حسین نظام شاہ کی طاقت نہ بڑھ جائے (تاریخ فرشتہ ص ۱۷۰-۱۷۱) یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

بیجاپور اور وجیانگر سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھے[1] اور ایک موقعے پر جبکہ وجیانگر میں رام راج کے بھائیوں نے بغاوت کی تو، دیرینہ تعلقات کی بنا پر گولکنڈے کی فوجوں سے رام راج کی مدد بھی کر دی تاکہ اس کی طرف سے وجیانگر کو کوئی بدگمانی نہ ہو۔

احمد نگر پر حملے

لیکن ابراہیم عادل شاہ اول کے انتقال سے جو ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء میں ہوا، سیاسی بساط پھر اُلٹ گئی۔ اس کا جانشین علی عادل شاہ اول دکن کا بہت بڑا سورما تھا، تخت نشین ہوتے ہی اس نے احمد نگر سے پھر پرانی پرخاش شروع کر دی۔ شولاپور، اور کلیان کا مطالبہ کر دیا، اور دھمکی دی کہ اگر یہ واپس نہ کیے جائیں گے تو احمد نگر پر حملہ ہوگا۔ وجیانگر سے دیرینہ اتحاد کو تازہ کر کے پہلے سے حملے کی تیاری کر لی تھی۔ یہ خود وجیانگر گیا تھا اور رام راج کے خاندان سے ایسے گہرے تعلقات پیدا کر لیے کہ جو پہلے نہیں تھے۔ رام راج کی بیوی علی عادل شاہ کو اپنا بیٹا اور رام راج کی بیٹیاں اس کو اپنا بھائی کہتی تھیں۔ راجہ کے حرم میں اس کی بے تکلف آمد و رفت ہوتی تھی۔[2] ظاہر ہے کہ یہ تعلقات بیجاپور کے لیے بہت خوشگوار تھے، لیکن یہ احمد نگر اور دکن کے توازن قوت کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ دونوں طاقتوں کا احمد نگر پر متحدہ حملہ ہو گیا۔ رام راج نے ابراہیم کو بھی دعوت دی کہ معاہدے کے بموجب اس لڑائی میں شریک ہو۔ مصطفےٰ خاں کی رائے سے ابراہیم بھی شریک ہو گیا۔[2] حملہ آور احمد نگر پر اس زور سے آئے کہ ان کی مدافعت مشکل ہو گئی۔ احمد نگر کے مشہور جنرل تفال خاں نے انتہائی کوشش کی لیکن مقابلہ بڑا سخت تھا۔ نہ صرف تفال خاں بھاگا بلکہ خود حسین نظام شاہ نے اپنی ماں آمنہ بی بی کو چھوڑ کر احمد نگر سے بھاگ گیا اور دولت آباد میں پناہ لی۔ حملہ آوروں نے احمد نگر کو دل کھول کر لوٹا۔ تمام محلات، باغات اور مزرعے جلا کر خاک کر دیے۔ عمارتیں منہدم ہوئیں اور جلا دی گئیں۔ وجیانگر کے ہندو سپاہیوں نے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی، مسجدوں کو مسمار کیا اور قرآن شریف کی توہین کی۔ بیچارے حسین نظام شاہ کو مجبوراً کلیان دے کر صلح کرنی پڑی اور حملہ آور بہ وقت تمام احمد نگر سے واپس ہوئے۔

---

[1] بساتین السلاطین ص ۸۲۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۵۲۔

یا تاریخ قطب شاہی کی روایت صحیح سمجھی جائے تو ابراہیم قطب شاہ کے بیچ بچاؤ کرنے سے حملہ آور واپس ہوئے قطب شاہی مورخ کہتا ہے کہ ان حملہ آوروں کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ بھی شریک تھا لیکن اس میں احمد نگر کی دشمنی مقصود نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ بظاہر بیجاپور اور وجیانگر سے بھی اپنے تعلقات قایم رکھے اور احمد نگر کو بھی بچائے ۔مصطفےٰ خاں نے یہی رائے دی تھی ورنہ وجیانگر دشمن ہو جاتا ۔چنانچہ ایک طرف حسین نظام شاہ اور اس کی ماں بی بی آمنہ کو اطمینان دلایا اور دوسری طرف خفیہ طور پر اہل قلعہ کو رسد پہنچائی لیکن جب حملہ آوروں نے بڑی اُدھم مچائی تو ابراہیم نے مختلف ترغیبوں سے کام لیکر ان کو احمد نگر سے واپس ہونے کے لیے مجبور کر دیا اور اپنی سلطنت میں سے کونڈہ پلی یعنی مصطفےٰ نگر رام راج کو دینے کا وعدہ بھی کیا۔[1]

معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا۔ احمد نگر کے جذبۂ انتقام نے پھر وہی مکدر فضا پیدا کر دی جو ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ پچھلی ہزیمت سے حسین نظام شاہ اس قدر متاثر تھا کہ اس نے بہت جلد انتقام کا سامان کر لیا۔ انتقام لینے کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ بیجاپور کی طرح یہ بھی کسی مملکت سے اتحاد پیدا کرتا، اور اپنی طاقت بڑھاتا۔ اس کے لیے صرف گولکنڈے کی سلطنت ہی ایسی تھی جس سے اتحاد ہو سکتا تھا، یا پرانا اتحاد زیادہ مضبوط کیا جا سکتا تھا۔ اور اتحاد ازدواجی تعلقات کی بدولت زیادہ مضبوط اور خوشگوار ہوتا ہے اس موقعے پر یہی ہوا۔ بیجاپور اور گولکنڈے کی تاریخ پر اعتماد کیا جائے تو خود حسین نظام شاہ نے سلطنت گولکنڈہ سے رشتہ داری پیدا کرنے کی خواہش کی تھی چنانچہ قاسم بیگ حکیم۔ شاہ جعفر جو شاہ طاہر کا بھائی تھا، اور مولانا عنایت اللہ کو گولکنڈہ بھیجا گیا، اور شادی کی سلسلہ جنبانی کی گئی۔[2] لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ احمد نگر سے واپس ہوتے ہوئے ابراہیم قطب شاہ نے خود خواہش

---

[1] ۔تاریخ قطب شاہی ص ۲۰۵ لیکن فرشتے کا بیان یہ ہے کہ علی عادل شاہ محاصرے کے دوران میں جبکہ حملہ آور احمد نگر پر قابض ہونے والے تھے ابراہیم قطب شاہ احمد نگر کے قلعے سے فرار ہو گیا، اور گولکنڈہ پہنچ گیا۔ اس کے یہاں آجانے سے علی عادل شاہ اور رام راج کو خطرہ محسوس ہوا، اور یہ دونوں محاصرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

[2] ۔بساتین السلاطین ص ۱۶۔

ظاہر کی تھی کہ حسین نظام شاہ کی بیٹی بی بی جمال سے اس کی شادی ہو جائے[1] درخواست خواہ کسی طرف سے ہو بالآخر شادی کی قرار داد ہو گئی اور یہ طے ہوا کہ دونوں بادشاہ قلعۂ کلیان کے پاس ملیں اور اسی جگہ شادی ہو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شادی کے بعد قلعۂ کلیان پر جو اس وقت عادل شاہی عملداری میں تھا دھاوا کیا جائے۔ ۹۷۱ھ ۱۵۶۳ء میں دونوں سلاطین اپنے خدم وحشم کے ساتھ قلعۂ کلیان کے پاس پہنچ گئے اور نہایت مسرت کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ کی شادی بی بی جمال سے کی گئی اور کئی روز تک جشن رہا۔ شادی کے بعد یہ متحدہ فوجیں قلعۂ کلیان پر چڑھ دوڑیں۔ علی عادل شاہ نے مدافعت کے لیے رام راج کو دعوت دی۔ والیِ برار اور والیِ بیدر امیر برید بھی اس اتحاد میں شریک ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رام راج دو لاکھ پچاس ہزار سوار کے ساتھ مقابلے کے لیے آیا تھا لیکن اس کو جنگ میں حصہ لیتے ہوئے پس و پیش ہوا[2] اور غالباً یہ پس و پیش ابراہیم قطب شاہ کی وجہ سے ہوگا کیونکہ ابراہیم کے ساتھ وجیانگر کے پرانے تعلقات تھے اور ابراہیم نے اس کی اڑے وقت مدد بھی کی تھی۔ لیکن عادل شاہ کے طریقۂ عمل کی وجہ سے اس کو مجبوراً جنگ میں شریک ہونا پڑا اور ظاہر ہے کہ اس متحدہ مدافعت کی وجہ سے کلیان کے محاصرین پریشان ہو گئے اور دوسری دقت یہ تھی کہ ابراہیم قطب شاہ کو پریشان کرنے کے لیے تلنگھانے پر حملہ ہو گیا۔ رام راج کا بھائی وینکٹ پتی اور جگدیو راؤ، عین الملک کنعانی، میاں بدو، چندہ خاں جو گولکنڈے کے باغی تھے پندرہ ہزار سوار کے ساتھ تلنگھانے پر حملہ آور ہو گئے۔ اس عین موقعے پر ابراہیم کو اپنی سلطنت کا بچانا ضروری ہو گیا۔ اسی وجہ سے حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ دونوں کلیان کے محاصرے سے پیچھے ہٹ گئے اور اپنے گھر چلے گئے تاکہ پہلے اپنی سلطنتوں کی حفاظت کریں[3]۔ علی عادل شاہ کو پوری کامیابی ہوئی مال غنیمت کے علاوہ جس میں ہاتھی اور گھوڑے تھے اس کو نظام شاہی سلطنت کے علم و نشان، دمامہ و ماہی مراتب اور

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۵۸۔ [2] ص ۹۶۔

[3] زبیری کہتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ، عادل شاہی حملے سے ڈر کر بھاگا۔ غالباً یہ صحیح نہیں ہے بساتین السلاطین ص ۸۷۔

سبز علم جو نظام شاہی خاندان کا مخصوص علم تھا حاصل ہوئے۔

چونکہ واپسی ایسے راستے سے تھی جہاں دشمنوں کی فوجیں تھیں، اس لیے احمد نگر کا مشہور جنرل مرتضےٰ خاں تین ہزار سوار کے ساتھ ابراہیم کے ہمراہ ہو گیا لیکن عادل شاہی اور ویجیا نگر کی فوجوں نے اس کا تعاقب ضرور کیا۔ ابراہیم نے اپنے پیچھے منتخب جنرلوں کو جو شیر خاں، حسن خاں، عزیز خاں، دولت خاں، شیخ محمد اور میلا بھائی بتائے جاتے ہیں، دشمن کے مقابلے کے لیے مقرر کردیا[1] اور بڑی لڑائی ہوئی بعض قطب شاہی افسر عرب خاں اور شیخ محمد دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ اسی دار و گیر میں ابراہیم گولکنڈہ پہنچ تو گیا لیکن رام راج اور علی عادل شاہ تاڑپلی تک جو گولکنڈے سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے تعاقب کرتے ہوئے آئے جگدیو راؤ اور عین الملک کنعانی کو تلنگھانے میں تاخت و تاراج کے لیے آمادہ کیا۔ اس کے علاوہ رام راج نے مرتضےٰ نگر کے راجہ سری تما کو پچاس ہزار سوار کے ساتھ مصطفےٰ نگر بھیج دیا، تاکہ وہاں لوٹ مار کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دارالسلطنت کے اردگرد بھی لوٹ مار ہونے لگی۔ چونکہ جگدیو راؤ کے تلنگانے میں پرانے تعلقات تھے ان سے کام لیکر اور رام راج کی عنایتوں کا لالچ دلا کر اس نے کوئل کنڈہ گھنپورہ اور پانگل کے نائکواڑیوں کو اپنے ساتھ فراہم کرلیا، چنانچہ اندرکنڈہ کے نائکواڑی کیسر راؤ نے حکومت سے علانیہ انحراف کردیا۔ سدری تما، مصطفےٰ نگر سے اور شتاب خاں راج مندری سے ویلور آئے اور یہاں کے علاقوں کا محاصرہ کرلیا۔ اس سے گولکنڈے کو سخت پریشانی ہوئی اور یہ اس کے لیے انتہائی تشویش کا زمانہ تھا۔ ابراہیم نے اپنی پوری قوت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا کہ اس کے باپ نے اپنے زور بازو سے تلنگانے کے ایک بڑے حصے کو مسخر کرکے قطب شاہی سلطنت قایم کی تھی جو ان نازک حالات میں دشمنوں کے ہاتھ میں جارہی تھی وہ خود مقابلے کے لیے اٹھا[2] اس کے ساتھ سلاطین میں کچھ خوشگوار واقعات بھی پیدا ہوگئے۔ رام راج کی کامیابیوں سے جو تلنگانے میں ہو رہی تھیں، علی بریدا اور علی عادل شاہ دونوں کو پریشانی ہوئی کہ دکن میں اس کا پلّہ

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۱۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۳۔

بھاری ہو جائے گا، اور یہ پورے دکن کے لیے خطرناک ہے۔ اس تشویش سے یہ دونوں رام راج سے علحدہ ہو گئے اور اس کو صلح کے لیے مجبور کیا گیا۔ اس کے متعلق ابراہیم کو اطلاع دی گئی۔ صلح کی گفتگو کے لیے گولکنڈے سے مصطفےٰ خاں کو بھیجا گیا۔ مصطفےٰ خاں نے ایک طرف جگدیو راؤ کو شرم دلائی اور دوسری طرف علی عادل شاہ سے مل کر دکن کے معاملات پر گفتگو کی۔ علی عادل شاہ نے اس کو باریاب کیا، اور اس "سید صافی ضمیر" کی تقریر دل پذیر[1] سے معاملات سلجھ گئے۔ رام راج کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ پانگل اور گھنپورہ جو قدیم زمانے سے دیجیانگر کی عملداری میں تھے اس کو دیے جائینگے، وہ صرف انھیں مقبوضات پر قناعت کرے اور دوسرے علاقوں پر دست درازی سے باز آجائے۔ اس تصفیے کے بعد علی عادل شاہ، علی برید، اور رام راج اپنے اپنے گھر چلے گئے، اور مصطفےٰ خاں کامیابی کے ساتھ گولکنڈہ واپس آیا۔

اس سفارت سے واپس آنے کے بعد مصطفےٰ خاں نے ابراہیم کو مشورہ دیا کہ قلعۂ گولکنڈے کو مستحکم کرنا ضروری ہے، کیونکہ قلعے میں مدافعت کا پورا انتظام نہیں تھا۔ قلعے کی جو تاسیس سلطان قلی کے عہد میں ہوئی تھی، وہ کافی نہ تھی۔ ان نازک حالات نے جو ابھی گولکنڈے پر گذرے، ثابت کر دیا کہ قلعے کے لیے کس قدر استحکام کی ضرورت ہے۔ بہرحال بڑے اہتمام سے قلعے کی تعمیر شروع ہوئی۔ مضبوط فصیل اور برج بنائے گئے، گولکنڈے کا مشہور بالاحصار تیار ہوا۔ بیرونی فصیل کے اندر محل، رہائش کے مکان اور بازاروں کا انتظام ہوا۔ اس تعمیر کے لیے منتخب انجینیر اور معمار مقرر کیے گئے تھے۔ پہلے خود قلعے کی تعمیر جو آبادی کے بیچ میں پہاڑی پر واقع ہے، مدنظر تھی۔ یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی، دوسرے آبادی اور شہر کی حفاظت کے لیے ارد گرد فصیل کھینچی گئی تاکہ اگر باہر سے حملہ ہو تو غیر سپاہی آبادی کو ضرر نہ پہنچے۔ یہی قلعہ جو اس وقت ابراہیم کے عہد میں تعمیر ہوا تھا وہ آیندہ ایک صدی تک سلطنت گولکنڈہ کی

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۳۔ اس تاریخ میں مصطفےٰ خاں کے تدبر کی بڑی تعریف ہے کہ اس نے اپنے بر موقع ہتھکنڈوں اور تقریروں سے معاملات کی یکسوئی کی اور گولکنڈے کو بچا لیا۔

حفاظت کرتا رہا۔ ملک کے جن باغیوں نے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا، ان کی خاطر خواہ سرکوبی کی گئی۔ اندرکنڈے کے باغی کیسر راؤ کی جو نائکواڑی تھا، خود مصطفےٰ خاں نے سرکوبی کی جس کے صلے میں مصطفےٰ خاں کو جو اب تک میرجملہ تھا پیشوا، اور وکیل مطلق بنایا گیا۔ دارالسلطنت میں ایک بڑے نائکواڑی نے جس کا نام سارو راؤ نائکواڑی بتایا جاتا ہے بغاوت کی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں شورش کر کے قلعہ رام راج کے حوالے کر دے اور اس طرح قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مصطفےٰ خاں نے بروقت اس کی خبر لی۔ چونکہ باغیوں کی کثرت تھی، پہلے ہی سلسلے میں ان کا قلع قمع نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ مصطفےٰ خاں کو ہمارے حوالے کیا جائے تو ہم بادشاہ کی اطاعت کر لیتے ہیں۔ مصطفےٰ خاں ملک کی خاطر نہایت وفاداری کے ساتھ دشمنوں کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن بادشاہ نے ان کی ایک نہ سنی اور برابر سرکوبی کی۔ راجمندری اور ایلور میں، جہاں شتاب خاں نے سر اٹھایا تھا، رفعت خاں لاری کو ملک نائب کا خطاب دے کر بھیجا گیا، اور اس کے ساتھ آدم خاں، ملک شیرن، تاج خاں، عزیز الملک بھیجے گئے تھے۔ ان سپہ سالاروں نے موسم کی تمام مشکلات کا مقابلہ کر کے باغیوں کی سرکوبی کی اور ان اقطاع پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سلطنت گولکنڈہ اپنے قدرتی حدود تک محفوظ ہو گئی۔

ساتواں باب

جنگ تالیکوٹ

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے آیندہ سات سال تک سلاطین دکن کی باہمی رقابت اور وجیانگر کی شرکت سے دکن میں جو افسوسناک حالات گذرے وہ رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اگرچہ احمد نگر اور بیجاپور کی رقابت نے دکن کی فضا ہمیشہ مکدر رکھی اور اس سے دکن کے سیاسی اطمینان اور رفتار تمدن کو بہت نقصان پہنچا، لیکن اس رقابت کا تاریک پہلو یہ تھا کہ بیجاپور کی خود غرضی نے وجیانگر کی ہندو سلطنت کو اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ اس سے نہ صرف وجیانگر کو خود بخود سطح مرتفع دکن کا راستہ مل گیا، اور اس کو شمالی دکن کی سیاست میں حصہ لینے اور اپنا قدم جمانے کے مواقع ہاتھ آگئے، بلکہ اس سے یہ نقصان پہنچا کہ وجیانگر کی ہندو فوجوں نے مسلمانوں کے خلاف بری طرح دل کا بخار نکالا۔ احمد نگر میں قبریں اور مسجدیں مسمار ہوئیں، قرآن شریف کی توہین کی گئی جو مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت چیز تھی۔ اگرچہ ابراہیم اور علی عادل شاہ نے اپنی تائید کے لیے رام راج کو دعوت دی تھی، لیکن تاریخ کہتی ہے کہ ان کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ اس سے اسلام کی توہین ہو، بلکہ انھوں نے حملے سے پہلے اس کی ہدایت کردی تھی جس کی پابندی نہیں ہوئی[1]۔ اس کے علاوہ توازن قوت بھی خطرے میں پڑ رہا تھا۔ رام راج کی دست درازیاں جس طرح احمد نگر پر ہوئی تھیں اسی طرح گولکنڈے کی سلطنت پر ہوئیں، بلکہ ابراہیم نے جو احمد نگر کا ساتھ دیا تو رام راج نے

[1] بساتین السلاطین ص ۹۰۔

گولکنڈے کو بہت نقصان پہنچایا جو گولکنڈے کی حکومت کے لیے نہایت تشویشناک تھا۔ اگر بر وقت بیچ بچاؤ نہیں ہوتا اور مصطفیٰ خاں کی سیاسی علمبرداری معاملات کی یکسوئی نہ کرتی تو گولکنڈے کی سلطنت کے لیے بہت برے دن آجاتے اور یہ نوخیز سلطنت قبل از وقت ہندو سلطنت کا شکار ہوجاتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تلنگانے کے الحاق سے وجیانگر کی ایک ناقابل مزاحمت طاقت ہوجاتی۔ گو پہلے پہل عادل شاہی اور عماد شاہی حکومتیں موقعے کی یہ نزاکت محسوس کرنے سے قاصر تھیں، لیکن جب تلنگھانے میں رام راج کا غلبہ ہونے لگا تو شمال کی اسلامی سلطنتیں خوف زدہ ہوئیں اور اس خطرے کو رفع کرنا اور گولکنڈے کو بچانا ضروری سمجھا۔

نیز ان کامیابیوں سے جو رام راج کو احمد نگر اور گولکنڈے کے حدود میں حاصل ہوئی تھیں، اس قدر حوصلہ افزا ثابت ہوئیں کہ وہ غالباً تمام دکن کی علمبرداری کا خواب دیکھنے لگا اور اس کو یہ خیال ہوگیا کہ تقریباً تمام دکن پر قبضہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ دکن کے مورخ کہتے ہیں کہ ویسے بھی وجیانگر کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ اگر زبیری کا بیان صحیح سمجھا جائے تو وجیانگر کی اتنی بڑی سلطنت تھی کہ اس کی ساٹھ، ستر بندرگاہیں، بے شمار قلعے، اور الماس و زمرد کی کئی کانیں تھیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سی قیمتی اشیا اس میں پیدا ہوتی تھیں۔ اس سلطنت کی آمدنی کوئی بیس کروڑ ہون یا اسّی لاکھ روپیہ تھی۔ اور اس کی فوج تین چار لاکھ سوار، اور نو، دس لاکھ پیدل پر مشتمل تھی۔[1] خود یہ چیزیں احمد نگر اور گولکنڈے کو ڈرانے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ اگر رام راج تلنگانے پر بھی قابض ہوجاتا تو اس کی طاقت غیر معمولی ہوجاتی۔ اور اس کے لیے تلنگانے پر پیشقدمی کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس کی بعض حرکتوں سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حوصلے روز بروز بڑھ رہے ہیں اور شمالی دکن کے سلاطین اس کی نظر میں بے حقیقت ہیں۔ چنانچہ پانچ اسلامی سلطنتوں کے سفیروں کے ساتھ جو وجیانگر میں رہتے تھے، برا سلوک ہوتا تھا، دربار میں ان کو جگہ نہیں ملتی تھی۔

---

[1] بساتین السلاطین ص ۸۹۔

یہ صورت حال اسلامی سلاطین دکن کے لیے از حد تشویشناک تھی۔ گو علی عادل شاہ اب تک اپنے ذاتی اغراض کے لیے رام راج کا دم بھرتا تھا لیکن ہندو فوجوں کی دل آزاریوں اور رام راج کی دست درازیوں سے اس کو بھی ٹھیس لگی چنانچہ زبیری لکھتا ہے کہ علی عادل شاہ "از یں بے باکی و ناپاکی خاطرش سیر آمدہ گرانی کمال بہم رسانیدہ از غصہ و حمیت اسلامی برخود می پیچید۔ صلاح دینی و دنیوی جز در دفعش نمی دید"[۱] اپنے عمائد سلطنت سے جن کے نام کشور خاں۔ شاہ ابوتراب بتائے جاتے ہیں مشورہ کرکے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ویجیا نگر کا خاتمہ کر دیا جائے اور چونکہ یہ کام تنہا اس سے نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے تمام سلاطین دکن کو باہم متحد کرنا ضروری سمجھا گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس منصوبے کی پہلی افتاد گولکنڈے کے دربار میں پڑی تھی، کیونکہ رام راج سے احمد نگر اور گولکنڈے کو زیادہ نقصانات پہنچے تھے اور اگر حالات موافق نہیں ہوتے تو ان سلطنتوں کا ہمیشہ کے لیے شیرازہ بکھر جاتا۔ خاص طور پر گولکنڈے کو جو ویجیا نگر سے ملحق تھا دائمی خطرہ تھا۔ چنانچہ گولکنڈے کا مورخ کہتا ہے کہ رام راج کی دست درازیوں سے خائف ہو کر ابراہیم قطب شاہ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ویجیا نگر کا خاتمہ کرنے کی کوئی تجویز کرنی چاہیے اور اس کو روبراہ کرنے کے لیے اس نے حسین نظام شاہ کو اپنے منصوبے سے واقف کر دیا۔[۲] اور یہ قرین قیاس بھی ہے! اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ علی عادل شاہ نے سب سے پہلے اس منصوبے کی سوچ بچار کی اور دوسرے سلاطین کو اس کی دعوت دی تو اس میں پُر زور حصہ لینے والا بالآخر ابراہیم قطب شاہ ہی تھا کیونکہ جب علی عادل شاہ نے ابراہیم کے پاس اتحاد کے لیے کشور خاں کے ذریعے پیغام بھیجا تو اس نے فوراً لبیک کہا، خود واسطہ بن کر احمد نگر اور بیجاپور میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی یہی مصطفیٰ خاں پہلے بیجاپور اور اس کے بعد احمد نگر میں حسین نظام شاہ سے ملاقات کی اور خوش بیانی سے کام لے کر اتحاد کا راستہ صاف کر دیا۔ چونکہ احمد نگر اور بیجاپور میں دیرینہ رقابت تھی اس لیے اتحاد کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لیے حسین نظام شاہ کی

[۱] - بساتین السلاطین ص ۹۱ - [۲] - تاریخ قطب شاہی ص ۱۴۷ -

ناموزبیٹی چاند بی بی کو علی عادل شاہ سے اور اس کی بہن بی بی ہدیہ سلطان کی حسین کے بیٹے مرتضےٰ سے شادی قرار دی گئی، اور چونکہ شولاپور کے لیے دونوں میں ہمیشہ نزاع رہتی تھی، اس لیے یہ طے ہوا کہ یہ ضلع چاند بی بی کے جہیز میں بیجاپور کو دیا جائے۔ اس شادی کی قرارداد کے لیے مصطفےٰ خاں کے ساتھ احمد نگر سے قاسم بیگ حکیم تبریزی اور ملا غیاث الدین قاسمی، بیجاپور گئے تھے اور ان کے توسط سے یہ مبارک قرارداد طے ہوئی تھی، شادیوں کی رسم بڑی دھوم سے انجام دی گئی۔ احمد نگر اور بیجاپور میں کئی روز تک جشن ہوئے اور مسرت کا اظہار ہوا۔

جب اس اتحاد کی تکمیل ہوگئی تو وجیانگر سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی، علی عادل شاہ نے رام راج سے پرگنہ اودنکور، و، پاکری، اور قلعۂ رائچور، اور مدگل واپس طلب کیے، اور اس مطالبے کے لیے ایک ایلچی روانہ کیا۔ رام راج تو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تھا ہی، اس نے ایلچی کو حدودِ وجیانگر سے بری طرح نکال دیا۔ اس ایلچی کے واپس آتے ہی مسلمان سلاطین نے وجیانگر کی طرف کوچ کر دیا۔ والی بیدر علی برید بھی اس اتحاد میں شریک تھا۔ برہان عماد الملک والیِ برار اس سے کنارہ کش رہا کیونکہ اس کو حسین نظام شاہ سے خصومت تھی۔ قرارداد کے مطابق ۹۷۲ھ میں چاروں سلاطین بیجاپور میں ملے اور یہاں سے کوچ کرکے دریائے کرشنا کے کنارے تالیکوٹ پہنچے۔ چونکہ یہ موضع سلطنت بیجاپور میں داخل تھا، اس لیے علی عادل شاہ نے یہاں اپنی طرف سے سب مہمانوں کی دعوت کی اور اس کے بعد کوچ کا انتظام کیا گیا۔ اس اثنا میں رام راج کو اطلاع ہوگئی تھی کہ ایک متحدہ فوج حملہ کرنے کے لیے آرہی ہے، لیکن اس بات کی بھی اطلاع تھی کہ اگر حملہ آوروں کے شرائط پورے ہو جائیں، یعنی عادل شاہی اور قطب شاہی مقبوضات جو اس نے زبردستی حاصل کیے تھے، واپس کر دیے جائیں اور اس کے بعد وہ کوئی دست درازی نہ کرے تو حملہ آور واپس ہو جائیں گے، اور اس کے لیے یہ اسلامی سلاطین بالکل راضی تھے لیکن رام راج اپنی دفاعی قوت کے گھمنڈ میں لڑائی کے لیے اتر آیا۔ پچھتر ہزار سوار، اور نو لاکھ پیادوں کے ساتھ آمادۂ پیکار ہوگیا۔ اپنے چھوٹے بھائی ایلتم راج کو بیس ہزار سوار، پانچ سو ہاتھی اور ایک لاکھ پیدل فوج کے ساتھ پہلے روانہ کیا تاکہ حملہ آوروں کو دریا سے اترنے نہ دے اور

اس کے پیچھے اپنے منجھلے بھائی وینکٹا دری کو بھیجا جب یہ دونوں فوجیں دریائے کرشنا کے کنارے پہنچ گئیں اور عبور کا راستہ مسدود کر دیا تو رام راج خود بڑی فوج کے ساتھ بگری ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ اسلامی فوج کے لیے دریا کا عبور کرنا بہت مشکل ہو گیا، جو راستے عبور کے تھے سب مسدود تھے۔ حملہ آور، دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے دریا کے کنارے کنارے بہت آگے نکل گئے اور ہندو فوجیں بھی ان کا راستہ روکنے کے لیے ان کے ساتھ ہو گئیں اور بہت دُور نکل گئیں تاکہ اسلامی فوجیں دوسری جگہ سے راستہ حاصل نہ کر لیں لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ جب مسلمان فوجوں نے دیکھا کہ ہندو فوجیں اپنی جگہ سے بہت دُور نکل گئی ہیں تو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹ گئیں اور پانچ روز کی مسافت ایک دن میں طے کر گئیں اور ہندو فوج کے آنے سے بہت پہلے اسی پایاب جگہ سے ایسا اچانک دریا عبور کر لیا کہ ہندو فوجوں کو خبر تک نہیں ہوئی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ تمام اسلامی فوجیں دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے جمع ہو گئیں، اور دس میل آگے بڑھ کر رام راج کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس اچانک پیشقدمی اور عبور سے ہندو فوجیں بہت گھبرائیں اور ان کے لیے مقابلہ مشکل ہو گیا۔

۲۰ رجمادی الثانی ۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء کو یہ لڑائی ہوئی۔ اسلامی فوجوں کی صفیں اس طرح آراستہ ہوئی تھیں کہ دکن کے دستور کے مطابق، قلب لشکر میں حسین نظام شاہ اور میمنہ پر علی عادل شاہ، میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ اور علی برید کھڑے ہو گئے، اور ہاتھی، توپ، مناسب جگہ قایم کیے گئے۔ دوسری طرف خود رام راج کی فوجوں کی تنظیم یہ تھی کہ قلب لشکر میں تو وہ خود پینتیس ہزار سوار، اور پانچ لاکھ پیادے پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اور میمنہ پر الیتم راج کو بیس ہزار سوار، دو لاکھ پیدل پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ۔ میسرے پر وینکٹا دری کو پچیس ہزار سوار، دو لاکھ پیادے، پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ کھڑا کر دیا اور حکم دیا تھا کہ اگر نظام شاہ گرفتار ہو تو اس کا سر میرے سامنے لایا جائے، اور علی عادل شاہ و ابراہیم قطب شاہ گرفتار ہوں تو اُن کو زندہ پابہ زنجیر لایا جائے، تاکہ انھیں عمر بھر قید میں رکھا جائے گا۔ تقریباً دوپہر کو لڑائی شروع ہوئی۔ رام راج نے یہ غلطی کی تھی کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے سنگاسن میں بیٹھ گیا۔ لڑائی کا پہلا رنگ اسلامی فوجوں کے خلاف پڑتا تھا۔

ہندو فوجوں نے تقریباً پانچ ہزار بان۔ بندوق۔ توپ اور ضرب زن سر کرنے شروع کر دیے، اور ان کی فوج جو راج بیدر پر مشتمل تھی اپنی تلواروں کو سوت کر دشمن پر جا پڑی! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی فوج کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ لیکن حسین نظام شاہ نے جو قلب لشکر میں تھا، کایا پلٹ کر دی، اس نے فوج کے سامنے دو سو بڑی توپیں اور دو سو درمیانی توپیں، اور دو سو زنبورک، جو بندوق سے بڑی ہوتی ہیں، اس سلیقے سے قایم کر دی تھیں کہ دشمن کے لیے مقابلہ ناممکن تھا۔ چلبی رومی خاں، جو توپ چلانے میں استاد تھا، ان کے سر کرنے کے لیے مقرر تھا۔ اس کے علاوہ دو ہزار ترکی تیر انداز بھی کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے سپاہ گری کے قاعدے کے مطابق تیروں سے حملہ کر کے ہندو فوج کو توپ خانے کے رو بہ رو ہٹا دیا، اور جب رومی خاں نے توپیں سر کیں تو ہندو فوج کا بڑا حصہ کھیت ہو گیا۔ رام راج بہت گھبرایا، اور اپنے مرصع شامیانے اور گدی پر بیٹھ کر سپر بھر بھر کے اپنے سپاہیوں اور سرداروں کو روپیے تقسیم کیے اور جارحانہ کوشش کے لیے جرأت دلائی! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندو فوجوں نے پھر زور سے حملہ کیا، اور اسلامی فوجیں متزلزل ہو گئیں لیکن اس مرتبہ بھی نظام شاہ کی ثابت قدمی سے بات رہ گئی۔

رومی خاں نے گولوں کی جگہ تانبے کے ٹکڑے بھر کے چھوڑے، اور اس حملے سے پانچ، چھ ہزار ہندو فوج مر گئی، اور خود حسین نظام شاہ، کشور خاں لاری کے ساتھ رام راج پر حملہ آور ہوا، اور اس کی تمام صفیں منتشر کر دیں۔ اور ایک نظام شاہی ہاتھی نے ایسا حملہ کیا کہ رام راج کے بھوئیوں نے سنگاسن زمین پر پٹک دی اور بھاگ گئے۔ اور رام راج گرفتار ہو گیا، اور رومی خاں اس کو نظام شاہ کے پاس لایا، اور بادشاہ کے سامنے اس کا سر تن سے جدا کیا گیا! اس واقعے سے ہندو فوج فرار ہونے لگی اور اناگندی تک ان کا تعاقب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ہندو فوج تہ تیغ ہوئی تھی، میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ نے وینکٹادری کو، اور میمنہ پر علی عادل شاہ نے اپنے راج کو شکست دی، اور اس کی فوجوں کو تہ تیغ کیا۔

فاتحین دس روز تک تو محاذ جنگ میں رہے، اور اس کے بعد خود وجیانگر میں قیام کیا، اور یہاں چھ مہینے رہے اور بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ رائچور، مدگل۔ پرگنۂ ارشنگری، اور رتاکری کو جو رام راج نے زبردستی لے لیے تھے،

دوبارہ حاصل کرلیا، اور بہت سا مال غنیمت حاصل ہوا[1]۔ اگرچہ اس تھوڑی سی مدت میں وجیانگر کے تمام علاقوں پر قبضہ کرنا، ناممکن تھا، اور بعض علاقے رام راج کے بھائی وینکٹادری، اور رایلیتم راج کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے تاہم یہ بہت بڑی فتح تھی اور اس کی خبر ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ گئی۔ اس سلطنت کے خاتمے سے شمالی دکن کی تمام سلطنتوں کو ہمیشہ کے لیے اطمینان ہوگیا، بلکہ مادی فایدے بھی ہوئے۔ گولکنڈے اور بیجاپور نے آہستہ آہستہ حملہ کرکے اپنی سلطنتیں بہت وسیع کرلیں۔ چنانچہ آخری زمانے میں یہ سلطنتیں کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگئیں۔ ابراہیم قطب شاہ نے خود کرناٹک پر حملے کیے تھے اور اس قبضے سے ان کی دولت و اقبال میں بہت اضافہ ہوا۔

اس فتح وجیانگر سے گولکنڈے کو پہلا فایدہ یہ ہوا کہ اس کے مشرقی علاقے جو رام راج کے زہریلے اثر سے متلاطم تھے آسانی سے ہاتھ آگئے۔ وجیانگر کی طاقت کے مٹ جانے سے مشرقی تلنگانے کے نائکوں کو مغلوب کرنا مشکل نہیں تھا چنانچہ فتح وجیانگر کے ایک سال بعد ابراہیم قطب شاہ نے ملک نائب عین الملک، صلابت خاں بلکہ شیر الملک کو راج مندری کی تسخیر کے لیے بھیج دیا۔ سخت معرکوں کے بعد ۹۷۱ھ میں راج مندری فتح ہوگیا، اور جن نائکوں نے یہاں اپنا قدم جمایا تھا، وہ یا تو وجیانگر کی طرف بھاگ گئے یا قاسم کوٹہ میں پناہ لی جب ابراہیم قطب شاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے قاسم کوٹہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کا راستہ بہت دشوار گزار اور قلعہ بہت مضبوط تھا لیکن قطب شاہی فوجوں نے اس کا بہت جلد خاتمہ کردیا۔ ۹۸۵ھ میں عماد الدین شیرازی حیدر الملک نے کونہ بیر فتح کرلیا، اور تقریباً اسی زمانے میں امیر زنبیل اور دوسرے سپہ سالاروں نے گولکنڈے کے علاقے جو کاکن۔ ناکاوہی اور کلکور کے نام سے موسوم تھے مسخر کر لیے۔ یہ مشرقی کوکن کے حصے سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں مفتوح ہوئے تھے لیکن سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے عادل شاہی فوجوں نے ان پر قبضہ کرلیا تھا۔ ان فتوحات سے گولکنڈے کی سلطنت نہ صرف بیرونی خطرات سے مطمئن ہوگئی، بلکہ چاروں طرف اپنے قدرتی حدود تک پہنچ گئی۔ یعنی جنوب میں شمالی کرناٹک، مشرق میں

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۷۷

اڑیسہ، اور مغرب میں کوکن تک پہنچ گئی۔ دوسرے الفاظ میں تمام تلنگانہ اپنے قدرتی حدود کے ساتھ قطب شاہوں کے زیر نگیں آگیا، اور اس طرح یہ ایک قومی اور جغرافی سلطنت ہوگئی اور اس ہم آہنگی سے اس کو آیندہ تمدنی اور معاشی ترقی کرنے کے لیے بہت سے مواقع پیدا ہوگئے جن سے ابراہیم کے جانشینوں نے پورا فایدہ اُٹھایا۔

آٹھواں باب

سلطنت کی تعمیر

ابراہیم قطب شاہ نے قطب شاہی سلطنت کی ہر طریقے سے تعمیر کی۔ دکن کے بین مملکتی تعلقات میں ایک مستقل خارجی مسلک قرار دیا جو سلطنت کی بقا کا پوری طور پر ضامن ہو، ابراہیم کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اس نے کس طریقے سے سلطنت کی کشتی سیاست دکن کے سخت منجدھار سے صحیح سالم نکال لی ورنہ گولکنڈے کی نوخیز سلطنت بیجاپور اور وجیانگر کے خطرناک سیلاب میں ایسی بہہ جاتی کہ اس کا پتا نہیں چلتا۔ ابراہیم کی بیدار مغزی سے اس سلطنت کی نہ صرف ہستی قایم رہی بلکہ وہ اپنے قدرتی حدود تک پہنچ گئی جس میں اس کی آیندہ زندگی کا راز مضمر تھا۔ سلطنت اس وقت مضبوط ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے پورے جغرافیے پر حاوی ہو۔ ادھوری سلطنتیں دیرپا نہیں ہو سکتیں۔ ابراہیم نے اپنی کوششوں سے تلنگانے کے تمام طول و عرض اپنی سلطنت میں شامل کر لیے اور اس کے واسطے اپنی آخری عمر تک لڑتا رہا۔ ان لڑائیوں سے پہلے اس نے مرکزی استحکام کا پورا بندوبست کر لیا تھا تاکہ باہر سے حملے ہوں تو ان کی خاطر خواہ مدافعت ہو سکے۔ خان اعظم مصطفےٰ خاں کے مشورے سے قلعۂ گولکنڈے کا ایسا دفاعی انتظام کیا گیا کہ آج سے آیندہ سو سال تک یہ سلطنت کی پوری حفاظت کرتا رہا۔ نو مہینے میں اس کی تکمیل ہوئی اور اس پر تیس لاکھ روپیے خرچ ہوئے۔ قلعہ تمام پتھر اور چونے سے بنایا گیا اور اس کے اردگرد ایک وسیع فصیل بنائی گئی جس کا محیط آٹھ ہزار گز بتایا جاتا ہے، اس میں آٹھ آہنی دروازے ہیں۔ چبوتروں اور برجوں کی تعداد کوئی چار سو کے قریب تھی۔ قلعے کے استحکام کے ساتھ غالباً فوج کی بھی از سر نو

تنظیم کی گئی اور فوج میں لائق سپاہی اور افسر مامور کیے گئے، کیونکہ ابراہیم کے عہد میں جو بڑے بڑے معرکے سر ہوئے تھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں قطب شاہی فوج زیادہ کارکردہ تھی۔

مرکزی حکومت میں لائق لوگ مامور کرکے اس کی کارکردگی بہت بڑھائی گئی جس میں ابراہیم کی مردم شناسی کو بہت دخل تھا۔ جس وقت ابراہیم گولکنڈے کے تخت پر بیٹھا تھا عین الملک اور جگدیو راؤ جو پچھلی حکومت کے عمائد تھے باغی ہوگئے اور ملک سے باہر چلے گئے، اس لیے ابراہیم نے مصطفیٰ خاں اردستانی کو اپنا میر جملہ بنایا، اور چند سال کے بعد جب اس سے بڑے بڑے کام انجام پائے تو ۹۷۱ھ (۱۵۶۳ء) میں اس کو پیشوا بنایا گیا۔ تمام امور سلطنت، خواہ وہ خارجی ہوں، یا داخلی، سب اسی کے مشورے سے رو براہ ہوتے تھے۔ اگر جنگ تالیکوٹ کے بعد اس سے انتظامی غلطی سرزد نہ ہوتی تو عمر بھر کام کرتا اور ابراہیم قطب شاہ کے تمام عہد حکومت میں اس کی پیشوائی قایم رہتی۔[1] رفعت خاں لاری کو ملک نائب بنایا گیا جو علمی و عملی قابلیت کی وجہ سے ممتاز تھا۔ تلنگانے کی اکثر فتوحات جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں ہوئی تھیں، سب ملک نائب نے سر کیں۔ راجمندری۔ ایلور وغیرہ اسی نے تسخیر کیے تھے۔ امیر شاہ محمد انجو بھی اسی عہد کے بڑے عہدہ داروں میں سے تھا، اور یہ غالباً تمام قطب شاہی افواج کا سپہ سالار تھا۔ تلنگانے کے بعض مہموں کی اس نے کمان کی تھی۔ حسین بیگ ترکمان جس کا قطب شاہی خاندان سے

---

[1] جنگ تالیکوٹ کے بعد جب کئی قلعے فتح ہوئے تو اس سے اتفاقی طور پر ایک اصولی غلطی سرزد ہوگئی۔ قلعہ رائچور۔ مدگل۔ اودنگری۔ دتاگری، پر قبضہ کرنے کے لیے پہلے ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے مصطفیٰ خاں حسین نظام شاہ کی طرف سے مولانا عنایت اللہ، اور علی عادل شاہ کی جانب سے کشور خاں بھیجے گئے تھے، مصطفیٰ خاں نے ان قلعوں پر قبضہ کرکے بلا اجازت ان کی کنجیاں کشور خاں کے سپرد کردیں، اس سے ابراہیم قطب شاہ اور حسین نظام شاہ دونوں ناراض ہوگئے۔ آخر انہوں نے ایما سے ابراہیم نے مصطفیٰ خاں کو معزول کردیا۔ اس معزولی کے بعد یہ بیجاپور میں ملازم ہوگیا اور علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد ایک فساد میں مارا گیا (تاریخ قطب شاہی م　　)

رشتہ تھا، فوج کی بڑی خدمت پر مامور تھا۔ اکثر معرکوں میں اس کا بھی نام آتا ہے۔ حضرت حسین شاہ ولیؒ بھی جو بادشاہ کے داماد تھے، حکومت کے بعض فرایض انجام دیتے تھے، اکثر تعمیری کام انھیں کی نگرانی میں ہوئے ہیں۔ مرکزی حکومت کی کارکردگی میں خود بادشاہ کی بیدار مغزی کو بھی بہت دخل تھا۔ ابراہیم نے مرکزی حکومت کو اپنی دل سوزی اور لایق وزرا کی محنت اور قابلیت سے مضبوط اور باخبر بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کی بیدار مغزی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو مرکزی اور صوبے داری امور سے پوری طور پر وابستہ رکھتا تھا۔ غالباً کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہ تھی۔ ان اغراض کے لیے کہ مرکزی حکومت اپنے دور دراز اقطاع کے حالات سے بروقت باخبر رہے، جاسوسی میں بہت ترقی دی گئی۔ اور اگر بعض مورخوں پر اعتماد کیا جائے تو اس نے جاسوسوں کا ایک بڑا محکمہ قایم کردیا تھا، جو گولکنڈہ تو کجا خود دکن کے لیے بھی ایک نئی چیز تھی۔ اس محکمے کے انتظام کی بدولت اس کے جاسوس تمام ملک میں پھیل گئے اور اس سے حکومت کی کارکردگی بہت بڑھ گئی۔ اسی انتظام کا اثر تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں غیر معمولی امن قایم ہوگیا، جو ایک متمدن سلطنت کی شرط اولین ہے۔

قطب شاہی خاندان میں ابراہیم قطب شاہ سب سے پہلا حکمران ہے جس نے باضابطہ نظم ونسق قایم کرکے سلطنت کو پرامن بنایا۔ "ولایت تلنگ کہ پر از دزد و حرامی بود"[1] کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ تلنگانہ چوروں اور لٹیروں کا گھر تھا۔ راستے ایسے پرخطر تھے کہ مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ گزرنا حد درجہ دشوار تھا۔ بڑے قافلوں کی ہمراہی کے بغیر کوئی شخص اطمینان سے راستہ نہیں چل سکتا تھا اور یہاں کے چور اور لٹیرے بھی اپنے فن میں ایسے مشاق تھے کہ شاید دکن کے دوسرے حصوں میں ان کی نظیر نہ تھی۔ طرح طرح کی چوریاں کرتے تھے اور لوٹ مار سے مسافروں کو پریشان کرتے تھے۔ اور یہ حقیقت تاریخ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے کہ: "مردم تلنگانہ در فن دزدی از رہزنان ممالک دیگر ممتاز ند"[2]۔ تاسیس سلطنت کے بعد

---

[1] حدیقۃ العالم مقالۂ اول ص ۱۱۶۔ [2] حدیقۃ العالم ص ۲۰۰۔

غالباً یہ ہر حکومت کا پہلا فرض ہے کہ سلطنت کو پُرامن بنائے۔ ابراہیم قطب شاہ نے پورے اہتمام کے ساتھ تلنگانے کے چوروں اور لیٹروں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی، تاکہ ہر جگہ امن و امان قایم ہو، اور اس کی بدولت تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں انتہائی سختی سے کام لیا گیا یعنے چوروں اور لیٹروں کا سختی سے پیچھا کیا گیا، اور معمولی جرائم کی سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ بادشاہ کا یہ حکم تھا کہ مجرموں کو کوڑے مار کر ان کے پیر کے ناخن جُدا کریں اور ان کو برتن میں رکھ کر اس کے سامنے پیش کریں۔ یہ بہ ظاہر ایک وحشیانہ سزا معلوم ہوتی ہے لیکن اس زمانے میں جرائم کے انسداد، و، قیام امن کے لیے اس سخت گیری کی بہت ضرورت تھی۔ ابراہیم قطب شاہ نے تلنگانے میں وہی کام کیا جو غیاث الدین بلبن نے شمال ہند میں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت بہت جلد پُرامن ہو گئی۔ تاریخ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم کے حُسنِ انتظام کی وجہ سے چوری ارتکاب تو کجا کوئی شخص چوری کا لفظ زبان پر نہیں لاتا تھا۔ سزاؤں کی دہشت کی وجہ سے چوری و قزاقی بالکل مفقود ہو گئی۔ نیز کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی تھی۔ جہاں کہیں جدید فتوحات ہوتی تھیں، پہلے وہاں کے چوروں اور مفسدوں کا خاتمہ کیا جاتا تھا چنانچہ اندرکنڈے کی فتح کے بعد یہی انتظام کیا گیا۔ اگرچہ اس بیان میں کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں ہر بوڑھیا زر و جواہر کی کشتی لیے ہوئے تنہا گولکنڈے سے دُور احمد نگر اور بیجاپور کے حدود میں چلی جاتی تھی، اور کوئی شخص اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا تاہم یہ کہنا صحیح ہے کہ سلطنت کے تمام راستے بے خطر ہو گئے تھے، اور مسافر بے کھٹکے بغیر قافلے کے مُلک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی انتظام تھا کہ جب کبھی کسی تاجر کا کوئی جانور مَر جاتا، یا چوری جاتا تو سرکار سے اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اس طریقے سے ابراہیم کو عدل گُستری کا پورا خیال تھا ظاہر ہے کہ اس انتظام سے مُلک میں نہ صرف امن قایم ہو گیا، اور لوگ چین کی نیند سونے لگے، بلکہ اس سے تجارت اور صنعت و حرفت کو بہت فروغ ہوا، اور دوسری تمدنی ترقیوں کی راہیں پیدا ہو گئیں، جو کامیاب نظم و نسق کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اور تاریخ کے یہ الفاظ کہ "آں حضرت بدا آنچہ در ضبط مُلک و ملّت دست داہہ در ہیچ تاریخ کسے نشاں ندادہ" بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

ابراہیم کی تعمیر سلطنت میں رفاہ عام کے کام اور علمی سرپرستی بھی شامل ہے، زراعت کی ترقی کے لیے کئی تالاب بنائے گئے جو اب تک موجود ہیں اور ان سے بڑی بڑی زمینیں سیراب ہوتی ہیں کئی باغ لگائے گئے اور قصبات آباد ہوئے جن میں بعض ابراہیم کے نام سے موسوم ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حکمران تھا، وہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اسلامی زبانوں کے ساتھ مقامی زبان تلنگی کی بھی بہت سرپرستی کی تھی۔ اس کے دربار میں ہمیشہ علماء و فضلاء جمع رہتے تھے، اور ان کی صحبت سے فایدہ اُٹھاتا، اور ان سے اکثر مسائل پر بحث کرتا تھا۔ تقریباً ۳۰ تیس سالہ حکومت کے بعد ۹۸۸ھ ۱۵۸۰ء میں اس کا انتقال ہوا، باغ لنگر میں اس کو دفن کیا گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر صرف اکاون ۵۱ سال تھی، جو زیادہ نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کو بہت مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں اور بادشاہ ہونے کے بعد اس کو سلطنت کے داخلی اور خارجی بڑے بڑے جاں گداز مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

حصّۂ سُوم

سلطنت کا عروج



سلطان محمد قلی قطب شاہ

نواں باب

دکن کا سیاسی توازن

988ھ (1580ء) میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا، تو اس کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ کو تخت نشین کیا گیا جو باپ کے انتقال کے وقت اپنے تمام بھائیوں سے بڑا تھا[1]۔ چودہ رمضان 973ھ (1565ء) کو اس کی پیدائش ہوئی تھی، "باعثِ روزیِ اہلِ عالم" کے الفاظ سے اس کی تاریخ پیدائش نکلتی ہے۔ کئی شاعروں نے اس کی پیدائش کی مسرت میں نظمیں لکھیں اور ابراہیم قطب شاہ کے سامنے پیش کی تھیں اور اس کے صلے میں ان کو بیش بہا انعام

---

[1] عبدالقادر، عزت شاہ صاحب بڑا بیٹا تھا۔ اس کی شادی ایک معزز خاندان میں کی گئی تھی، لیکن اکیس (21) سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ دوسرا بیٹا حسین قلی بہت تعلیم یافتہ تھا۔ تاریخ کے الفاظ میں: "بہ زیورِ علم و فضل آراستہ و از علم و حکمت بہرۂ تمام داشت" لیکن یہ بھی چھبیس (26) سال کی عمر میں ایک تالاب میں ڈوب مرا۔ تیسرا بیٹا محمد قلی ہے جو باپ کا جانشین ہوا۔ چوتھا مرزا عبدالفتاح تھا جو فنِ قراءت کی وجہ سے بہت مشہور ہے، باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر تیرہ (13) سال تھی، محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں (1003ھ / 1594ء) اس کا انتقال ہوا۔ پانچواں بیٹا مرزا محمد خدا بندہ ہے جو محمد قلی قطب شاہ کا سگا بھائی تھا، باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر بارہ (12) سال کی تھی چونکہ اس نے اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کی تھی اس لیے قلعہ گولکنڈے میں قید کر دیا گیا، اور قید ہی میں (1020ھ / 1611ء) مر گیا۔ چھٹا محمد امین ہے جس کی عمر باپ کے انتقال کے وقت نو سال کی تھی، محمد قلی قطب شاہ سے اس کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ یہ اپنے پاکیزہ اخلاق اور علمیت کی وجہ سے بہت مشہور ہے (تاریخ قطب شاہی ص ۲۲۳)۔ ایک روایت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی ماں ایک ہندو عورت تھی

ملے، منجملہ ان کے یہ قطعہ بہت مشہور ہے:-

شاہ را داد خدا فرزندے ۔۔۔ کہ شد از دیدنِ او دل خرم

پئے شکرانہ شہِ دریا دل ۔۔۔ کرد با خلق بہ صد لطف وکرم

سالِ مولودش را یافت فلک ۔۔۔ باعثِ روزیِ اہلِ عالم
۹۷۳ھ

تخت نشینی کے وقت اس کی عمر پندرہ[1] سال کی تھی، لیکن تاریخ کے الفاظ میں "از برادران بہ جمیع صفات صوری و معنوی ممتاز بود" چنانچہ قطب شاہی سلطنت کا پورا عروج، جو اس کے عہد میں ہوا ہے، اس قابلیت اور اولوالعزمی کا بین ثبوت ہے۔

محمد قلی قطب شاہ ایسے وقت میں تخت نشیں ہوا تھا جبکہ دکن میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا اور دکن کے ہر گوشے میں تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی کیونکہ جنگ تالیکوٹ کے لیے دکن کی چار سلطنتوں میں جو اتحاد ہوا تھا وہ بہت دنوں تک قایم نہیں رہا، بلکہ جنگ کے عین بعد ہی اس کے پرخچے اُڑ گئے جو طاقتیں ابھی باہم متحد ہو کر اپنے مشترک دشمن وجیانگر کے مقابلے کے لیے گئی تھیں وہ اب آپس میں لڑنے لگیں۔ یہ دکن کے لیے بہت بُرا شگون تھا کہ جنگ سے واپس ہونے کے بعد دکن کے مشہور سورما، اور فاتح تالیکوٹ حسین نظام شاہ کا بہت جلد انتقال ہو گیا، یعنی "آفتاب دکن شد پنہاں"[1] اس کی بے وقت موت سے دکن کی بساط بالکل اُلٹ گئی اور پھر پُرانا نقش جم گیا جو جنگ سے پہلے تھا کیونکہ علی عادل شاہ اول، جو دکن کے تمام تلاطم کا تنہا ذمہ دار تھا، اپنی دست درازیوں کے لیے ابھی زندہ تھا، اور اس کے سامنے احمد نگر کی

جس کا نام بھاگ رتی بتایا جاتا ہے (ماہ نامہ)۔

[1] یہ حسین نظام شاہ کی وفات سے متعلق کہا گیا ہے، جس سے اس کی تاریخ وفات ۹۷۲ھ نکلتی ہے۔ جنگ تالیکوٹ کے صرف چار مہینے کے بعد اس کا انتقال ہوا ہے، یعنی یہ لڑائی جمادی الثانی میں ہوئی اور اس کی وفات ذیقعدہ میں واقع ہوئی۔

سلطنت جو اس کے حرص و آز کا ہمیشہ نشانہ بنی رہی ــ پہلے سے زیادہ کمزور ہوگئی تھی، کیونکہ اب اس کے تخت پر حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ کو بٹھایا گیا جو ایک نیم دیوانہ شخص تھا۔ اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کی ماں خونزہ ہمایوں حکومت کرتی تھی، اس طریقے سے ملک کی مدافعت بہت مشکل ہوگئی، اور علی عادل شاہ کی دست درازیوں کے لیے اچھے مواقع پیدا ہوگئے۔ معمولی بہانے سے اس نے احمد نگر پر وار شروع کر دیے جو ایک کھلی بد عہدی، اور بد اخلاقی تھی۔ اب احمد نگر کی کمزور حکومت کے لیے یہ ضروری تھا کہ اپنی مدافعت کے لیے حسب سابق گولکنڈے کو دعوت دے۔ خونزہ ہمایوں نے اپنے وزراء کے مشورے سے گولکنڈے سے مدد کی درخواست کی۔ ابراہیم قطب شاہ بیجاپور کی بد عہدی سے بہت برافروختہ ہوا، فوراً احمد نگر کی امداد کے لیے کولاس پہنچ گیا، کیونکہ دکن کے سیاسی توازن اور امن کے لیے احمد نگر کی امداد ضروری تھی، اور گولکنڈے کا ہمیشہ یہی مسلک رہا ہے۔ دونوں متحدہ فوجیں بیجاپور پر حملہ آور ہوگئیں۔ علی عادل شاہ اس صورت حال سے اس قدر خایف ہوا کہ مجبوراً صلح کرلی، کیونکہ اس متحدہ طاقت کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ حملہ آور بھی یہی چاہتے تھے کہ دکن میں امن قایم ہو نہ کہ بیجاپور کی تسخیر: اس لیے ان لوگوں نے صلح قبول کرلی اور واپس ہوگئے، لیکن علی عادل شاہ نے دوسرا گل کھلایا، اب اس نے گولکنڈے کے خلاف دل کا بخار نکالنا چاہا، کیونکہ یہ سلطنت اس کے راستوں میں مزاحم تھی اور اس کی وجہ سے علی عادل شاہ کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے۔ چونکہ گولکنڈے کا تنہا مقابلہ اس کے قابو سے باہر تھا، اس لیے اس مرتبہ اس نے احمد نگر کو دھوکہ دے کر اپنے ساتھ ہموار کرلیا، پہلے برار کی تسخیر کا سبز باغ دکھایا، اور اس کے بعد خود گولکنڈے پر فوج کشی کی تجویزیں ہوگئیں۔ مرتضیٰ نظام شاہ جو بیجاپور کی سیاسی جوڑ توڑ سمجھنے سے قاصر تھا، علی عادل شاہ کے دام میں آگیا، چنانچہ احمد نگر اور بیجاپور کی متحدہ فوجوں نے کاویل (برار) پر حملہ کر دیا۔ تفال خاں جو اس زمانے میں برار کے پرانے عماد شاہی خاندان کو بے دست و پا کر کے سلطنت کا مالک بن بیٹھا تھا، بہت پریشان ہوا، اور حملہ آوروں کو ہتے چڑھا کر برار سے ٹلانے کی کوشش کی۔ مختلف تحفے تحایف اور دل آویز مراسلت سے کام لے کر علی عادل شاہ کو فراہم کرلیا۔ اب رہا مرتضیٰ نظام شاہ، تو وہ علی عادل شاہ کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں حملہ آور برار سے واپس تو ہوگئے، لیکن

جنوب میں قطب شاہی سلطنت کا رُخ کیا، اور کولاس پہنچ گئے جو قطب شاہی شمالی حدود پر واقع تھا۔ لیکن ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس دوران میں عادل شاہی برگی فوج اور نظام شاہی فوج میں جھڑپ ہوگئی، اور یہ معاملہ بہت طول کھینچا، لیکن بعض ارباب سیاست کے بیچ بچاؤ سے یکسوئی تو ہوگئی لیکن قطب شاہی سلطنت پر حملہ ناممکن ہوگیا، اور یہ حملہ آور اس تلخی میں اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔

اگرچہ اس اتفاقی حادثے سے یہ حملہ ٹل گیا لیکن احمد نگر اور بیجاپور کا اتحاد نہ صرف تاریخ دکن کے لیے ایک نئی چیز تھی بلکہ اس سے دکن کے توازن کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ احمد نگر کی اس ناحق شناسی سے گولکنڈے کا دیرینہ مقصد خاک میں مل جاتا۔ اسی لیے ابراہیم قطب شاہ نے اس اتحاد کو توڑ کر پُرانا سیاسی نقشہ جمانے کی کوشش کی۔ مرتضےٰ کو سمجھایا گیا کہ علی عادل شاہ کا اتحاد ایک دام فریب سے زیادہ نہیں ہے اور اس میں سب کا نقصان ہے۔ گولکنڈے کی معقول سفارتیں جس طرح پہلے کامیاب ہوتی رہی ہیں اس موقعے پر بھی کامیاب ہوئیں، اور احمد نگر و گولکنڈے کا روایتی اتحاد قایم ہوگیا، اور یہ بھی طے ہوا کہ والیِ ویجیانگر ملتم راج کو اس اتحاد میں شریک کرکے بیجاپور کو سبق دینا چاہیے تاکہ وہ پھر دکن کے امن میں خلل نہ ڈال سکے۔ دریائے کرشنا پر تینوں حکمرانوں کی ملاقات ہوئی اور بیجاپور پر حملہ ہو جاتا، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ احمد نگر کے ایک غلط مسلک کی وجہ سے ملتم راج اتحاد میں شریک نہیں ہوسکا۔ اس کی ذمہ دار مرتضےٰ کی ماں خونزہ ہمایوں تھی اس نے ملتم راج سے دو لاکھ ہون نعل بہا طلب کیا، ملتم راج اس سے ناراض ہوگیا۔ ابراہیم نے مرتضےٰ اور خونزہ ہمایوں کو لاکھ سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان متحدین میں پھر کشیدگی ہوگئی۔ ابراہیم، ایلتم راج اپنے اپنے گھر واپس ہوگئے۔ لیکن احمد نگر کے ارباب سیاست کو یہ مشکل آن پڑی کہ جب یہ لوگ اپنے گھر واپس ہونے لگے تو راستے میں عادل شاہی فوجیں مزاحم ہونے لگیں، مرتضےٰ اور خونزہ ہمایوں بہت پریشان ہوئے۔ اب ان کے لیے صرف یہ چارہ کار تھا کہ دوسری طرف سے اپنا راستہ بنائیں، چنانچہ یہ کوئل کنڈہ اور گھنپورے کی طرف سے گزرے اور قطب شاہی حدود میں لوٹ مار شروع کردی، جو بڑی زیادتی تھی۔ اس سے احمد نگر اور گولکنڈے کے تعلقات اور زیادہ کشیدہ ہوگئے۔

ابراہیم قطب شاہ نے صلابت خاں اور مقرب خاں کو دو تین ہزار سوار کے ساتھ ان کی مزاحمت کے لیے بھیجا جس کی وجہ سے نظام شاہی فوج کو بہت نقصان پہنچا اور وہ میدان سے بھاگی۔

خود احمد نگر میں اس کے اعضائے سیاسی کی کشمکش کی وجہ سے بے اطمینانی پھیل گئی، خونزہ ہمایوں کو گرفتار کر لیا گیا، اور اس کے سب ہوا خواہ ملک سے باہر بھاگ گئے۔ علی عادل شاہ کے حرص و آز کے لیے پھر اچھا موقع پیدا ہو گیا۔ کیونکہ احمد نگر کی مرکزی حکومت کمزور تھی اور گولکنڈے سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء میں بیجاپور کی طرف سے کشور خاں لاری احمد نگر پر حملہ کرنے کے لیے آگیا، اور کوندھانہ اور دھارور کے قلعے فتح بھی کر لیے لیکن چنگیز خاں نے جو اس زمانے میں احمد نگر کا مشہور وزیر تھا حملہ آوروں کا پُر زور مقابلہ کیا اور کشور خاں کو تلوار کی گھاٹ اُتار دیا۔ عادل شاہی فوج بھاگ گئی لیکن علی عادل شاہ نے عین الملک اور ظریف الملک کی سرکردگی میں ایک اور تازہ دم فوج بھیج دی۔ اس فوج نے بڑی ادھم مچائی جو احمد نگر کے لیے بڑی پریشانی کا سامنا تھا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ گولکنڈے کی امداد کے بغیر یہ گتھی نہیں سلجھے گی چنانچہ گولکنڈے سے امداد کی درخواست کی گئی۔ اس زمانے میں ابراہیم قطب شاہ راج مندری اور قاسم کوٹہ وغیرہ کی فتوحات سے بہت طاقتور ہو گیا تھا، اور شمالی دکن کے حالات رو بہ راہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ فوراً امداد کے لیے احمد نگر پہنچ گیا۔ علی عادل شاہ کو سبق دینے کے لیے گولکنڈے اور احمد نگر کی متحدہ فوجیں بیجاپور پر حملہ آور ہو گئیں اور یہ اس قدر پُر زور حملہ تھا کہ علی عادل شاہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ غالباً حملہ آور بیجاپور کو مسخر کر لیتے لیکن مشکل یہ ہوئی کہ علی نے اپنے پیشوا، ابو الحسن ابن شاہ طاہر کو اس شبہ میں گرفتار کر دیا کہ حملہ آوروں سے کے ایما سے متحد ہوئے تھے، اور غالباً وہ قتل بھی ہو جاتا لیکن ابو الحسن کے ملک میں اکثر لوگ ہمدرد بھی تھے، منجملہ ان کے ایک سید مرتضٰے بھی تھا جو پہلے احمد نگر کا ملازم تھا، وہ مرتضٰے نظام شاہ کے پاس دوڑا آیا، اور درخواست کی کہ خدا کے واسطے صلح کر لیجیے ورنہ ابو الحسن کا خاتمہ ہو جائے گا، اگر شرط صلح ابو الحسن کی رہائی قرار دی جائے تو بہت اچھا ہے۔ مرتضٰے نظام شاہ راضی ہو گیا اور صلح کے ساتھ ابو الحسن بھی رہا ہو کر مرتضٰے نظام شاہ کے پاس آگیا۔ مرتضٰے نظام شاہ کے اس طرز عمل سے گولکنڈے کو ایک نقصان تو

پہنچا تھا لیکن اس پر طرہ یہ ہوا کہ علی عادل شاہ نے سید مرتضیٰ کے توسط سے ایک اور ہتھکنڈہ یہ اختیار کیا کہ مرتضیٰ نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ میں پھوٹ ڈال دی۔ مرتضیٰ کی بے وقوفی سے ابراہیم کے تمام منصوبے بے کار ہو گئے، وہ اس واقعے سے دلگیر ہو کر بیدر کے راستے گولکنڈہ پہنچ گیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ کی بار بار بدعہدی کی وجہ سے دکن کے معاملے کو جو نقصان پہنچ رہا تھا، اس سے ابراہیم بہت متاثر تھا، اور اس نے بالآخر یہ کوشش کی کہ اب بجائے بیجاپور کو پریشان کرنے کے احمد نگر کو سبق دینا چاہیے۔ اس کے لیے اس نے ایک بڑا اتحاد کر لیا جس میں تفال خاں والی برار، اور برید والی بیدر شریک ہو گئے اور علی عادل شاہ کو بھی دعوت دی گئی جو گولکنڈے کے لیے نئی چیز تھی اور ان حالات میں ناگزیر سمجھی گئی۔ یہ اتحاد احمد نگر کے لیے بہت خوفناک تھا۔ مرتضیٰ سخت پریشان ہوا اب اس کے لیے ایک ہی چارۂ کار تھا، یعنی علی عادل شاہ کو اس اتحاد سے جدا کرے۔ چنانچہ احمد نگر کے وزیر چنگیز خاں نے یہی کیا، مختلف ترغیبوں سے علی کو اس اتحاد سے علٰحدہ کیا گیا۔ علی کی اس بدعہدی سے گولکنڈے کے منصوبے کو پھر نقصان پہنچا۔ برید اور ابراہیم جو احمد نگر پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے، واپس ہو گئے لیکن علی عادل شاہ اور مرتضیٰ نظام شاہ نے متحدہ طور پر تلنگانے پر حملہ کر دیا، جو علی کا پرانا منصوبہ تھا، مگر گولکنڈے میں قوت مدافعت بہت تھی، قطب شاہی فوجوں نے ایسا دل کھول کر مقابلہ کیا کہ حملہ آور ہار مان گئے اور پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ یہ واپس تو ہو گئے لیکن انھیں یہ ڈر رہا کہ مبادا ابراہیم احمد نگر اور بیجاپور پر حملہ نہ کر دے، جاتے ہوئے کولاس کی سرحد پر تیس ہزار کی فوجیں چھوڑ دیں تاکہ اگر حملہ ہو تو بروقت مزاحمت ہو سکے۔ لیکن یہ فوجیں خاموش نہیں رہیں بلکہ قطب شاہی حدود میں شورش کرنے لگیں۔ ابراہیم نے ان کی سرکوبی کے لیے امیر شاہ محمد انجو، اور مرزا حسین بیگ ترکمان کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بھیج دی۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی اور اس میں دشمن کا بہت نقصان ہوا، اور وہ بھاگ گئے۔ اس اثنا میں مرتضیٰ نظام شاہ نے برار فتح کر کے اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تھا، لیکن علی برید کی ریشہ دوانیوں سے اس کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ برار سے فارغ ہونے کے بعد مرتضیٰ نے بیدر پر حملہ کرنا چاہا لیکن یہ کام بغیر گولکنڈے کی امداد کے نہیں ہو سکتا تھا۔ گولکنڈے سے پھر

مدد کی درخواست کی۔ میر ابوالقاسم کو سفیر بنا کر بھیجا چونکہ ابراہیم قطب شاہ کا نصب العین دکن کا توازن قایم کرنا تھا، اس لیے باوجود ان ناگوار واقعات کے جو اب تک ہوتے رہے اس نے احمد نگر کی دعوت قبول کر لی، اور امیر شاہ میر کی سرکردگی میں ایک فوج مرتضےٰ کی امداد کے لیے بھیج دی۔ بیدر پر حملہ تو ہوا مگر علی عادل شاہ کی امداد کی وجہ سے جو بیدر کے لیے بیجاپور سے بھیجی گئی تھی حملہ آور ناکام ہو گئے۔

لیکن علی عادل شاہ اول کے انتقال کی وجہ سے جو ۹۸۸ھ میں ہوا، دکن کے حالات بالکل بدل گئے۔ علی عادل شاہ کو اولاد نہیں تھی، اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی اس کی جگہ تخت پر بٹھایا گیا جو جنگ وجدل سے زیادہ خاموش ترقی کا قائل تھا۔ اگرچہ چند روز تک اس نے اپنے چچا کی تقلید جاری رکھی اور ملک کی مدافعت کی، لیکن اس کے صلح کُل مسلک کی وجہ سے دکن کے سیاہ بادل بہت جلد چھٹ گئے چونکہ علی عادل شاہ مرحوم نے علی برید کی مدد کی تھی، اس لیے مرتضےٰ بیجاپور سے انتقام لینا چاہتا تھا، اور اس کا یہ ارادہ بیجاپور کو بھی معلوم ہو گیا تو اپنے ارباب سیاست کے مشورے سے ابراہیم عادل شاہ نے بیش از پیش احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ شاہ درگ پر لڑائی ہوئی۔ احمد نگر کی طرف سے بہزاد الملک نے مدافعت کی، لیکن اس کو شکست ہو گئی۔ ایک روایت یہ ہے کہ بہزاد الملک نے جلدی کر کے بیجاپور پر دھاوا بول دیا، اور بیدر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس کو جب شکست ہو گئی تو گولکنڈے سے امیر شاہ میر کے تحت امدادی فوج آگئی اور ان فوجوں نے قلعۂ نلدرگ کا محاصرہ کر لیا۔ اس دار و گیر میں مرتضےٰ کا بہت نقصان ہوا۔ اگرچہ عادل شاہیوں کو شکست ہو گئی لیکن قلعے کی محصور فوج کو مغلوب کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اس لیے یہ حملہ آور راتوں رات بیجاپور پہنچ گئے اور مرکز پر حملہ کر دیا۔ جو بیجاپوری فوج نلدرگ پر تھی وہ بھی مدافعت کے لیے بیجاپور آگئی، یہاں کئی روز تک لڑائی ہوئی۔ اس دوران میں گولکنڈے کے ایک دوسرے جنرل امیر زنبیل نے ناکاوی، کاکن اور رکلکور مسخر کر لیے جو بیجاپور کے مقبوضات تھے۔ اس سے بیجاپوری فوج زیادہ پریشان ہوئی اور ممکن تھا کہ حملہ آور خود بیجاپور کو مسخر کر لیتے لیکن قطب شاہی سپہ سالاروں کی نااتفاقی اور بیجاپور کے ہتھکنڈوں سے معاملہ

عراب ہوا، اور حملہ آوروں کو بیجاپور چھوڑنا پڑا۔ یہ پھر نلدرگ آگئے اور قلعے کا محاصرہ کرلیا چونکہ محاصرہ بہت سخت تھا اس لیے امیر شاہ میر نے خود بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ محاصرے بینے آئے تو اچھا ہے لیکن عین اسی زمانے میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوگیا تھا، اور اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ سریر آرائے سلطنت تھا۔

قطب شاہی اور نظام شاہی کیمپ کے لیے ابراہیم قطب شاہ کی موت کی خبر سنسنی خیز تھی لیکن امیر شاہ میر نے بہت روز تک یہ خبر چھپائے رکھی۔ اس خبر کے افشا سے پہلے اس نے نظام شاہی اور قطب شاہی تمام ارکان سپاہ کو جن میں سید مرتضےٰ، جمشید خاں۔ خداوند خاں، بہزاد الملک تھے جمع کرکے ایک مجلس کی اور ایمان کی قسم دی تاکہ ان کے منصوبے میں کوئی فرق نہ آئے۔ ادھر گولکنڈے کے نوجوان بادشاہ نے بھی اپنے باپ کے منصوبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ مرتضےٰ نظام شاہ کی طرف سے مرحوم بادشاہ کی تعزیت اور نئے بادشاہ کی کیفیت کے لیے میر معین میرک سبزواری آیا اور اتحاد کی دعوت دی تو اس کا پورا خیر مقدم کیا گیا، اور اس کے ساتھ امیر شاہ میر نے بھی دربار میں آکر قلعہ نلدرگ اور اس کے محاصرے کی صورت حال بیان کی تو بادشاہ فوراً نلدرگ کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا، اور "مایہ پرایت" روانہ ہوئے۔ نوجوان بادشاہ کی آمد سے محاصرین میں بڑی تقویت پیدا ہوگئی۔ قطب شاہی توپیں محمدی و حیدری اور نظام شاہی، لوگزی اور لیلیٰ مجنوں نصب کی گئیں اور محاصرہ بہت سخت ہوگیا۔ قلعہ دار وزیر الملک اور تمام اہل قلعہ بہت پریشان ہوگئے اور بیجاپور کو اطلاع دی گئی۔

ابراہیم عادل شاہ کا صلح کل مسلک اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ خواہ مخواہ خونریزی ہو۔ اس نے فوراً حملہ آوروں سے صلح کی درخواست کی۔ حملہ آوروں نے بھی دکن کے امن کے لیے یہ صلح منظور کرلی تاکہ خانہ جنگی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔ اور لڑائی کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایسی دست دراز مملکتوں کو سبق دے کر جو امن میں خلل ڈالتی ہیں، خانہ جنگی کا راستہ بند کیا جائے۔ یہ سیاسی توازن ابراہیم قطب شاہ کا دیرینہ نصب العین تھا جو اس کی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے مرنے کے بعد پورا ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ علی عادل شاہ کے ہوتے ہوئے جس کی ناجائز حرص و آز نے دکن کو پُر آشوب بنا رکھا تھا، یہ توازن پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے جانشین کی صلح جو طبیعت نے بالآخر یہ گتھیاں سلجھا دیں اور گولکنڈے کا پاکیزہ نصب العین جس کے لیے اس نے ہمیشہ کوشش کی اور ہر دست درازی کا جواب دیا، بالآخر پورا

ہوگیا۔ اس وقت جو سیاسی فضا خاموش ہوئی تو بہت زمانے تک اس میں رخنہ نہیں پڑا گو ایک زمانے کے بعد بیجاپور اور احمد نگر میں کچھ لڑائیاں ضرور ہوئیں لیکن وہ بہت مختصر ہوئی تھیں اور ان سے دکن کی پوری فضا متلاطم نہیں ہوئی۔[1] گولکنڈے سے تو کبھی بیر خاش نہیں ہوئی اور گولکنڈے سے اتحاد کو مضبوط کرنے کے لیے ابراہیم عادل شاہ نے محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطان سے شادی کرلی جو ۹۹۵ھ ۱۵۸۶ء میں رچائی گئی تھی، اور ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کی مرتضےٰ نظام شاہ کے بیٹے میراں حسین سے شادی کی گئی۔ اس ساکت فضا کی وجہ سے ان سلطنتوں کو خاموشی کے ساتھ ارتقائے تمدن کا موقع ملا چنانچہ گیارھویں صدی ہجری یا سولھویں صدی عیسوی کا نصف اول ان سلطنتوں کے تمدنی عروج کا زمانہ ہے۔

[1] فرشتہ کہتا ہے صلح سے لیکر تاریخ تحریر تک کوئی بیس سال ہوتے ہیں کہ دکن میں کوئی ہنگامہ جنگی نہیں ہوئی (تاریخ فرشتہ روضۂ چہارم صفحہ ۲۷۱)۔ ٹلدرک کی آخری لڑائی کے متعلق فرشتے کا بیان بہت مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے شاہ درگ اور شولاپور پر حملے کیے تھے اور پھر بیجاپور پر حملہ کیا تھا۔

دسواں باب

دکن پر مغلوں کے حملے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ وجیا نگر کے خاتمے کے بیس پچیس سال کے بعد دکن کو ایک اور بڑی طاقت سے دوچار ہونا پڑا، اور یہ مغلوں کی طاقت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وجیا نگر کا سیلاب جنوب سے آتا تھا تو اس کے برخلاف مغل شمال کی طرف سے گھس آئے۔ دکن کے حکمران ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں وجیا نگر کا خاتمہ کرکے بے فکر ہو گئے تھے اور انھیں بالکل نہیں معلوم تھا کہ چند سال کے بعد انھیں شمال کی ایک بڑی طاقت کا سامنا کرنا پڑے گا عین اسی زمانے میں جبکہ وجیا نگر کا خاتمہ ہوا ہے مغل سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء والی پانی پت سے مغلوں کے ہندوستان میں پھر ایسے قدم جم گئے کہ اب کوئی طاقت انھیں متزلزل نہیں کر سکتی تھی جنگ پانی پت کے بعد مالوہ بنگالہ۔ گجرات۔ راجپوتانہ۔ کشمیر۔ قندھار، اور کابل فتح ہو گئے چنانچہ ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء تک مغل سلطنت تمام شمالی ہند پر چھا گئی۔ اس کے بعد اس کو دکن کی ہمسر سلطنتوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع تھا چنانچہ ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء سے شہنشاہ اکبر نے دکن کے مسئلے پر دل سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ اس مغل پیشقدمی کا باعث خود شہنشاہ کا سیاسی نصب العین تھا کہ وہ تمام ہندوستان کی شیرازہ بندی کرکے ایک متحدہ سلطنت قایم کرنا چاہتا تھا، لیکن دکن کے ناگوار حالات بھی خود بخود اس کے محرک ہو گئے۔ یعنی آپس کی ناچاقی کی وجہ سے دکن کے بعض حکمرانوں نے خود شہنشاہ اکبر کو دعوت دی اور شہنشاہ حملہ کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

جس زمانے میں احمد نگر کی فوجیں برار کی تسخیر کے لیے آگے بڑھنے لگیں تو تفال خاں نے جو برار کا والی

جن بیٹھا تھا شہنشاہ اکبر سے امداد کی درخواست کی تھی اور شہنشاہ نے مرتضےٰ نظام شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ برار سے اپنی فوجیں ہٹالیں، چونکہ یہ دُور کی دھمکی تھی اس لیے مرتضےٰ نے اس کی پرواہ نہ کی اور ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں برار پر قبضہ کر ہی لیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اس سے ناراض ہوا، کوئی فوجی نقل وحرکت تو نہیں کی لیکن شکار کے بہانے سے ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں وندھیاچل کے پہاڑوں کے نیچے شمالی دکن کی سیر کی۔ غالباً اس سے منشا یہ تھا کہ دکن کے حالات دریافت کرے اور سلاطین دکن کو خوف دلائے۔ اس کے بعد ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں احمدنگر کی خانہ جنگی سے دکن کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ مرتضےٰ نظام شاہ کے بھائی برہان نے بغاوت کی اور جب وہ اپنی بغاوت میں ناکام ہوا تو، پہلے کوکن بھاگا اور پھر شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے احمدنگر کے اکثر عمائد جیسے فتح اللہ شیرازی اور ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں سید مرتضےٰ خاں سبزواری اور خداوند خاں بھی اکبر کے دربار میں آگئے اور وہاں ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور خطاب وانعام ملے۔ اور برہان کی امداد کے لیے اکبر نے مالوے کے گورنر مرزا عزیز کوکہ کو حکم دیا تھا کہ وہ احمدنگر پر حملہ کرے۔ لیکن یہ حملہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔

لیکن دو سال کے بعد احمدنگر کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ مرتضےٰ نظام شاہ کی دیوانہ وار حرکتوں کی وجہ سے ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں اس کا خاتمہ کر دیا گیا اور اکابر ملک نے اس کے بھائی حسین کو حسین نظام شاہ ثانی کے نام سے تخت نشین کر دیا، وہ بھی بہت جلد یعنی صرف دس مہینوں کی حکومت کے بعد طبقہ وارانہ کشمکش کا شکار ہو گیا۔ اب چونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اہلِ ملک نے برہان کے بیٹے اسمٰعیل کو ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں تخت نشین کر دیا، کیونکہ برہان اکبر کے دربار میں تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات کے مدِ نظر شہنشاہ نے یہ چاہا کہ برہان کو جو اس کے دربار میں تھا ایک مغل فوج کے ساتھ احمدنگر بھیجے اور اس کو احمدنگر کے تخت پر بٹھادے۔ گو بہ ظاہر یہ شہنشاہ کی نوازش تھی، لیکن اس کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ احمدنگر مغل سیادت کے تحت آجائے لیکن برہان اس ہتھکنڈے کو سمجھتا تھا۔ اس نے شہنشاہ کو یہ سمجھایا کہ مغل فوج احمدنگر لے جانا مصلحت کے خلاف ہے اس سے اہلِ دکن ناراض ہو جائیں گے، بلکہ میں خود اپنے دست و بازو سے تخت حاصل کرتا ہوں جب ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء میں یہ احمدنگر آیا تو اکابر ملک نے اس کا

خیر مقدم کیا، اور تخت پر بٹھا دیا۔

احمد نگر میں برہان نظام شاہ کی تخت نشینی مغل فوج کشی کا پیغام تھا کیونکہ برہان نے تخت حاصل کرنے کے بعد اکبر کی سیادت تسلیم نہیں کی بلکہ مغل سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رکھا جو شہنشاہ کے منشا کے خلاف تھا شہنشاہ اس وجہ سے بھی زیادہ برافروختہ ہوئے کہ برہان بادشاہ ہونے سے قبل مغل سلطنت کا ملازم و جاگیردار ہو گیا تھا اور اس کو مغل شہنشاہت کا پاس رکھنا چاہیے تھا اس کی اس حرکت کو شہنشاہ بغاوت سمجھتے تھے، اس سے متاثر ہو کر شہنشاہ نے دکن پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانے میں جبکہ گولکنڈے میں شہر حیدرآباد کی بنیاد پڑ رہی تھی شمال میں تسخیر دکن کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ اپنے اصول کے مطابق شہنشاہ نے حملے سے پہلے ۹۹۹ھ ۱۵۹۱ء میں چاروں والیان دکن کے نام اپنے سفیروں کے ذریعے اطاعت کے پیغام بھیجے۔ سوائے والیِ خاندیش راجہ علی خاں کے باقی تین[۲] سلطنتوں یعنی احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈے نے اطاعت سے انکار کر دیا۔ بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں تو جنوب میں تھیں اور شمالی سلطنت احمد نگر کے ہوتے ہوئے اُن کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ جب تک احمد نگر کی سلطنت کا خاتمہ نہ ہو جاتا بیجاپور اور گولکنڈے پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والیِ گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ نے اس سیاسی حالت کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ گولکنڈے میں جو مغل سفیر آیا تھا وہ مرزا مسعود یا ابوالفضل کے الفاظ میں "میر منیر" ہے، اس کی آؤ بھگت تو بہت کی گئی لیکن جب اطاعت کا سوال ہوا تو غالباً اس کو صاف جواب دے دیا گیا چنانچہ ابوالفضل نے "میر منیر" سے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ :-

"میر منیر کہ بہ انداز گوئی مرزبان گلکنڈہ دستوری یافتہ بود بہ ایلچی و پیشکش رسید"[ا] یعنی اس کو کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ بیجاپور اور احمد نگر کے درباروں سے بھی مغل سفیر میر محمد رضوی اور فیضی بالکل اسی طرح بے نیل مرام واپس ہو گئے جس طرح

[ا]۔ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۶۴۸۔ تاریخ قطب شاہی میں اس واقعہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو سرسری سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔

گولکنڈے سے آئے تھے تو شہنشاہ اکبر نے پھر دکن پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کردی اگرچہ یہ تیاری بہت جلد بارور نہیں ہوئی سفیر تو دو سال کے بعد یعنی ۱۰۰۰ھ ۱۵۹۱ء میں شہنشاہی دربار میں واپس آگئے اور شہنشاہ کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کردی اور رپورٹ پیش ہوتے ہی اعلان جنگ کردیا گیا لیکن فوج کی واقعی نقل وحرکت اور تین سال کے بعد ہوئی۔ چنانچہ مغلوں کا پہلا حملہ جو احمد نگر پر ہوا وہ ۱۰۰۳ھ ۱۵۹۵ء میں ہوا۔

چاند بی بی کا زمانہ

جس وقت مغل فوجیں احمد نگر کے سامنے آگئیں تو اس ملک کی سیاسی حالت بہت حوصلہ شکن ہوگئی تھی برہان ثانی کے انتقال کے بعد جو ۱۰۰۳ھ میں ہوا اس بدبخت سلطنت کا کوئی رہنمائے سیاست ایسا نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا چھوٹے بچے تخت نشین کیے گئے یعنی برہان کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بیٹے ابراہیم کو تخت نشین کیا گیا، لیکن بدقسمتی سے اسی سال یہ بیجاپور کی لڑائی میں مارا گیا۔ ایک فریق نے جس کا سرگروہ اخلاص خاں تھا ابراہیم کے چھوٹے بیٹے بہادر کو تخت نشین کرنا چاہا لیکن اس کے برخلاف دوسرے فریق نے جس کا سرغنہ ابراہیم کا پیشوا میاں منجھو تھا احمد نامی ایک اور لڑکے کو بادشاہ بنانا چاہا۔ دونوں فریقوں میں خانہ جنگی ہوگئی جب میاں منجھو نے دیکھا کہ اخلاص خاں کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں چلتی تو اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے شہزادہ مراد کو حملے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں مغل فوجیں شہزادہ مراد عبدالرحیم خانخاناں اور شاہرخ مرزا کے تحت حملے کے لیے جمع ہورہی تھیں اور یہ احمد نگر کے سامنے پہنچ گئیں جو اس بدبخت ملک کے لیے بہت افسوسناک واقعہ تھا ان حملہ آوروں کے آنے سے ان باغیوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں جنھوں نے دشمنوں کو بلایا تھا اب ہر طبقہ احمد نگر کو دشمنوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگا چونکہ اس وقت ملک میں کوئی ناخدائے سیاست ایسا نہیں تھا جو ملک کی رہنمائی کرتا، اس لیے سب طبقوں نے برہان نظام شاہ ثانی کی بہن چاند بی بی کو جو بیجاپور میں تھی، احمد نگر کی امداد کے لیے بلایا، اس ہیروئن نے اپنے وطن مالوف کو دشمنوں سے بچانا اپنا فرض سمجھا، اور فوراً بیجاپور سے احمد نگر کو بچانے کے لیے دوڑی آئی۔ بیجاپور اور گولکنڈے کے حکمران بھی اس نازک صورتِ حال کو خوب محسوس کرتے تھے ان کی بقا احمد نگر کی سلامتی پر منحصر تھی، جب چاند بی بی نے شہزادہ مراد کے مقابلے میں نظام شاہی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تو

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اس کی امداد کے لیے اپنی فوج بھیجی تو گولکنڈے کے والی محمد قلی قطب شاہ نے بھی اپنی پوری ذمہ داری محسوس کی اور چاند بی بی کی مدد کے لیے قطب شاہی فوج بھیجی۔ تاریخ کے الفاظ میں:۔

"چوں شہزادہ مراد فرزند ارجمند اکبر پادشاہ وخانخاناں بہ جہت تسخیر ولایت احمدنگر
بالشکر بیحد و عدد توجہ نمود فتنہ وشور درآں بلاد انداختہ خسرو زماں مہدی قلی سلطان را
بہ امراء و خوانین ولشکر فراواں بہ جہت امداد سلسلۂ نظام شاہیہ نامزد فرمود"[1]

یعنی مہدی قلی کے تحت جو گولکنڈے کا جنرل تھا چاند بی بی کی امداد کے لیے ایک بڑی فوج آئی۔ چاند بی بی کی مشہور آفاق دلاوری اور اس متحدہ امداد کا نتیجہ تھا کہ مغل احمدنگر کی تسخیر میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ صرف برار لینے پر اکتفا کر کے صلح کر لی اور بہادر نظام شاہ کی بادشاہی تسلیم کر لی۔

لیکن یہ صلح دائمی ثابت نہیں ہوئی، بلکہ اس کے دو سال کے بعد ۱۵۹۷ء میں پھر شہزادہ مراد اور خانخاناں نے احمدنگر کے علاقے میں دھاوا بول دیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے سوپہ کے مقام پر ایک بڑی لڑائی ہوئی، لیکن اس موقعے پر بھی بیجاپور اور گولکنڈے نے دل کھول کر مدد کی۔ بیجاپور کی طرف سے سہیل خاں، عادل شاہی فوج کے ساتھ آیا تھا تو گولکنڈے کی طرف سے اخلاص خاں اور طاہر خاں ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے تھے چنانچہ اس معرکے میں جب دکنی فوجوں کی صف آرائی ہوئی تو پرانے دستور کے مطابق نظام شاہی فوجوں کو بیچ میں رکھا گیا تھا، اور میمنہ پر بیجاپوری، و میسرہ پر قطب شاہی فوجیں تھیں۔ یہ بھی بڑا سخت معرکہ تھا[2]۔ اگرچہ اس معرکے میں دکنی فوجوں کو پوری شکست ہوئی، لیکن مغلوں کا بھی بڑا نقصان ہوا۔ دو سال کے بعد خود شہنشاہ اکبر نے دکن کی تسخیر کے لیے کوچ کر دیا۔ فوج کے دو حصے کیے، ایک حصے کی کمان خود شہنشاہ نے اپنے ہاتھ لی اور قلعۂ اسیرگڈھ کا محاصرہ

[1] حدیقۃ عالم مقالہ اول ص ۲۳۴۔

[2] اکبرنامہ جلد سوم ص ۷۱۸-۷۱۹۔

کرلیا کیونکہ والیِ خاندیش راجہ علی خاں کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ مغل سلطنت سے منحرف ہوگیا تھا۔ اور فوج کا دوسرا حصہ شہزادہ دانیال کے تحت احمد نگر پر وار کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ ۱۶۰۰ء میں احمد نگر کا دوسرا محاصرہ ہوا۔ ملک کی طبقہ واری کشمکش کی وجہ سے چاند بی بی اس قدر بے بس ہوگئی تھی کہ اب وہ مدافعت سے قاصر تھی، لیکن اس کی قومی خودداری اس بات کو گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ اس کے جیتے جی احمد نگر دشمن کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس لیے اس نے قلعہ فتح ہونے سے پہلے خودکشی کرلی اور قلعۂ احمد نگر پر مغل فوجوں نے قبضہ کرلیا۔ اس کے ایک سال کے بعد ۱۶۰۱ء میں برہان پور، اور اسیر گڈھ بھی مغل سلطنت کے قبضے میں آ گئے۔

ملک عنبر کا زمانہ

چاند بی بی کے انتقال کے بعد جو ۱۶۰۰ء میں ہوا، دکن پر سخت مایوسی چھا گئی۔ کیونکہ اب اقتدار دکن کا کوئی پشت پناہ نہیں تھا۔ وہ دن دور نہیں تھے کہ دکن مغل یورشوں کا پوری طور پر شکار ہوجاتا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی سرزمین دکن سے چاند بی بی کے کئی نام لیوا پیدا ہوگئے جو اس کے مقدس منصوبے کو پورا کرسکتے تھے۔ اگرچہ چاند بی بی دنیا سے رخصت ہوگئی تھی لیکن اس کی جیتی جاگتی روح دکن کے ہر گوشے میں گھومتی تھی۔ اسی کے نقش قدم پر ملک عنبر کی صورت میں دکن کا ایک اور شفیع پیدا ہوگیا جس نے اپنی زندگی بھر دکن کی آزادی قایم رکھی۔ اس نے نظام شاہی خاندان کے ایک سپوت کو جس کا نام مرتضےٰ نظام شاہ ثانی تھا قلعۂ دولت آباد میں تخت نشیں کرکے نہ صرف احمد نگر کی مردہ سلطنت میں جان ڈال دی، بلکہ احمد نگر کے بل بوتے پر تمام دکن کی آزادی قایم رکھی۔ اس طریقے سے یہ چاند بی بی کی طرح نہ صرف احمد نگر بلکہ تمام دکن کی پشت پناہ تھا۔ اس نے اپنے خاص نظم ونسق سے ملک کو سنوارا، اور شہر وقصبات آباد کیے۔ اس کے علاوہ مرہٹوں کی نئی فوجیں مرتب کرکے رہے سہے نظام شاہی علاقوں کی نگہداشت کی اور کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت شروع کردی، اور اس کے سب سے مغلوں کی شہنشاہی قوت کا مقابلہ تھا۔ شہنشاہ اکبر کے انتقال کے بعد جو ۱۶۰۵ء میں ہوا، اس کے جانشین جہانگیر نے اپنے نامور افسروں کے تحت ملک عنبر کے مقابلے کے لیے فوجیں بھیجیں۔ شہزادہ پرویز۔ آصف خاں۔ خان جہاں لودی۔ عبداللہ خاں۔ مہابت خاں یکے بعد دیگرے آئے لیکن ملک عنبر نے سب کو ایسی شکستیں دیں کہ سب ہار مان گئے۔ اگرچہ

یہ تمام لڑائیاں براہ راست احمد نگر سے تھیں لیکن بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں بھی ان سے متاثر ہوئیں۔ کیونکہ ان کی بقا احمد نگر اور ملک عنبر کی ذات سے وابستہ تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سلطنتوں نے چپکے چپکے ملک عنبر کی مدد کی تھی۔ بیجاپور کی امداد تو صاف معلوم ہوتی ہے، لیکن قراین یہ ہیں کہ گولکنڈے سے بھی امداد کی گئی جب تک محمد قلی قطب شاہ زندہ تھا اس نے پوری مدد کی، اس کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ جو ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۲ء میں تخت نشین ہوا تھا، اس سیاست سے بے خبر نہیں رہا۔ اس نے بھی اپنے چچا کی طرح سیاست دکن کی کامیاب رہنمائی کی اور ملک عنبر کی مدد کے لیے روپیہ اور فوجیں بھیجیں، غالباً یہ سید کمال الدین کے تحت گئی تھیں جو اس زمانے میں گولکنڈے کا سرلشکر تھا۔

ملک عنبر کے دارو گیر میں دو موقعے ایسے آئے تھے جبکہ اس کو ہتھیار ڈالنے پڑے کیونکہ تمام مغل جنرلوں سے مایوس ہو کر شہنشاہ جہانگیر نے بالاخر اپنے بیٹے شہزادہ خرم (شاہجہاں) کو دکن بھیجا تھا تاکہ دکنی طاقتوں کا پُرزور مقابلہ کرے۔ یہ ۱۰۲۶ھ ۱۶۱۷ء اور ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۲ء کے واقعات ہیں۔ ملک عنبر کو ان مقابلوں کی تاب نہ تھی جب وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تو گولکنڈے اور بیجاپور پر بھی اس کا اثر پڑا چنانچہ ان سلطنتوں نے اپنے بچاؤ کے لیے شہزادہ خرم کی خدمت میں کئی تحفے اور نذرانے پیش کیے۔ ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۱ء کے صلح نامے کی رو سے دکنی سلطنتوں پر خراج عاید کیا گیا منجملہ اس کے بیس لاکھ روپیہ گولکنڈے پر عاید کیے گئے جو نسبتہً زیادہ تھے، کیونکہ بیجاپور سے اٹھارہ لاکھ اور احمد نگر سے صرف بارہ لاکھ لیے گئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد نامے کی کبھی پابندی نہیں ہوئی کیونکہ اس کے ایک سال بعد ہی کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ مغل شہنشاہت میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ شہزادہ خرم نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کردی اور اس کی سرکوبی کے لیے مغل سلطنت کا مشہور جنرل مہابت خاں مامور ہوا۔ جب خرم کو شکست ہوگئی تو وہ بھاگ کر دکن آیا گولکنڈے کے شمالی حدود میں داخل ہو کر سلطنت محمد قطب شاہ سے مدد مانگی۔ یہ ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۴ء کا واقعہ ہے کہ ایک مغل شہزادہ پہلی مرتبہ گولکنڈے کے حدود میں آیا تھا، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ وہی خُرّم جو ایک سال پہلے فاتحانہ شان سے دکن آیا تھا، اب ایک بے پناہ مظلوم کی حالت میں تھا۔ اب مشکل یہ تھی کہ خُرّم کی مدد کرنا تمام مغل سلطنت کو دشمن بنانا تھا، کیونکہ جو مغل فوجیں خُرّم کا پیچھا کر رہی تھیں وہ گولکنڈے پر ٹوٹ پڑتیں۔ اس لیے سلطان محمد قطب شاہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ بظاہر تو اس نے مدد دینے سے انکار کردیا، مگر خفیہ طور پر

کچھ غلہ اور روپیہ سے مدد کر کے شہزادے کو رخصت کر دیا۔ لیکن خرم کو جب بنگال میں ناکامی ہوئی تو پھر وہ گولکنڈے کے حدود میں آیا اور مدد طلب کی لیکن سلطان محمد قطب شاہ کی ہوشیاری سے یہ بلا ٹل گئی۔

یہ واقعات اس عہد کے سیاسی بست وکشاد کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے کی سلطنت دکن کی مجموعی سیاست سے بے خبر نہ تھی بلکہ ہر نازک موقعے پر اپنے شعور سیاست کا ثبوت دیتی تھی، اور سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ اپنے زمانے کے باخبر سیاس تھے۔ ان کو ملک عنبر کی ہر فوجی نقل وحرکت کی خبر تھی اور وقتاً فوقتاً اس کی مدد کرتے تھے۔

گیارھواں باب

سلطنت کی توسیع و ترقی

مغل یورشوں کی روک تھام اور آزادیِ دکن کی حفاظت گولکنڈے کا ہمیشہ مطمح نظر رہا تھا جو ہم گذشتہ باب میں دیکھ آئے ہیں۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کی وسیع نظر سلطنت گولکنڈہ کے چاروں گوشوں پر بھی پڑتی تھی۔ اس نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ مرکز کی طرح اس کے دُور دراز حدودِ سلطنت بھی مستحکم اور محفوظ رہیں۔ جنوب اور جنوب مشرق میں اس سلطنت کے حدود دریائے تنگبھدرا سے اور شمال مشرق میں دریائے گوداوری سے ملتے تھے۔ بیرونی حملوں کی مدافعت کے لیے ان سرحدوں پر جرار فوجیں متعین تھیں۔ دریائے گوداوری پر راج مندری ایک بڑا فوجی مستقر تھا، اور اس کے بعد مرتضےٰ نگر (گنٹور) مشرقی چھاؤنی تھی، اور جب ضرورت ہوتی تھی تو ان چھاؤنیوں سے فوجوں کی نقل و حرکت عمل میں آتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ قطب شاہی سلطنت کو اس زمانے میں جنوبی اور مشرقی طاقتوں کی مزاحمت کرنی پڑتی تھی، کیونکہ گو جنگ تالیکوٹہ سے ویجیانگر کا خاتمہ تو ہوچکا تھا لیکن رام راج کے بھائی تِلّم راج اور وینکٹ پتی ابھی باقی تھے جو کرناٹک کے چند محدود علاقوں پر قابض تھے اور یہ کبھی کبھی انگڑائی لیتے تھے۔ ان کی کئی مرتبہ سرکوبی کرنی پڑی۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سب سے پہلے علی خاں لر کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ یہ شخص گنٹور کی فوجوں کا سپہ سالار تھا، سلطنت سے بغاوت کرکے ویجیانگر کی طاقتوں کو اپنی امداد کے لیے طلب کیا۔ اس کی خاطر خواہ سرکوبی تو ہوگئی لیکن رائے ویجیانگر وینکٹ پتی کو آیندہ حملہ کرنے کی بہت جُراءت ہوگئی اور وہ پیشقدمی کا سامان کرنے لگا۔ محمد قلی نے اس کے استیصال کے لیے کرناٹک پر کئی حملے کر دیے۔ اس وقت وہ سلطنت کے نظم و نسق سے فارغ ہوگیا تھا۔ فوج کی خود

رہنمائی کی۔ ایک حملے میں اس نے قلعۂ موسلمورک، نندیال اور رکلکور فتح کرلیے اسی دوران میں امین الملک جو سلطنت کا میر جملہ تھا کندی کوٹہ کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا، اس کا محاصرہ ہوا، چند روز کے بعد خود بادشاہ بھی یہاں آگیا، یہ قلعہ رام راج کے بھانجے نرسم راج کے زیر نگیں تھا، اس نے معافی چاہی لیکن وینکٹ پتی قلعۂ پنگنڈے میں محصور ہو گیا جو قطب شاہی حدود کے قریب تھا چونکہ برسات کا موسم قریب تھا، اس لیے قطب شاہی فوجیں مقابلہ نہیں کرسکیں چند مہینوں کے بعد وینکٹ پتی نے مرتضےٰ نگر پر حملہ کر دیا افضل خاں حوالدار نے اس کا پُرزور مقابلہ کیا، اور ہندو فوج منہزم ہوگئی۔ برسات ختم ہونے کے بعد کندی کوٹہ پر جہاں سنجر خاں متعین تھا بڑا حملہ ہوگیا۔ اگرچہ اس کی مدافعت کے لیے مرکزی حکومت سے رستم خاں اور دوسرے سپہ سالار بھیجے گئے تھے لیکن اول الذکر کی بددلی کی وجہ سے قطب شاہی فوج کو بُری شکست ہوگئی، اس کی وجہ سے وینکٹ پتی کی فوجوں کی جُراءت بڑھ گئی اور یہ قطب شاہی حدود میں لوٹ مار کرنے لگیں۔ بادشاہ نے ان کی مدافعت کے لیے اعتبار خاں یزدی، علی خاں خانخاناں، ساباجی، اور بھالے راؤ کو مامور کیا ان لوگوں نے نہ صرف وینکٹ پتی کی فوجوں کو قطب شاہی حدود سے باہر نکالا بلکہ خود دیجیانگر میں بڑھ کے حملے کیے اور بڑی شکستیں دیں۔ اس کے بعد جب مغل فوجوں نے احمد نگر کا محاصرہ کیا تو اس واقعے سے وینکٹ پتی کو پھر جُراءت ہوگئی اور گھنپورہ پر پھر حملہ کر دیا لیکن عادل خاں نے اس کا پورا مقابلہ کیا۔ اسی طریقے سے شمال مشرق میں جو بغاوتیں ہوئیں ان کا بھی خاطر خواہ سدباب ہوگیا۔ جب قاسم کوٹہ کے باجگزار راجہ بلندر رائے کا انتقال ہوا تو اس کا جانشین مکند رائے باغی ہوگیا، امین الملک نے اس کی گوشمالی کی۔ اس کے بعد راج مندری اور ویلور میں بغاوت ہوگئی، اس کا بھی سدباب کر دیا گیا۔ یہ ایسا سدباب تھا کہ پھر کوئی نقل و حرکت نہیں ہوئی محمد قلی قطب شاہ کا آخری زمانہ اور اس کے جانشین محمد قطب شاہ کا عہدِ حکومت نہایت اطمینان سے گذرے۔

یہ تو سلطنت کی توسیع اور تنظیم تھی۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت جو کم و بیش تینتیس سال پر محیط ہے، ارتقائے تمدن کا زرین باب ہے اسی عہد میں قطب شاہوں کا بڑا تمدن پیدا ہوا جس پر آندھرا دیش ہمیشہ فخر کرتا ہے۔ اسی عہد میں قرونِ وسطیٰ کا مشہور شہر حیدرآباد، آباد ہوا۔ اس شہر کی تنظیم اور عمرانی لوازم اس سلیقے کے ساتھ جمع کیے گئے کہ

ان کی مثال نہ تھی، اس کی وجہ سے تلنگانہ کے طول وعرض میں ایک اجتماعی زندگی پیدا کی گئی۔ داد محل۔ خدا داد محل۔ ندی محل۔ باغ محمدی۔ بنات گھاٹ، اور کوہ طور کی سی متعدد عمارتیں بنا کر معاشرت کو بلند پایہ کیا گیا۔ فنون لطیفہ کو ترقی دے کر زندگی میں شگفتگی پیدا کی گئی۔ علم وفن کی اس قدر خدمت کی گئی کہ دُور دُور تک دُنیائے معلومات میں اس کے چرچے ہوتے تھے۔ اسلامی علوم کے ساتھ مقامی زبان تلنگی کو بھی فروغ دیا گیا۔ نہ صرف تلنگی شعرا کی خاطر خواہ سرپرستی کی گئی بلکہ خود بادشاہ وقت نے تلنگی میں طبع آزمائی کی۔ تلنگانے کی مقامی روایات ورواجات زندہ کرکے قومی بیداری پیدا کی گئی۔ اس کی تفصیل دیکھنے کا ہمیں آیندہ موقع ملیگا۔

ان تمام ترقیوں کا اصل محرک خود بادشاہ کی جلیل القدر شخصیت تھی جو تمام قطب شاہی خاندان میں خاص امتیاز کی حامل ہے۔ سیاست اور تمدن کی رہنمائی میں اسی کی بیدار مغزی کار فرما تھی۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ بادشاہ کی مردم شناسی کی بہ دولت مُلک میں لایق وزرا جمع ہو گئے تھے۔ حضرت میر مومنؒ استر آبادی جن کو ان کے علم وفضل، سیاست دانی کی وجہ سے "مرتضائے ممالک اسلامؒ" کہا جاتا تھا سلطنت کے پیشوا تھے[1]۔ محمد قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین محمد قطب شاہ کے عہد میں انھوں نے یہ عظیم الشان خدمت انجام دی اور مُلک کو اپنی غیر معمولی قابلیت سے بہت فایدہ پہنچایا۔ ملک کا کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا بڑا عہدہ دار مرزا محمد امین ہے جو میر جملہ کی بڑی وزارت پر مامور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس کی علمی وعملی قابلیت کا بار بار امتحان کرکے اس کو امین الملک کا خطاب دیا، اور جملۃ الملکی کی خدمت دی تھی۔ تاریخ میں اس کو آصفِ دوراں کہا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف

---

[1] حضرت مومنؒ کے آبا واجداد استر آباد کے رہنے والے اور صفوی خاندان کے ملازم تھے۔ ایران میں ان کی بڑی عزت تھی۔ حضرت مومنؒ غالباً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دکن آئے تھے۔ شاہ مرزا اصفہانی کے بعد یہ سلطنت کے پیشوا بنائے گئے۔ یہ بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ فارسی میں ان کا کلام پایا جاتا ہے۔ یہ دائرۂ میر مومنؒ جو انھیں کا بنایا ہوا ہے، مدفون ہیں۔

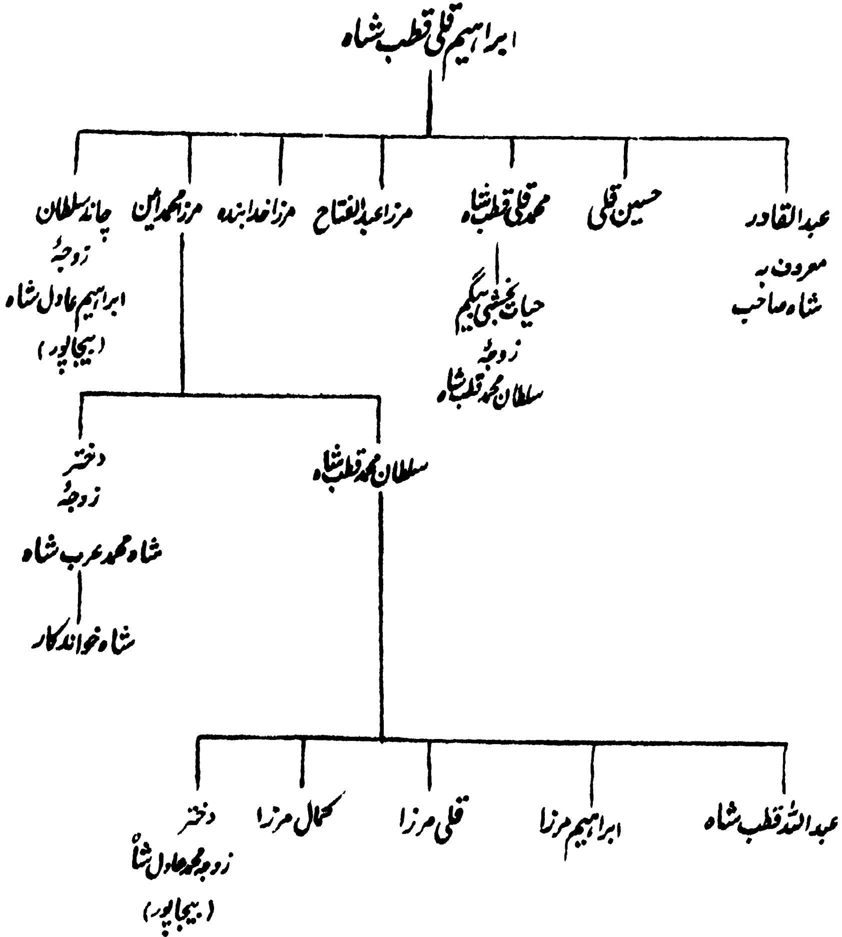
اس عہد کے داخلی فرائض انجام دیے بلکہ بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں قطب شاہی فوجوں کی کامیاب رہنمائی کی۔ ان کے علاوہ میرزین العابدین سرلشکر اور میر ابو طالب ناظر بھی اسی عہد کے قابل ذکر عہدہ داروں میں سے تھے، اور یہ سب سید گھرانے کے لوگ تھے اور غالباً تقرر میں خاندانی شرافت کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ہندو بھی فوج کی بڑی خدمات پر مامور تھے، ساباجی اور بھالے راؤ فوج کے افسر تھے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے سلطنت کی طرف سے ہندو طاقتوں کی سرکوبی کی تھی۔

ایک طویل حکومت کے بعد جو تینتیس [۳۳] سال پر مشتمل ہے، ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ [۱۶۱۱ء] کو محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر اڑتالیس [۴۸] سال سے زیادہ نہ تھی، اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تمام زندگی عیاشی میں گذری تھی، لیکن اس کمزوری کے قطع نظر وہ بہت بڑا عملی آدمی تھا۔ اس نے اپنی تنظیم و تعمیر سے تلنگانے کو جس قدر فایدہ پہنچایا تھا، اس کی مشکل سے مثال ملتی ہے۔ اگرچہ وہ بہت رحم دل تھا[۱]، اور تاریخ کہتی ہے کہ اس نے اپنے تمام عہد حکومت میں کبھی کسی کو قتل نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود سلطنت میں کبھی بدامنی اور خونریزی نہیں ہوئی۔ دارالقضا سے تمام مقدمات کے منصفانہ فیصلے ہوتے تھے۔ اس نے اجناس کا محصول جو پچھلے زمانے میں لیا جاتا تھا معاف کر دیا۔ خیرات و مبرات کا یہ حال تھا کہ مذہبی تقریبوں میں لاکھوں روپے غربا و مستحقین کو دیے جاتے تھے۔ ہر سال بارہ [۱۲] اماموں کے نام سے ساٹھ [۶۰] ہزار ہون خیرات ہوتے تھے۔ محرم میں بارہ [۱۲] ہزار ہون اور ربیع الاول میں ایک لاکھ ہون خرچ کیے جاتے تھے[۲]، اور ایک بہت بڑی رقم مقدس مقامات کے لیے بھیجی جاتی تھی۔

۱۔ فرشتہ محمد قلی کو حلیم الروف لکھتا ہے۔

۲۔ محرم میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا، تمام سلطنت میں عزاداری ہوتی تھی۔ حکومت کی طرف سے سب لوگوں کو سیاہ کپڑے تقسیم ہوتے تھے تاکہ وہ سیاہ کپڑے پہنیں۔ غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

رعایا کی دوسرے طریقوں سے بھی مدد کی جاتی تھی، یعنی شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں میں شاہی خزانے سے روپیہ دیا جاتا تھا۔





سلطان محمد قطب شاہ

بارھواں باب

عہدِ ارتقا

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کی جو ترقیاں شروع ہوئی تھیں، وہ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں سلطان محمد قطب شاہ جو محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا ہے چہارشنبہ ۲۲ رجب المرجب ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) میں پیدا ہوا[1] اس کا اصل نام سلطان مرزا ہے۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کے بھائی محمد امین کا بیٹا ہے، اس کی ماں خانم آغا قطب شاہی خاندان سے تو نہ تھی، مگر ایک بڑے شریف گھرانے کی خاتون تھی یعنی یہ میر مقصود علی بن میر علاء الدین طباطبا کی بیٹی تھی جس کا سلسلۂ نسب کوئی چار پشتوں قبل حضرت امام موسیٰ کاظمؑ تک پہنچتا تھا میر مقصود علی کو گولکنڈے کے امیر اور سرلشکر سید کمال الدین مصطفیٰ خاں سے نزدیک کی قرابت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ یہی قرابت اس کو گولکنڈہ کھینچ لائی چونکہ سید کمال الدین کی گولکنڈے میں ایک ذی اثر حیثیت تھی اس لیے یہاں اس کے خاندان کے کئی افراد جمع تھے منجملہ ان کے میر مقصود علی بھی تھا مقصود علی نے اپنی خاندانی وجاہت اور مصطفیٰ خاں کے سیاسی اثر سے بہت جلد قطب شاہی دربار میں رسوخ پیدا کر لیا گولکنڈے کے سلاطین خود ایسے بلند پایہ خاندانوں کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور نہ صرف ان کو دربار میں جگہ دیتے تھے بلکہ ان کے ساتھ

---

[1] اگرچہ تاریخ قطب شاہی کا مولف تاریخ پیدائش ۲۳ ربیع الثانی بتاتا ہے، لیکن اول الذکر تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ دوسری تاریخیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور سلطان محمد کی قبر کے کتبے میں بھی ماہ رجب درج ہے۔

ازدواجی تعلقات پیدا کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے میر مقصود علی کی بھی بہت آؤ بھگت ہوئی اور اس کی بیٹی خانم آغا سے شہزادہ محمد امین کی شادی کی گئی اس طریقے سے سلطان محمد کا رشتہ خاندانی ایک بڑے سید گھرانے سے جڑا ہوا تھا۔

اس کی شادی کی صحیح تاریخ بتانی بہت مشکل ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ یہ شادی محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد ہی ہوئی ہوگی کیونکہ ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت خود محمد قلی قطب شاہ کی عمر پندرہ[1] سال سے زیادہ نہ تھی۔ محمد امین تو اس سے بہت چھوٹا تھا، خود محمد قلی قطب شاہ کی شادی بھی اس کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی۔ اس نے بادشاہ ہونے کے بعد نہ صرف اپنی شادی کی بلکہ اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کی شادی کی چونکہ سلطان محمد ۱۰۰۱ھ میں پیدا ہوا ہے اور یہ محمد امین اور خانم آغا کی پہلی اولاد تھی اس لیے محمد امین کی شادی ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔ اس شادی کے وقت محمد قلی قطب شاہ کو تخت نشیں ہوئے تقریباً بارہ سال ہو چکے تھے چونکہ محمد قلی قطب شاہ کو صرف ایک بیٹی کے سوائے کوئی اور اولاد نہیں تھی اس لیے یہ سلطان محمد کی پیدائش سے بہت خوش ہوا کیونکہ یہی اس کا جانشین ہونے والا تھا۔ حضرت میر مومنؒ استرآبادی نے جو سلطنت کے پیشوا تھے اظہار مسرت میں یہ نظم لکھی تھی:-

باز عالم ابتدائے کامرانی کردہ است	صد بشیر کامرانی می برد ہر سو خبر
دودمان ترکمانش خوش چراغے بر فروخت	پر تو شاہزادہ بر چرخ مینا بد دگر
رونق عز و شرف سلطان محمد آنکہ ہست	ہر دو عالم یک صدف از بہر آن عالی گہر
خواستم تاریخ آن فرخندہ گو ہر عقل گفت	اول کام است و فیروزی و اقبال و ظفر
چون دعا زین بہ نمی دانم از آن میگویمش	سرور عالم شوی در ظل اقبال پدر ۱۰۰۱ھ

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اس بچے کو اپنا متبنیٰ بنانے کی خواہش کی اور محمد امین سے اس بچے کو تبنیت کے لیے طلب کیا کہ: "تم کو خدا اور بچے دے دیگا یہ بچہ مجھے دے دو" محمد امین نے بچے کو دینے میں بہت تامل کیا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے انتقال تک بہت لیت و لعل کرتا رہا۔ جب چار سال کے بعد محمد امین کا ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں انتقال ہو گیا تو سلطان مرزا خود بخود اپنے چچا کی آغوش میں آگیا[1]۔ یوں بھی محمد قلی قطب شاہ اس بچے کا سرپرست تھا

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۲۸۵-۲۸۶

لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اس بچے کو لینے کے لیے خود محمد امین کے گھر گیا تھا، اور بچے کو اپنے ساتھ لایا اور خود اس کی پرورش کی:۔

"از آوان طفولیت کہ پدر بزرگوار جہان فانی را وداع نمودہ بود در کنف لطف و مرحمت خاقان زمان نشو و نما یافتہ بود" [1]

شہزادے کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا یعنی دستور کے مطابق اس کی اس طرح تعلیم و تربیت کی گئی جس طرح اور شہزادوں کو دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے گولکنڈے کے تمام سلاطین سب کے سب پڑھے لکھے، علم و فن کے قدر دان ہوئے ہیں۔ علمی تعلیم کے لیے قاضی سمعانی، اور فوجی تربیت کے لیے حضرت شاہ یوسف صاحبؒ جن کو تاریخ قطب شاہی میں چاند میاں یوسفؒ لکھا گیا ہے [2] مقرر کیے گئے تھے۔ یہ دونوں حضراتؒ اپنے زمانے کے فاضل تھے۔ اس اہتمام تعلیم کا نتیجہ تھا کہ سلطان محمد ذی علم اور ذی اخلاق بادشاہ ثابت ہوا ہے۔ علم و فن کی اس نے بہت قدر کی۔

یہ تو تعلیم و تربیت کا انتظام تھا، اور جب سلطان محمد کی عمر کم و بیش پندرہ سال کی ہوئی تو اس کی شادی کا انتظام کیا گیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم سے اس کی شادی کردی جو ۱۰۱۶ھ مطابق ۱۶۰۷ء میں ہوئی تھی۔ چونکہ سلطان مرزا محمد قلی قطب شاہ کا جانشین اور گولکنڈے کا تاجدار ہونے والا تھا، اور حیات بخشی بیگم جیسی لایق شہزادی سے شادی ہو رہی تھی اس لیے اس میں غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اگرچہ غالباً شادی کی اصل تقریب خود گولکنڈے میں ہوئی تھی جو تاریخی جگہ تھی، لیکن شہر حیدرآباد میں بھی اس شادی کی خوشیاں منائی گئیں۔ کیونکہ یہ نوخیز شہر بھی جو اس وقت آباد ہو گیا تھا، ان مسرتوں کا مستحق تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں بھی روشنی کا انتظام کیا گیا، اور مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ تمام افراد مملکت کو درجہ بدرجہ جامدار خانۂ عامرہ سے خلعت فاخرہ تقسیم ہوئے، ان خلعتوں کی تعداد کوئی تیس ہزار

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۵۔

[2] یہ حیدرآباد کے بہت مشہور بزرگ ہیں جن کا مقدس مزار نام پلی میں مرجع خلایق ہے۔

بتائی جاتی ہے، اس سے شادی کے دوسرے اخراجات کا اندازہ ہوسکتا ہے[1]۔ آیندہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسرتیں بے معنی نہیں تھیں یہ ایسا سنجوگ تھا جس کی شمیم انگیزیاں برسوں تک گولکنڈے کو یاد رہیں سلطان محمد تو جلد مر گئے، وہ چونتیس سال سے زیادہ عمر نہیں پائی لیکن حیات بخشی بیگم نے طویل عمر پائی، نہ صرف طویل مدت تک زندہ رہی، بلکہ آخر دم تک گولکنڈے کی سیاسی رہنمائی کی۔ اپنے بیٹے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس نے چالیس سال گولکنڈے پر حکومت کی اور اپنے کارناموں کا ایک بڑا سرمایہ چھوڑا ہے اس وجہ سے گولکنڈے کے بہت سے شاعروں نے اس شادی میں مسرت کے گیت گائے تھے۔

جب محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو مرحوم کی وصیت کے مطابق سلطان محمد کو اس کی جگہ تخت نشین کیا گیا۔ سلطان محمد مرحوم کا ہر طرح جانشین تھا، اسی امید میں اس کی تربیت کی گئی تھی اور بادشاہ کی لائق اور اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم اس کو دی گئی تھی۔ نیز مرحوم بادشاہ نے اپنے عمائد سلطنت سے تاکیدی وصیت کی تھی کہ اس کی جگہ سلطان محمد کو تخت نشین کریں چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ:-

گہ ہم در زمان صحت و ہم در وقت اشتداد مرض مکرر فرمودند و از ہر کسے عہد و بیعت گرفتند[2]

محمد قلی قطب شاہ نے حالت مرض میں میر مومنؒ استر آبادی کو بار بار وصیت کی تھی کہ سلطان محمد کی تخت نشینی کا انتظام کریں، بلکہ خود اپنی زندگی میں بیعت لے لی تھی حضرت میر مومنؒ نے سلطان محمد کی تخت نشینی کا انتظام کیا تھا۔ تخت نشینی کی صحیح تاریخ ۷ ارذیقعدہ سنہ ۱۰۲۰ھ ہے چونکہ سلطان محمد قطب شاہ اپنے علم و فضل اور پاکیزہ زندگی کی وجہ سے ملک میں بہت مقبول تھا اور لوگ اس کو محمد قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین سمجھتے تھے۔ اس کی تخت نشینی کے موقعے پر جو مسرت کا اظہار کیا گیا وہ بے موقع نہ تھا، خود میر مومن صاحبؒ نے جو اپنے عہد کے علامہ تھے رسم تخت نشینی کے موقعے پر دو بڑے قصیدہ ہائے تہنیت پڑھے تھے:-

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۲۶۵۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۲۸۷۔

قصیدہ (۱) :- با محبت باز بستم عہد و پیمانِ نوے | کُہنہ جامے می فشانم پیشِ جانانِ نوے

.... | ....

سُرمہ شد خاکِ تلنگانہ ز فرخ پائے تو | اے فدائے خاکِ پایت ہر زماں جانِ نوے

.... | ....

گر صفاہاں نو شد از شاہِ جہاں عباس شاہ | حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہانِ نوے

.... | ....

خواستم تاریخ فرخندہ جلوست عقل گفت | جملہ عالم نو بہارے شد ز سلطانِ نوے (۱۰۲۰ھ)

از دعاگوے چو مومن ہم دعا بہتر کہ است

او کہن داعی و تو شاہا جہاں بان نوے الخ

قصیدہ (۲) :- خلعتِ شاہی چو در بر کرد شاہِ دیں پناہ | دہر بر گردوں رساند از خرمی طرفِ کلاہ

.... | ....

خسرو روئے زمیں شایستۂ صاحبقراں | شاہِ با فتح و ظفر سلطاں محمد قطب شاہ

.... | ....

روزگار حشمتش را خالق عالم ضماں | آفتابِ دولتش را خلقِ عالم در پناہ الخ

گولکنڈے کی تمام تاریخ میں سلطان محمد قطب شاہ کا اکیلا عہد ایسا ہے جو پورے سکون اور خاموشی سے گزرا۔ نہ گھر میں کوئی سیاسی تلاطم ہوا، نہ حدودِ سلطنت پر کوئی جنگ ہوئی۔ ایسا خوشگوار زمانہ اس کے پہلے رہا نہ اس کے بعد، بلکہ ہر زمانے میں سلطنت کو کچھ نہ کچھ جنگ و جدل میں حصہ لینا پڑا۔ اس عہد میں تمام حدودِ سلطنت ہر قسم کے سیاسی تلاطم سے محفوظ تھے۔ ملک کا ہر شخص آرام کی نیند سوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان محمد کے چچا نے اپنی انتھک کوششوں سے سلطنت کی فضا خوشگوار اور حدودِ سلطنت ایسے محفوظ کر دیے تھے کہ ملک بالکل مطمئن تھا۔ تمام ہمسایہ طاقتیں ایسی مغلوب ہو چکی تھیں کہ اب ان کو

سر اٹھانے کا کوئی موقع نہیں تھا چنانچہ سلطان محمد کو ان طاقتوں کے خلاف کبھی جنگ وجدل کرنے کی کوئی ضرورت داعی نہیں ہوئی اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی دکن میں مغلوں کے ساتھ خونخوار معرکے ہو رہے تھے جن میں ملک عنبر سینہ سپر تھا۔ گولکنڈے کی سلطنت بھی بالواسطہ ان لڑائیوں میں شریک تھی، لیکن یہ جنگ وجدل حدود سلطنت سے اس قدر دور تھا کہ ان سے سلطنت کے اطمینان میں کوئی خلل نہیں پڑا، بلکہ حکومت کے سوا غالباً اہل ملک کو ان لڑائیوں کی خبر تک نہیں ہوئی۔

لیکن سلطان محمد کے پاکیزہ اخلاق اور مذہب پرستی نے ملک کی سیاسی فضا میں اور شگفتگی پیدا کر دی۔ اور یہ اپنی بلند پایہ شخصیت اور پاکیزہ فطرت کی وجہ سے ملک میں اس قدر مقبول تھا کہ اس کی مثال نہیں۔ سلطان محمد بلند پایہ اخلاق اور مذہب کا پتلا تھا۔ یہ وثوق سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دائرۂ اخلاق سے سر مو تجاوز نہیں کیا۔ بچپن سے وہ صوم وصلوٰۃ کا سختی سے پابند تھا، اور ہر روز صبح کو نماز کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اس کے تقوے کی صحیح آزمایش اس وقت ہوئی جبکہ مکہ مسجد کی تاسیس کا وقت آیا جس وقت مکہ مسجد کی تعمیر کا ارادہ ہوا تو اس کے سنگِ بنیاد کے متعلق بڑا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے تمام علما، وفضلا جمع کیے گئے اور ان سے کہا گیا کہ اس مسجد کی تاسیس کے لیے ایسے زاہد کی ضرورت ہے جس کی بارہ سال کی عمر سے نماز تہجد قضا نہ ہوئی ہو۔ اس مطالبے پر تمام علما، اور فضلا ساکت ہو گئے، کیونکہ اس مجمع میں کوئی شخص ایسا پابندِ صلوٰۃ نہ تھا۔ جب کوئی تیار نہ ہوا تو خود بادشاہ ان الفاظ کے ساتھ آگے بڑھے کہ ''بارہ سال کی عمر سے میری نماز تہجد بھی قضا نہیں ہوئی ہے'' اور تاسیس کی مقدس رسم انجام دی۔

اگرچہ سلطان محمد کے بلند کردار اس سلطنت کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھے لیکن اس نے اپنے مختصر عہد میں جو چودہ سال سے زیادہ نہیں ہے اپنی سلطنت کی علمی اور عمرانی خدمت سے اس کو عروج پر پہنچایا، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا پرسکون عہد میں جبکہ سلطنت جنگ وجدل سے بے نیاز ہو، علمی وتمدنی کام ہونا ضروری ہے۔ سلطان محمد نے اپنے پیچا کے نقش قدم پر سلطنت کی اس طرح عمرانی خدمت کی جس طرح اس زمانے میں ضرورت تھی، اور اپنے چچا کے پاکیزہ منصوبے کو پورا کر دیا۔ دفاعی انتظام اور تعمیری شوق کے مدنظر سلطان محمد نے حیدرآباد کے مشرق میں ایک اور شہر ''سلطان نگر'' کے نام سے آباد کرنے کی کوشش کی تھی، شہر کا نقشہ تیار ہو چکا تھا، اس کی فصیل اور قلعے کی افتاد ڈال دی

گئی تھی، اور اس کے مغرب میں عیدگاہ بنادی گئی جو عیدگاہ قدیم کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن سلطان محمد کی بے وقت موت کی وجہ سے شہر سلطان نگر ادھورا رہ گیا۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سلطان نگر سلطان محمد کی آرزو کے مطابق آباد ہوجاتا تو وہ بھاگ نگر کا جواب ہوجاتا۔ اور یہ نہ صرف حیدرآباد کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتیں پوری کرتا، بلکہ اس سے سلطنت گولکنڈے کا دفاعی انتظام بھی ہوسکتا تھا کیونکہ اس کی سطح حیدرآباد سے بہت بلند ہے اور دفاعی انتظام کے لیے بہت موزوں ہے، چنانچہ اسی کے مدنظر سلطان محمد نے، سلطان نگر میں پہلے قلعے کی بنیاد رکھی تاکہ بھاگ نگر اور سلطان نگر کی تمام آبادی قلعۂ گولکنڈہ اور جدید قلعے کے درمیان آجائے اور دارالسلطنت کی خاطر خواہ حفاظت ہوسکے ورنہ خود حیدرآباد ایسا کھلا شہر تھا کہ اس میں حملہ آور آسانی سے داخل ہوسکتے تھے چنانچہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں مغل فوجیں آسانی سے شہر میں داخل ہوگئیں اور اس کو نقصان پہنچایا۔

عمارتوں میں مکہ مسجد کی تاسیس، سلطان محمد کا بڑا کارنامہ ہے، اگرچہ یہ مسجد کئی پشتوں کے بعد جاکر تیار ہوئی لیکن اس کا نقشہ اور سنگِ بنیاد سلطان محمد کی یادگار ہے۔ اس نے کئی محل بھی بنائے تھے، اس کا امان محل بہت مشہور ہے جو اپنی آرائش و زیبائش کے اعتبار سے بڑا اچھا محل تھا، یہ چار منزل بنایا گیا تھا، غالباً یہ بھی داد محل کی طرح عدل گستری کے لیے تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے بنائے ہوئے، الٰہی محل، محمدی محل، حیدری محل، کی اس نے مرمت کی تھی اور اس میں اضافے کیے تھے۔ امان محل کے ساتھ ایک پُرفضا باغ بنایا گیا جو نبی باغ کے نام سے موسوم تھا۔ علمی شغف اور سرپرستی کا لحاظ کرتے سلطان محمد کو اس کے تمام خاندان میں امتیاز حاصل ہے۔ اس نے خود اپنے علم و فن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے، اس کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے اس کے زمانے کے علما و شعرا نے بھی بہت کام کیا ہے۔

یہ گولکنڈے کی بڑی بدقسمتی تھی کہ سلطان محمد بے وقت موت کا شکار ہوگیا۔ ۱۳ رجمادی الاول ۱۰۳۵ھ کو اس کا انتقال ہوا، اس وقت اس کی عمر چونتیس[34] سال سے زیادہ نہ تھی اور پندرہ[15] سال سے زیادہ یہ حکومت نہیں کرسکا۔ موت کے اسباب یہ بیان کیے جاتے ہیں کہ یہ ایک ایسے سخت بخار میں مبتلا ہوا کہ اس کا علاج بہت دشوار تھا۔ دو قسم کے

طبیب معالجے کے لیے مامور تھے، یونانی حکما، اس بخار کا علاج سرد دواؤں سے کرنا چاہتے تھے، اور ہندوستانی طبیب گرم دواؤں سے۔ بادشاہ کی ماں خانم آغا سے رائے لی گئی تو اس نے ہندوستانی اطبا کی رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ گرم دوائیں دی گئیں اور ان سے بخار کی حدت اور بڑھ گئی اور بالآخر بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ لنگر حوض کے مدفن میں جہاں اس کا مقبرہ پہلے سے تیار تھا دفن کیا گیا۔

حصّہ چہارم

سلطنت کا زوال

تیرھواں باب

حکومت کی کمزوری

سلطان محمد کے انتقال کے بعد قطب شاہی تخت پر اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت نشین کیا گیا۔ یہ مرحوم کا بڑا بیٹا تھا[1]۔ ۲۸ شوال ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) کو اس کی پیدائش ہوئی تھی جس کی مسرت میں متعدد تاریخیں اور قصیدے کہے گئے۔

[1] سلطان محمد قطب شاہ کی پانچ اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا عبداللہ قطب شاہ جس کا نام عبداللہ مرزا تھا ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا، وہ اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ دوسری اولاد بیٹی تھی جس کا نام خدیجہ سلطانہ تھا جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں محمد عادل شاہ والی بیجاپور سے بیاہی گئی۔ تیسرا بیٹا ابراہیم مرزا تھا جو عبداللہ کی تخت نشینی کے دوسرے سال مر گیا۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ خورشید بی بی نامی ایک اور بیوی کے بطن سے دو بیٹے ہوئے تھے، جن کے نام قلی مرزا، اور مرزا کمال بتائے جاتے ہیں۔ حدیقۃ السلاطین ص ۲۱۔

فرانسیسی سیاح تھیو نو، کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی ماں ایک برہمن عورت تھی۔ یہ بڑا بیٹا نہیں تھا، بلکہ عبداللہ کا ایک علاتی بھائی اور تھا جو اس سے بڑا تھا عبداللہ کی ماں نے اس کو تیار کر کے اپنے بیٹے کو تخت نشین کر دیا۔ اور مغلوں کے حملے کے زمانے میں جو ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ء) میں ہوا، اس کو زہر دے کر مار دیا گیا۔ سیاحت نامہ تھیو نو۔ لیکن گولکنڈے کی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ تھیو نو ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۵ء) میں گولکنڈہ آیا تھا۔

حضرت میر مومن استرآبادی نے "کام بخش جہانہا" سے اس کی تاریخ اخذ کی تھی۔[1] اور نظام الدین نے یہ قطعہ تہنیت لکھا تھا:-

قطعہ

از آسمانِ قطب شہان نیّرِ طلوع　　کردہ کہ سعد گشتہ از و مہر و مشتری

مہرے طلوع کرد زبرجِ شہنشہی　　کز نورِ آن چو آئینہ شد سطحِ عنبری

دُرّے زدُرجِ غیب عیاں شد کہ پرتوش　　شد سرفراز قبۂ این سقفِ اخضری

این گوہر یگانہ چو از بطن نہ صدف　　آمد برون بہ شعشعۂ مہرِ خاوری

در داد این ندا پئے تاریخ عقلِ کل　　با حسنِ یوسف آمد و شانِ سکندری
　　　　۱۰۲۳ھ

عبداللہ قطب شاہ کی پرورش عجیب طریقے سے ہوئی تھی یعنی محل میں ماں باپ کے پاس اس کی پرورش نہیں ہوئی بلکہ قطب الدین نعمت اللہ۔ مرزا شریف شہرستانی اور خواجہ مظفر علی جیسے بزرگوں نے اپنے گھر میں شہزادے کی پرورش کی،[2] اور بارہ سال کی عمر تک یہ محل میں نہیں بلایا گیا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے محل میں آنے کے چند روز بعد ہی سلطان محمد کا انتقال

---

[1] حضرت میر مومنؒ کے فرزند میر مجد الدین نے اور دو تاریخیں نکالی تھیں: "قرۃ عین الانسان" (۱۰۲۳ھ)۔ "اول فتح و ظفر آخر یخ والم است" (۱۰۲۳ھ)۔ اور نظام الدین نے یہ تاریخ کہی تھی:- بہر تاریخ عقل دور اندیش۔ گفت "سلطان صورت معنی" (۱۰۲۳ھ) (حدیقۃ السلاطین ص ۷)۔

[2] عجیب روایت یہ مشہور ہے کہ عبداللہ مرزا کی پیدائش کے وقت نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ بچہ باپ کے لیے بدشگون ہے۔ بارہ سال سے پہلے بادشاہ کو اس کی صورت نہ دیکھنی چاہیے ورنہ بادشاہ مر جائیگا۔ اس لیے اس کی پرورش محل کے باہر کی گئی تھی۔ پہلے شہزادہ میر قطب الدین نعمت اللہ کے سپرد کیا گیا جن کو قطب شاہی خاندان سے دہری قرابت ہوتی تھی لیکن دو سال کے بعد قطب الدین کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ ان کے داماد مرزا شہرستانی مقرر ہوئے۔ جب بچے کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو شہرستانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت میر مومنؒ کی رائے سے خواجہ مظفر علی بچے کی پرورش کے لیے مقرر ہوئے، دو سال کے بعد یہ بھی مرگئے تو اس کی جگہ مولانا حسین مقرر ہوئے لیکن عبداللہ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو حسب قرارداد بادشاہ نے بچے کو محل میں بلالیا، اور دیکھا لیکن بادشاہ کا بھی بہت جلد انتقال ہو گیا۔ یہی مولانا حسین شیرازی نے جو اپنے زمانے کے بڑے علامہ تھے عبداللہ کی تعلیم کے لیے مقرر تھے۔ سب تعلیم انھوں نے ہی دی تھی۔ (حدیقۃ السلاطین ص ۸۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۱)۔

ہو گیا چونکہ اس وقت عبداللہ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی اور اس کی کم سنی کی وجہ سے ملک میں بدامنی کا اندیشہ تھا اس لیے اس کی ماں حیات بخشی بیگم اور اس کی دادی خانم آغا نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی منصور خان حبشی وزیر، ملک الماس اور ملک یوسف کے ساتھ اس کام کے لیے مقرر ہوا تھا کہ تمام شہر کی نگرانی کرے اور شورش نہ ہونے دے۔ قاسم بیگ کوتوال کو چاوڑی میں اور اس کا نایب حسن بیگ چار مینار میں متعین کیا گیا کہ چاروں طرف اپنی نظر رکھے اور شورش و فساد نہ ہونے دے[1]۔ خصوصاً باہر کے لوگ ترک و ایرانی خواہ سرکاری ملازم ہوں یا تجارت پیشہ وہ لوٹ مار کے خوف سے بہت پریشان تھے۔ ۱۴ رجمادی الاول ۱۰۳۵ھ ۱۶۲۶ء میں عبداللہ قطب شاہ کو محمدی محل میں تخت نشین کیا گیا۔ پرانے دستور کے مطابق ملک کے تمام چھوٹے بڑے عہدہ داروں کو خلعتیں دی گئیں سادات، علماء اور طلبا کو وظایف و انعامات دیے گئے۔ ہاتھیوں اور رت گاڑیوں میں شکر بھر کر تمام راستوں اور بازاروں میں تقسیم کی گئی، اور تمام ملک میں اس تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، اور نئے بادشاہ کے نام کا سکہ ڈھالا گیا۔ مولانا رونقی نے ع "مزین شد جہان از جلوس شاہ عبداللہ" اور فقیر سراج نے جو دربار کا شاعر تھا ع "شد شاہ دکن قطب زماں عبداللہ" سے تاریخ تخت نشینی اخذ کی تھی[2]۔

حیات بخشی بیگم

عبداللہ کی کم سنی کے زمانے میں اکابر ملک کی ایک مجلسِ تولیت، امورِ سلطنت انجام دیتی تھی، لیکن اس مجلس کی روحِ رواں دراصل عبداللہ کی ماں حیات بخشی بیگم تھی[3]۔ تمام امور اسی کے مشورے سے انجام

---

[1]۔ حدیقۃ السلاطین ص ۲۰۔ [2]۔ حدیقۃ السلاطین ص ۲۶۔

[3]۔ بعض اوقات عبداللہ کی دادی خانم آغا کا بھی حکومت میں اثر محسوس ہوتا ہے لیکن حیات بخشی بیگم تمام امورِ سلطنت کی ذمہ دار تھی، یہ خاتون اس وقت پیدا ہوئی تھی جبکہ گولکنڈے کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی اور حیدرآباد کا شہر آباد ہو رہا تھا، یہ نقوش اس کے دل و دماغ پر ضرور ثبت ہو گئے اور نیز اس کی تعلیم بھی اچھے پیمانے پر ہوئی تھی جس کی بنا پر وہ بڑی مدبر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کے عہد میں بھی حکومت میں ضرور حصہ لیا تھا، اور خافی خاں کے اس فقرے سے کہ "والدۂ عبداللہ قطب شاہ کہ در کلّی امورِ ملکی و مالی دخیل مستقل گردیدہ بود" (منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۹۲)

پانے تھے۔ عبداللہ کی تخت نشینی کا اسی نے انتظام کیا تھا[1]۔ اور نظم و نسق کے لیے لایق عہدہ دار مقرر کیے۔ شاہ محمد کو جو عبداللہ قطب شاہ کا پھوپا ہوتا تھا پیشوا بنایا گیا چونکہ شاہ محمد میں اس جلیل القدر عہدے کی قابلیت نہ تھی اور ایک مجبوری سے پیشوا بنایا گیا تھا اس لیے جب علامی شیخ محمد جو ابن خاتون کے نام سے مشہور تھا ایران کی سفارت سے واپس آیا تو اس کو نایب پیشوا بنایا گیا تاکہ اس کی ذات سے ملک کی صحیح رہنمائی ہو سکے[2]۔ اس کے علاوہ شیخ محمد کو دبیری کی خدمت بھی تفویض کی گئی جس پر اب تک

اس حقیقت حال پر روشنی پڑتی ہے کیونکہ جب ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں حضرت میر مومن کا انتقال ہو گیا تو سلطان محمد نے کسی دوسرے شخص کو پیشوا نہیں بنایا بلکہ خود پیشوائی کی خدمت انجام دی۔ اکو دبیر بنایا گیا محمد رضا اور مظفر علی صرف مشورے کے لیے مقرر ہوئے۔ حیات بخشی بیگم کا مشورہ ضرور شریک ہوگا۔ اور سلطان محمد کا پر امن و اقبال مند عہد حکومت اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس میں دو قابلیتوں کا ضرور اتصال ہوگا۔ اپنے شوہر کے بعد تو اس خاتون نے ملک کی تنہا رہنمائی کی۔ کمسن بیٹے کی تخت نشینی کا انتظام کیا۔ ملک کو شورش سے بچایا، اور لایق عہدہ دار مقرر کیے چنانچہ ایک مورخ کے الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں: "حیات بیگم کہ عورت غضبناک و تیز ہوش و رسا بود احدے را در مقدمات سلطنت دخل نداد خود بنفس نفیس بہ انتظام مقدمات مملکت می پرداخت" (ماہ نامہ ص ۱۴۱، ۱۴۲)

۱۔ ماہنامہ ص ۱۴، ۳۔

۲۔ شاہ محمد خانم آغا کے زور دینے سے پیشوا مقرر ہوا تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ محمد خانم آغا کا داماد تھا، مگر وہ اس خدمت کا اہل ثابت نہیں ہوا، اس لیے چند روز کے بعد جب شیخ محمد ایران کی سفارت سے واپس ہوا تو اس کو نایب پیشوا بنایا گیا۔ شیخ محمد جس کے باپ کا نام علی تھا، طوس کا رہنے والا اور بڑا ذی علم آدمی تھا، اس نے علما و شعرا کی بڑی سرپرستی کی تھی، اور اس کا گھرانا بھی بڑا مشہور تھا غالباً اس کی علمیت اور تدبر کا لحاظ کرتے قطب شاہی تاریخ میں حضرت میر مومن کے بعد ہی کا درجہ ہے، لیکن اس نے سلطنت کی ایسی وفاداری نہیں کی جیسے حضرت میر مومن نے کی تھی۔ یہ غالباً سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا، اور قطب شاہی ملازمت اختیار کی۔ بادشاہ نے اس کو ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں شاہ عباس صفوی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا، اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ سفارت سے واپس آنے کے بعد اس کو پیشوا بنایا جائیگا لیکن شیخ محمد بادشاہ کے مرنے کے بعد

محمد رضا فایز تھا۔ منصور خاں حبشی میر جملہ بنایا گیا جو ایک زمانے میں حوالدار، اور بعد کو عین الملک کی خدمت پر فایز تھا قاسم بیگ کوتوال اور حسن بیگ نایب کوتوال کی خدمت پر مامور تھے۔ میر قاسم ناظر الممالک تھا خواجہ احمد ترک سرخیل کی خدمت انجام دیتا تھا۔ اعتماد راؤ ہندی فرامین کے لیے مقرر تھا۔ نارائن راؤ مجموعہ دار تھا، اور سرو راؤ نے روع نویسی کا کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ محل کے دوسرے عہدہ داروں کا بھی رد و بدل ہوا۔

لیکن یہ انتظام ہمیشہ قایم نہیں رہا۔ نئے عہدہ دار خود غرض اور نا اہل ثابت ہوئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ پہلے تو منصور خاں حبشی کی وجہ سے جو میر جملہ کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا، کام خراب ہوا کیونکہ یہ ان پڑھ تھا، حساب کتاب کا تمام کام برہمنوں سے لیتا تھا۔ اس کی کمزوری سے فایدہ اُٹھا کر تمام برہمن جملۃ الملکی کے محکمے پر قابض ہو گئے یہ بہت جلد بادشاہ کا مقرب ہو گیا، اور اس اعزاز سے فایدہ اُٹھا کر تمام اکابر ملک کے ساتھ بیجا بدسلوکی کرنے لگا، ور بادشاہ کی طبیعت پر اس قدر حاوی تھا کہ اس کے خلاف کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی، اکثر عہدہ دار اس کے مخالف ہو گئے جو دشاہ محمد پیشواسے اس کی ان بن ہو گئی اس کو نیچا دکھانے کے لیے منصور خاں نے سید محمد اسفراسی[1] کو ہندوستان سے بُلانے کی کوشش کی تاکہ وہ شاہ محمد کی جگہ پیشوا ہو جائے۔ دوسری طرف قاسم بیگ، کوتوال سے مخالفت ہوئی تو اس کو معزول کرنے کی کوشش کی اور اس کی جگہ پر مچھلی بندر کے حوالدار ملا محمد تقی کو گولکنڈہ بُلایا جو اس کا دوست تھا قاسم بیگ کو علیحدہ کرنے کی یہ صورت نکالی کہ اس کے ساتھ بعض حبشیوں کی جھڑپ کرا دی، حبشیوں کی کھلی گستاخی تو تھی لیکن ان کو کوئی سزا نہیں دے سکتا تھا۔ قاسم بیگ یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکا یا آخر اپنی خدمت سے مستعفی ہو گیا، لیکن جب منصور خاں کے منصوبے کے خلاف بادشاہ نے قاسم بیگ کے نایب حسن بیگ کو مستقل کوتوال کر دیا تو اس نے اپنے دوست کی اس طرح تلافی کی کہ اس کو اپنا نایب بنا دیا، اور

واپس آیا، ابوالحسن عبداللہ نے مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق اس کی عزت کی۔ (حدیقۃ السلاطین ص ۱۹۔

[1] سید محمد اسفراسی سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈے کا ملازم تھا، لیکن بعض اسباب کی بنا پر نوکری چھوڑ دی اور مغل سلطنت کا ملازم ہو گیا۔

میر جملہ کے تمام فرائض اس کے سپرد کر دیے مگر ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں خود منصور خاں کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے اس کی جگہ محمد تقی کو میر جملہ بنا دیا جو بہت اہل ثابت ہوا۔ اس نے چند ہی روز میں سرکاری آمد و خرچ کی تنقیح کی جن لوگوں نے سرکاری رقم غبن کی تھی ان کا محاسبہ کیا۔ چنانچہ اس جرم میں بہت سے چودھری قتل کیے گئے، خود نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک لاکھ تیس ہزار ہون وصول کیے گئے۔ اس صلے میں محمد تقی کو شریف الملک کا خطاب ملا تھا[1] چند روز کے بعد پیشوائی کی خدمت بھی معرض بحث میں آگئی شاہ محمد نہ صرف نا اہل ثابت ہوا بلکہ اس نے سلطنت کے خلاف غداری بھی کی۔ اس کے بہت سے خطوط جو محمد عادل شاہ کے نام لکھے تھے پکڑے گئے[2] اور خارجی معاملات میں جو اس زمانے میں مغل سلطنت کے ساتھ بہت پیچیدہ ہو گئے تھے، یہ ناقص ثابت ہوا چنانچہ جب شاہجہاں کی طرف سے مغل سفیر شیخ محی الدین آیا تو اس کے ساتھ خاطر خواہ گفتگو نہ ہو سکی، بلکہ ایک الجھن پیدا ہو گئی۔ ان حالات کے مدنظر عبد اللہ قطب شاہ نے شاہ محمد کو پیشوائی سے معزول کر کے شیخ محمد کو مستقل پیشوا بنا دیا، اور اس کو اس قدر عزت دی کہ وہ پالکی میں بیٹھ کر محل میں آتا تھا، اور اس کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اس تقرر سے شیخ محمد کے حاشیے کے لوگ بہت خوش ہوئے[3]

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۴۴۔

[2] تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان خطوط میں کیا لکھا گیا تھا، اور ان میں کیا غداری تھی۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تمام خطوط شیخ محمد کے بنائے ہوئے جعلی تھے کیونکہ شیخ خود پیشوائی چاہتا، اور شاہ محمد کا نائب ہونے کی وجہ سے دونوں میں پہلے سے ان بن بھی تھی۔ بعض خطوط تو شاہ محمد کے نہ تھے، شاہ قاضی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے۔ اور نظام الدین اس کی توجیہ یہ کرتا ہے کہ شاہ محمد کا خط اچھا نہیں تھا، اس لیے یہ خط شاہ قاضی سے لکھائے گئے تھے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نظام الدین شیخ محمد کا متوسل اور ہمدرد تھا۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ شاہ محمد کے مقابلے میں شیخ محمد کی تائید کرتا ہے۔

[3] مولانا عرب خوشنویس شیرازی نے: "محمد ابن علی پیشوائے سلطان شد" کے مصرعے سے اس تقرر کی تاریخ اخذ کی تھی، اور حدیقۃ السلاطین کے مولف نظام الدین نے حسب ذیل قطعے لکھے تھے۔ نظام الدین، شیخ محمد کا بہت مداح ہے اور اپنے کو "آئین صف نعال نشین آن مجلس بہشت آئین" کہتا ہے۔ غالباً اس کی ترقی شیخ محمد کے توسط سے ہوئی تھی۔

اور ان لوگوں کو جو اکثر باہر سے آئے تھے شیخ محمد نے بڑی ترقی دی چنانچہ پیشوائی کے انتظام کے بعد جب دبیر کی خدمت شیخ محمد سے واپس لے لی گئی تو اسی کے مشورے سے مولانا اویس اس عہدے پر فایز کیا گیا، یہ شیخ محمد کا آوردہ تھا۔ اس کے علاوہ مرزا قاسم، حکیم نظام الدین احمد حکیم جبریل۔ اخلاص خاں وغیرہ کئی لوگ شیخ محمد کے توسط سے گولکنڈہ آئے اور مختلف خدمات پر فایز ہوئے۔

خود غرض وزرا کی بے اعتمادی کے علاوہ بادشاہِ وقت بھی اپنے مشیروں کے خلاف بہت تن آساں اور سہل انگار ثابت ہوا۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد پانچ چھ سال تو اس کی کم سنی کے گذرے جبکہ سلطنت میں ایک مجلس تو لیت کام کرتی تھی لیکن اس کے بعد جب وہ سنِ شعور کو پہنچا، اور عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لی تو اس سے وہ قابلیت ظاہر نہیں ہوئی جو اس کے پیشرووں میں تھی۔ عبداللہ سنِ شعور کو پہنچنے تک اپنی ماں حیات بخشی بیگم کی سخت نگرانی میں رہا تھا۔ اس کے بعد بھی جب تک حیات بخشی بیگم زندہ رہی اس کا ضرور اثر پڑتا رہا[1] لیکن یہ محل کا در پردہ اثر تھا، اس کے خاطر خواہ نتایج برآمد نہیں ہوئے۔ نیز عبداللہ میں فطرتاً سیاسی تدبر اور بیدار مغزی کے وہ جوہر نہ تھے جو ایک سلطنت کے ناخدائے سیاست میں

قطعہ (۱)

شہے یوسف رخ جمشید حشمت	کہ حاتم میکند از وے گدائی
ز فرط مرحمت کرد و تمکن	محمد را بہ صدر پیشوائی
بہ سامان شد مہام ملک و ملت	کہ بود ابتر ز آفات سمائی
متاع فضل و دانش بود کاسد	کنون بگرفت در عہدش روائی
جہاں معمور گردیدہ بداں سان	کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بہ الہام آمد این مصرع تاریخ	محمد یافت از حق پیشوائی (حدیقۃ السلاطین ص ۶۶)

قطعہ (۲)

چو نور وز است این عہد ترقی	کہ گیتی شد بہ عیش و عشق دمساز
محمد پیشوائے شاہ چون شد	جہاں را خرمی گردیدہ آغاز (حدیقۃ السلاطین ص)

[1] ماہ نامہ ص ۳۱۳۔ تاریخ کے الفاظ یہ ہیں: "فرزند را وے از حضور جدائی کرد۔"

ہونے چاہئیں۔ اس نے کبھی سیاسی امور پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا بلکہ پیچیدہ صورتِ حال سے دامن چھڑانے کی کوشش کی جنگ کے نام سے وہ دُور بھاگتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی حقیقی رہنمائی تمام وزراء کے ہاتھ میں تھی جو اکثر قابلِ اعتماد نہ تھے اور خود غرضی سے فیصلے کرتے تھے۔ ہمیشہ جنگ سے گریز کیا گیا۔ اڑے وقت میں احمد نگر کی کوئی مدد نہیں کی گئی، حالانکہ یہ گولکنڈے کا پُرانا مسلک تھا۔ ان کمزوریوں سے مغل سلطنت کو گولکنڈے میں قدم جمانے کا موقعہ مل گیا۔

عبداللہ کی تمام عمر عیش و عشرت اور سیر و تفریح میں گذری۔ ہر برسات کے موسم میں یہ تفریح کے لیے دارالسلطنت سے باہر جاتا تھا۔ تخت نشینی کے پہلے سال باغ لنگم پلی اور بنات گھاٹ کی سیر ہوئی اور وہاں عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا کیے گئے تھے۔ اس پر کئی مہینے صرف ہوئے۔ دوسرے سال سالگرہ کی رسم اس تزک و احتشام سے منائی گئی کہ اس میں ہزاروں روپیے صرف ہوئے۔ اور رقص و سرود اور آرائش و زیبائش کا پورا انتظام ہوا، تمام عمارات اور باغات میں روشنی کی گئی۔ دو سال کے بعد ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں کوہ طور کی سیر ہوئی اور یہاں ایک مہینہ بسر ہوا۔ ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں برسات کا موسم شروع ہوا تو پھر باغوں کی تفریح شروع ہوئی اور اس میں بھی کئی مہینے صرف ہوئے۔ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں ایک اور بہت بڑی رسم مو تراشی وغیرہ کی رچائی گئی جس کا انتظام اور خرچ حیات بخشی بیگم نے برداشت کیا تھا۔ اس کا انتظام حیات آباد میں ہوا، حیدرآباد سے حیات آباد کو جلوس گیا، اور یہاں کئی مہینے دربار، جلوس، رقص اور سرود کی محفلیں منعقد ہوئیں اور اہلِ ملک کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ انعامات دیے گئے چنانچہ اس قطعہ سے اس عظیم الشان رسم کی یاد تازہ ہوتی ہے:۔

قطعہ[1]

چو نوروز است این عید طرب خیز　　شدہ در بزم عشرت جام لبریز
شگفتہ غنچۂ شادی زہر دل　　نوائے نغمہ چوں لحن عنادل
گلستانِ ارم گردیدہ عالم　　گلِ بے خار گشتہ عیش بے غم

غرض اسی قسم کے عیش و طرب سے یہ عہد بھرا ہوا ہے۔ اس سے فارغ ہوتے تھے تو مذہبی رسوم میں دلچسپی لی جاتی تھی۔ مذہبی رسوم میں بھی بے حد مبالغہ کیا گیا۔ محرم، اور ربیع الاول کے مقدس ایام میں غیر معمولی اہتمام کیا جاتا تھا، اور خود بادشاہ ان تمام رسوم میں حصہ لیتے تھے۔ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور تمام شہر و عمارات میں روشنی کی جاتی تھی اور غرباء و مستحقین کی امداد کی جاتی تھی۔

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۱۰۷۔



سلطان عبداللہ قطب شاہ

چودھواں باب

احمد نگر کا خاتمہ اور گولکنڈے کی حکم برداری

سلطان محمد قطب شاہ کی وفات جو ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء میں واقع ہوئی گولکنڈے کے لیے پیام موت تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سلطان محمد کے ساتھ دکن کے دوسرے رہنمایانِ سیاست یعنی ملک عنبر اور ابراہیم عادل شاہ بھی راہی عدم ہو گئے[1] اور ان سب کا ایک ساتھ مرنا دکن کی تاریخ کے لیے ایک عجیب و جاں خراش سانحہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں ناخدایانِ سیاست آزادیٔ دکن کے رکھوال تھے جب تک یہ زندہ رہے انھوں نے مقدور بھر دکن کا اقتدار قایم رکھا۔ ملک عنبر نے دکن کی تینوں طاقتوں کو ملا کر ایک ایسا متحدہ محاذ بنایا تھا کہ اپنی عظیم الشان طاقت کے باوجود مغل سلطنت اس کو نہیں توڑ سکی لیکن جونھی یہ علمبردار دُنیا سے رخصت ہو گئے دکن کی آزادی متزلزل ہو گئی۔ احمد نگر کا تو ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اب رہی گولکنڈے اور بیجاپور کی سلطنتیں تو یہ مغل سلطنت کی سیادت تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو گئیں کیونکہ شمال میں احمد نگر کی سلطنت ان کے لیے فصیل کا کام دیتی تھی جب احمد نگر کا خاتمہ ہو گیا تو یہ بالکل بے پناہ ہو گئیں اور مغل سلطنت کے سیلاب کو نہیں روک سکیں جو اب بغیر مزاحمت کے سیدھے گولکنڈے اور بیجاپور پر اُمنڈ آتا تھا۔ گولکنڈے میں سلطان محمد کا جانشین ایک کم سن بچہ تھا جو سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد ہی حکومت کے بارِ گراں کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[1] سلطان محمد قطب شاہ ۱۳ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء میں اور ملک عنبر ۲۴ شعبان ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کو راہی عدم ہوئے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ۷ محرم ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء کو فوت ہوا۔

گولکنڈے کو بھی دکن کی تمام رفتار سیاست کا ساتھ دینا پڑا۔ اس طریقے سے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کو تاریخ دکن کی ایک حد فاصل سمجھنا چاہیے جہاں دکن کا پچھلا خوشگوار اور اقبال مند زمانہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ یہ سلطنتیں نہ صرف مقتدر رتھیں بلکہ اپنے اقتدار کے زور سے اپنے تمدن کو آگے بڑھائی تھیں۔ اور اب ایسا زمانہ آیا کہ نہ صرف یہ حلقہ بگوش ہوگئیں بلکہ شمالی طاقت کے ساتھ الجھ کر زوال کے گڑھے میں گرنے لگیں۔

احمد نگر کی سلطنت میں فوری زوال کے اسباب پیدا ہوئے۔ احمد نگر تو کجا پورے دکن میں ملک عنبر کا کوئی صحیح جانشین نہیں پیدا ہوا۔ گو اس کا بیٹا فتح خاں تھا جو باپ کی جگہ اس بدنصیب سلطنت کا پیشوا ہوا تھا مگر وہ نہ صرف نا اہل بلکہ بے وفا ثابت ہوا۔ مرتضیٰ نظام شاہ ثانی سے اس کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہو سکے اور کشیدگی یہاں تک پہنچی کہ چند روز کے بعد ہی مرتضیٰ نے اس کو گرفتار کر لیا۔ اگرچہ بہت جلد یہ قید سے فرار ہو گیا، اور احمد نگر کے مغل قلعہ دار سپہ دار خاں سے مل کر مرتضیٰ سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن احمد نگر کی فوجوں نے اس کو زیر کر کے گرفتار کر لیا، اور یہ پھر دولت آباد کے قلعے میں مقید کر دیا گیا۔ مقرب خاں سلطنت کے سرلشکر، اور اخلاص خاں پیشوا مقرر ہوئے۔ ایک اتفاق یہ ہوا کہ احمد نگر کی خوش قسمتی سے دکن کے مغل گورنر خان جہاں نے مرتضیٰ نظام شاہ سے ساز باز کر لی اور اس کی بے وفائی کی وجہ سے جو مغل سلطنت کے خلاف تھی مرتضیٰ کو بالاگھاٹ کے بہت سے مغل مقبوضات حاصل ہو گئے۔ اسی دوران میں شہنشاہ جہانگیر کا بھی انتقال ہو گیا، اور کچھ وقفے کے بعد ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء میں شاہجہاں شہنشاہ ہو گئے۔ نئے شہنشاہ خانِ جہاں لودی کی چھپی بے وفائی سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے خان جہاں کی گورنری بحال رکھی، لیکن یہ احکام بھیجے کہ کھوئے ہوئے مغل علاقے حاصل کیے جائیں۔ جب ان احکام کی پابندی نہیں ہوئی تو شہنشاہ نے خانِ جہاں کو گورنری سے معزول کر کے مہابت خاں کے بیٹے زماں خاں کو دکن کا جائزہ دے دیا۔ لیکن خانِ جہاں نے شہنشاہ کے خلاف کھلی بغاوت کر دی۔ گو معزولی کے بعد یہ شمالی ہند گیا، اور دربار میں آمد و رفت کی، لیکن شہنشاہ کے دل میں اس کی طرف سے بے اعتمادی برابر بڑھتی گئی۔ بالآخر آگرے سے بھاگ کر اس نے مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس پناہ لی۔ مرتضیٰ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی جو مغل سلطنت کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ احمد نگر کے اس مخالفانہ طرز عمل سے جنگ کے فوری اسباب

پیدا ہو گئے۔

احمد نگر پر مغل حملے

اس سے پہلے احمد نگر نے بالاگھاٹ کے اکثر مغل علاقے دبا لیے تھے اور اس پر طرّہ یہ کہ اس وقت مغل سلطنت کے باغی خان جہاں کو پناہ دے دی اس سے نہ صرف شہنشاہت کو جنوب سے خوف ہوا بلکہ مغل سلطنت کا وقار بھی بہت خطرے میں پڑ گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کو دکن میں اپنا شہنشاہی رُعب و داب بھی قایم کرنا تھا، کیونکہ گذشتہ بغاوت کے زمانے میں جو اس نے اپنے باپ کے خلاف کی تھی دکن میں اس کی بہت کچھ رسوائی ہو چکی تھی یعنی شہنشاہی افواج سے بچنے کے لیے اس کو سلاطین دکن سے دریوزہ گری کرنی پڑی تھی، اس کی تلافی کے لیے خود شہنشاہ برہان پور آ گئے اور دکن پر حملہ کرنے کے لیے اعظم خاں کے تحت تین[۲] فوجیں بھیج دیں ایک بالاگھاٹ پر حملہ کرنے اور خانِ جہاں کو گرفتار کرنے کے لیے، دوسرے خواجہ ابوالحسن کے تحت ناسک اور سنگم کے لیے اور تیسری ناصری خاں کے تحت مشرق میں تلنگانے کے لیے بھیجی گئی یہ فوجیں بہت کامیاب ہوئیں، باوجود بیجاپور کی امداد[۱] کے اعظم خاں نے خانِ جہاں کو شکست فاش دی قلعہ دہارور اور قندھار پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف خواجہ ابوالحسن نے ناسک اور سنگم مسخر کر لیے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ خود احمد نگر کی مرکزی حکومت میں ایک نیا سیاسی انتشار پیدا ہو گیا، یعنی اس اثنا میں مرتضےٰ نے یہ غلطی کی کہ فتح خاں کو قلعے سے رہا کر دیا اس کا سبب یہ تھا کہ مرتضےٰ کی بیوی جو فتح خاں کی بہن تھی بادشاہ کو مجبور کرتی تھی کہ اس کے بھائی کو قید سے رہا کرے۔ یہ رہائی بالکل بے موقعہ ثابت ہوئی فتح خاں پھر پیشوا بنا دیا گیا جس سے مقرب خاں ناراض ہو کر مغلوں سے مل گیا اور وہاں وہ رُستم خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور ادھر فتح خاں نے اپنا پُرانا انتقام لینے کے لیے بادشاہ کو قتل کر دیا، اور مقتول کے بیٹے حسین نظام شاہ سوم کو جس کی عمر صرف دس سال کی تھی تخت نشین کر دیا۔ بادشاہ کے

---

[۱] اس اڑے وقت میں بیجاپور نے احمد نگر کی مدد کی تھی، کیونکہ احمد نگر کے خاتمے سے دوسری دکنی سلطنتوں کو بھی ڈر لگتا تھا۔ بیجاپور سے رندولہ خاں ایک بڑی فوج کے ساتھ مقرب خاں کی امداد کے لیے بھیجا گیا تھا۔

قتل کی وجہ سے فتح خاں کے خلاف ملک میں ایسی سخت بے چینی پیدا ہوگئی کہ اس کا ملک میں ٹھیرنا مشکل ہوگیا، اور اس کا بچاؤ صرف اسی بات میں تھا کہ شاہجہاں کی اطاعت اختیار کرے۔ شاہجہاں نے فتح خاں سے نظام شاہی خاندان کے تمام ہاتھی اور جواہر طلب کیے۔ اس نے کچھ لیت و لعل کیا تو وزیر خاں اور رستم خاں دولت آباد کی تسخیر کے لیے بھیجے گئے، فتح خاں بہت ڈر گیا، اور مجبوراً ملک میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا دیا، اور سکّے ڈھلوائے (۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء)۔

دولت آباد کا خاتمہ — یہ واقعات ایک حد تک مغل سلطنت کے لیے اطمینان بخش تو تھے لیکن ان سے پوری یکسوئی نہیں ہو سکی کیونکہ فتح خاں کی اطاعت مغل سلطنت کے لیے قابلِ اعتماد نہیں تھی۔ دوسرے بیجاپور نظام شاہی سلطنت کی امداد کے لیے تیار تھا! ایک اور دقت یہ تھی کہ شاہ جی[1] جو اس وقت مغلوں کی ملازمت میں جنیر، اور آس پاس کے اضلاع پر قابض تھا مغلوں کا مخالف ہوگیا، اور بیجاپور سے اتحاد کر کے مغل سلطنت کے خلاف پیشقدمی شروع کر دی۔ پہلے فتح خاں اور شاہ جی میں ان بن تھی لیکن بیجاپور کے سپہ سالار رندولہ خاں کی بیچ بچاؤ سے تینوں طاقتیں متحد ہوگئیں۔ جب شاہجہاں کو یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے مہابت خاں کو دکن کی کمان دی۔ پہلی مارچ ۱۶۳۳ء کو مہابت خاں کی فوجوں نے قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کیا۔ شاہ جی، رندولہ خاں اور مراری راؤ نے باہر سے مغل فوجوں کو پریشان کرنے کے لیے بہتیری کوشش کی لیکن سب بے سود ہوا، مہابت نے قلعۂ مہاکوٹھ کی فصیل اڑا دی تو فتح خاں نے ڈر کر ہتھیار ڈال دیے اور اپنے بیٹے عبدالرسول کو مہابت خاں کے پاس بھیج دیا۔ اس طریقے سے مغل فوجیں قلعۂ دولت آباد پر قابض

---

[1] شاہ جی سیواجی کا باپ ہے، یہ اور اس کے باپ دادا، احمد نگر کے ملازم اور جاگیر دار تھے۔ جس زمانے میں شاہجہاں برہان پور آئے تھے، یہ مرتضےٰ نظام شاہ سے ناراض ہو کر شہنشاہ کے پاس چلا گیا، اور پنجہزاری منصب پایا۔ مرتضےٰ سے ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ مرتضےٰ نے اس کے خسر لکھو جی جادو رائے کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد وہ شاہجہاں سے بھی ناراض ہوگیا، کیونکہ شاہجہاں نے احمد نگر کے چند موضع جو فتح خاں کی جاگیر تھی اس کو دیے تھے، لیکن جب فتح خاں نے اطاعت اختیار کر لی تو اس کی جاگیر میں بحال کرنا پڑا، اس طرح شاہ جی محروم ہوگیا۔

ہوگئیں۔ فتح خاں اور حسین نظام شاہ سوم شاہجہاں کے ہاں آگرہ بھیجے گئے (۲۱ ستمبر ۱۰۴۳ھ ۱۶۳۳ء)۔

اگرچہ دولت آباد کی تسخیر سے سلطنت احمد نگر کے تمام دست بازو جھڑ گئے اور اس کے تمام اعضائے سیاسی کا خاتمہ ہوچکا تھا لیکن یہ سلطنت کچھ ایسی سخت جان تھی کہ اس کے باوجود اس کا کچھ نہ کچھ تسمہ لگا رہا جنیر۔ پونا۔ چاکن وغیرہ کے اقطاع ابھی نظام شاہی افسروں کے ہاتھ میں تھے اور پرینڈہ جو اب نظام شاہی طاقت کا مرکز بن گیا تھا مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود تھا۔ شاہ جی نے نظام شاہی خاندان کے ایک اور لڑکے کو بادشاہ بنا کر پرینڈہ میں قدم جمالیا اور مغل علاقوں میں تاخت و تاراج شروع کردی۔ اس وقت دکن کے حالات بھی اس کے لیے بڑے خوشگوار ثابت ہوئے۔ شاہجہاں دکن میں نہیں تھے اور مغل سپہ سالار مہابت خاں جس نے دولت آباد کی تسخیر کی تھی راہی عدم ہوچکا تھا۔ اس صورت حال کے مقابلے کے لیے مغل سلطنت نے پھر جنبش کرنا ضروری سمجھا چنانچہ شاہجہاں پھر ۱۰۴۵ھ ۱۶۳۵ء میں دکن آگئے۔ پہلے برہان پور آئے اور اس کے بعد دولت آباد میں آکر قیام کیا۔ چونکہ بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں در پردہ احمد نگر کی مدد کرتی تھیں اس لیے پہلے ان سلطنتوں کو حاجبوں کے ذریعے تنبیہ کردی گئی کہ وہ اس طرز عمل سے باز آئیں، اور دولت آباد میں آنے کے بعد شاہجہاں نے اپنی فوج کے تین ۳ حصے کر کے ایک حصہ خان دوراں کے تحت قندھار اور ناندیڑ بھیجا کہ بیجاپور اور گولکنڈے کی پیشقدمی روکے۔ دوسرا حصہ خان زماں خاں کے تحت احمد نگر بھیجا گیا کہ آشٹی، اور کوکن پر وار کرے اور تیسرا حصہ شایستہ خاں کے تحت جنیر، اور ناسک کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا۔ اگرچہ مغلوں کی فوجیں بہت کافی تھیں اور اس اثنا میں محمد عادل شاہ والی بیجاپور نے بھی مغلوں کی اطاعت کرلی تھی اور بیجاپور کا مشہور جنرل رندولہ خاں مغلوں کے ساتھ لڑ رہا تھا، تاہم جنگ کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہوسکا کئی مہینوں کی لڑائیوں کے بعد شاہ جی نے ہتھیار ڈالے اور اس کو بیجاپور میں ملازمت کرنے کی اجازت دی گئی! اس طریقے سے ۱۰۴۵ھ ۱۶۳۵ء میں نظام شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا جس کے لیے مغل سلطنت کو چالیس سال لڑنا پڑا تھا۔

احمد نگر کے خاتمے کے بعد بیجاپور اور گولکنڈے پر اثر پڑنا ضروری تھا، لہذا بیجاپور اور گولکنڈے کی آزادی بھی سلب ہوگئی اور ان کو مغلوں کا حکم بردار بننا پڑا گو شہنشاہ ہونے سے پہلے شاہجہاں نے

قطب شاہی سلطنت سے خوشگوار تعلقات قایم رکھنے کی کوشش کی۔ گولکنڈے کے نئے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کو تخت نشینی کی مبارک باد دی، جس طرح ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے شاہ ابوالحسن اور مرتضیٰ نظام شاہ کی جانب سے شاہ میر جعفر، پرانے رواج کے مطابق مبارک باد کے لیے آئے، اسی طرح شہزادہ خرم (شاہجہاں) کی طرف سے اخلاص خاں قزوینی آیا تھا[1] اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہجہاں گولکنڈے کا پہلے سے بہت ممنون تھا، کیونکہ اس کی بغاوت کے زمانے میں سلطان محمد قطب شاہ نے اس کی بہت مدد کی تھی[2]، اور اب بھی وہ حصولِ تخت و تاج کے لیے گولکنڈے کی مدد کا محتاج تھا، لیکن جب وہ ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء میں شہنشاہ ہوگیا تو اس نے اپنے پرانے رشتے توڑ دیے اور حاکمانہ مطالبات شروع کیے، اور عبداللہ کی کمزور حکومت جو ہمیشہ جنگ و جدل سے گریز کرتی رہی، سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور تھی۔ چنانچہ گولکنڈے کی کمزوری سے مغل شہنشاہت کو بہت فایدہ پہنچا۔

تخت نشیں ہونے کے بعد شاہجہاں نے شیخ محی الدین پیرزادہ جین کو سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا گو یہ سفارت دوستانہ تھی لیکن اس کا رنگ بالکل وہ نہیں تھا جو اس سے پہلے اخلاص خاں قزوینی کے تحت آئی تھی۔ بات یہ ہے کہ اس وقت خانِ جہاں نے بغاوت کی تھی اس لیے شاہجہاں کو اس بغاوت کا سدباب کرنے کے لیے بیجاپور اور گولکنڈے سے اتحادِ عمل کی ضرورت تھی کہ یہ سلطنتیں احمد نگر کی مدد نہ کریں اور باغی کو اپنے ہاں پناہ نہ دیں[3] لیکن ایک طرف قطب شاہی حکومت کی کمزوری سے سیاسی معاملات خراب ہونے لگے، یعنی یہ مغلوں سے ایسی ڈر گئی کہ اس سفیر کی ضرورت سے زیادہ آؤ بھگت کرنے لگی جو سلطنت کے وقار کے منافی تھا[4]۔ دوسرے خود حاجب شہنشاہی رُعب سے کام لیکر سلطنت سے ناجایز فایدے حاصل

---

[1] حدیقۃ السلاطین (مطبوعہ) ص ۲۷ ـ ۲۸۔ [2] حدیقۃ السلاطین ص ۶۲۔

[3] ایک روایت یہ ہے کہ شاہجہاں کی جانب سے ہر مہینے سفارت آنے لگی (حدیقۃ السلاطین ص ۸۷)۔

[4] حدودِ سلطنت میں داخل ہونے سے پہلے سید عبداللہ خاں نے سفیر کا استقبال کیا، اور جب سفیر سرحد کے اندر آیا تو میر قاسم ناظر نے خیر مقدم کیا، اور قلعۂ درگ تک لایا، اور ہر منزل پر اس کی شاہی ضیافتیں ہوتی رہیں جو حوض درگ میں

کرنے لگا، اور بہتر سے مطالبات پیش کیے۔ بادشاہ اور اس کے پیشوا شاہ محمد ایسے کمزور تھے کہ سفیر کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے تھے، اس لیے عبداللہ قطب شاہ نے شاہ محمد کو خدمت سے علٰحدہ کرکے شیخ محمد کو جو اب تک صرف نایب پیشوا کے فرایض انجام دیتا تھا، پیشوا بنا دیا۔[1] شیخ نے پوری قوت سے مغل سفیر کے جواب دیے اور گولکنڈے کے آداب شاہی کی پابندی کروائی اور جب سفیر نے مزاحمت کی تو آصف خاں سے جو اس زمانے میں مغل افواجِ دکن کا سپہ سالار تھا، سفیر کی سخت شکایت کی گئی اور اس کا اچھا اثر ہوا، یعنی مغل حکومت نے اپنے سفیر کی پوری گوشمالی کی اور ۱۰۴۲ھ میں جبکہ شاہجہاں برہان پور آگئے تھے شیخ محی الدین کو واپس کر دیا گیا۔ جاتے ہوئے اس کو چند گھوڑے، ہاتھی اور بیس ہزار ہون نقد دیے گئے[2] اور اس کے ساتھ گولکنڈے کی طرف سے وفا خاں جس کا اصل نام یوسف تھا گرانبہا تحفوں کے ساتھ جن میں ہاتھی، گھوڑے خالص سونا، اور مرصع آلات شامل تھے، شاہجہاں کے پاس بھیجا گیا۔ شاہجہاں ان تحفوں سے بہت خوش ہوئے وفا خاں کو خلعت وغیرہ دی اور شیخ محی الدین کی سرزنش کی۔[3]

اس زمانے میں شاہجہانی افواج احمد نگر کے خلاف سرگرم کار تھیں۔ بالا گھاٹ کے مختلف اقطاع میں پیشقدمی ہونے لگی، اسی اثنا میں مغل افسر ناصری خاں قندھار پہنچ گیا جو گولکنڈے کے حدود سے قریب پڑتا تھا۔ یہ دیکھ کر قطب شاہی حکومت نے مدافعت کا انتظام کیا۔ چنانچہ آدم خاں حبشی کو جو عین الملکی کی حجابت پر مامور تھا اللہ قلی بیگ

خود بادشاہ آکر ملے، پھر شہر میں اس کو مرزا محمد امین کے باغ میں ٹھیرایا گیا، اس کے بعد محل میں بلاکر بادشاہ نے ایک ہاتھی دو گھوڑے، خلعت، انعام وغیرہ دیے۔ اس کے ساتھیوں کو بہت رقم دی گئی، اور اس کے بعد جب کبھی بادشاہ سے ملاقات ہوتی تھی ایک ہاتھی اور دو گھوڑے دیے جاتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح اپنے قیام کے زمانے میں اس صاحب نے ایک لاکھ پچاس ہزار نقد، دس ہاتھی، پچاس گھوڑے اور بے شمار خلعتیں حاصل کرلیں (حدیقۃ السلاطین ص ۶۲-۶۳)۔

[1] شیخ محمد کی علمی و سیاسی قابلیت مسلمہ تھی۔ مختلف شاہی دربار و شاہی حجابت کے فرایض انجام دے چکا تھا، اور سیاسی جوڑ توڑ سے اچھی طرح واقف تھا۔ [2] حدایقۃ السلاطین ص ۶۷۔ [3] حدیقۃ السلاطین ص ۸۷۔

اور دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ کولاس بھیجا گیا، اور ضروری فوج جمع کی گئی تاکہ اگر مغل آگے بڑھیں تو ان کی مزاحمت ہو۔
لیکن یہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ تاہم سلطنت کے شمال مشرقی حدود جو اڑیسہ کے ہمکنار تھے مغلوں کی پیشقدمی کی وجہ سے
مخدوش ہوگئے، کیونکہ باقر خاں نجم ثانی جو اڑیسہ کا مغل گورنر تھا، قاسم کوٹہ میں گھس گیا، اور رکالا پہاڑ میں لوٹ مار شروع کردی
اور اس سے آگے بڑھ کر راج مندری میں پیشقدمی کرنا چاہتا تھا۔ سید محمد مصطفےٰ خاں[لے] نے جو قاسم کوٹہ میں قطب شاہی افواج کا
سپہ سالار تھا مرکزی حکومت کو اس پیشقدمی کی اطلاع کردی۔ مرکز سے سید عبداللہ خاں اور شاہ علی مدافعت کے واسطے
بھیجے گئے، ان دونوں نے قطب شاہی حدود میں اپنے قدم جما لیے، لیکن اسی اثنا میں سید محمد مصطفےٰ فوت ہوگیا، اور اس کی جگہ
سید عبداللہ خاں کو سرلشکری دی گئی جب شمال سے باقر خاں نے حملہ کیا تو قطب شاہی فوج تاب نہیں لاسکی، شاہ علی
کھیت ہوگیا، اور قطب شاہی فوج منہزم ہوگئی عبداللہ قطب شاہ نے خواجہ افضل ترکہ کو جو اس زمانے میں مرتضےٰ نگر میں تھا
مغلوں کے مقابلے کے لیے بھیج دیا، اس نے قاسم کوٹہ میں باقر خاں کا مقابلہ کیا لیکن یہ لڑائی آگے نہیں بڑھی بلکہ مغل حکومت نے
اس کا سد باب کردیا[ٹے] کیونکہ اول تو اس لڑائی میں مغل حکومت کا کوئی ارادہ شامل نہ تھا، دوسرے ابھی شاہجہاں
قطب شاہی سلطنت سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شہنشاہی احکام کے مطابق باقر خاں نے قطب شاہی حدود سے
اپنی فوجیں ہٹالیں۔

لیکن فتح خاں کی چند روزہ اطاعت سے جو ۱۰۴۴ھ ۱۶۳۴ء میں ہوئی شاہجہاں کو اس قدر اطمینان ہوگیا کہ اب وہ
دکن کی دوسری سلطنتوں کو زیر کرنا آسان سمجھنے لگا[لے] چنانچہ جب قطب شاہی سفیر وفا خاں، شاہجہانی دربار میں پہنچا تو
اس کی عزت افزائی کی گئی لیکن اس کے ساتھ مغل سفیر شاہ علی بیگ کو گولکنڈہ بھیجا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ گولکنڈے کی
سلطنت پر اپنا اثر ڈالے اس لیے قطب شاہی دربار سے کثیر رقم اور جواہر طلب کیے جو گذشتہ تعلقات کے منافی تھا۔

لے۔ یہ امیر زنبیل مصطفےٰ خاں کا بیٹا ہے۔

لے۔ حدیقۃ السلاطین ص ۸۲-۸۳۔

عبداللہ قطب شاہ اور شیخ محمد ان مطالبات کے پورا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے کیونکہ دکن کے نئے حالات سے جو اس وقت مغلوں کے خلاف پیدا ہو گئے انھیں اپنے پہلو بچانے کا ابھی موقعہ تھا۔ بیجاپور کی سلطنت نے اس زمانے میں مغلوں سے اپنے پرانے تعلقات توڑ دیے اور احمد نگر کی تائید میں مغلوں سے برسرپیکار تھی، چنانچہ اسوقت آصف خاں کی بیجاپوری فوجوں سے لڑائی ہو رہی تھی، اگرچہ قطب شاہی حکومت نے اپنی پرانی روایت کے خلاف احمد نگر اور بیجاپور کا اس اڑے وقت میں کوئی ساتھ نہیں دیا، اور خاموشی اختیار کی[1]، مگر اس خوشگوار موقعے کی منتظر تھی کہ شاید مغل سلطنت کا ستارہ ڈوب جائے۔ اس لیے شیخ محمد نے مغل سفیر کو بہت روز تک دھوکے میں رکھا، اس کی ضیافتیں تو بہت کی گئیں لیکن شاہجہاں کے مطالبات پورے نہیں کیے، کیونکہ گولکنڈے کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بیجاپور کے مقابلے میں مغل فوجوں کو شکست ہو گئی، بالآخر سفیر کو بے نیل مرام واپس کر دیا گیا نیز شاہجہاں اس زمانے میں برہان پور میں نہیں تھے، بلکہ شمال چلے گئے تھے۔

لیکن جب ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۳ء میں مہابت خاں نے دولت آباد پر قبضہ کر لیا تو دکن کے حالات پھر بدل گئے اور شاہجہاں بھی ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں پھر دکن آ گیا۔ کیونکہ شاہ جی کی مزاحمت کی وجہ سے ابھی دکن کا مطلع صاف نہیں ہوا تھا، لیکن اب گولکنڈے اور بیجاپور کے لیے مزاحمت کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ جب شہنشاہ دریائے نربدا پر پہنچ گئے تو ہندیا کے مقام سے بیجاپور، اور گولکنڈے کے نام ان ہدایات کے ساتھ شاہی فرمان اور سفیر بھیج دیے کہ وہ

---

[1] محمد عادل شاہ نے احمد نگر کو بچانے کے لیے جبکہ مہابت خاں نے دولت آباد کا محاصرہ کیا تھا تو گولکنڈے سے بھی امداد طلب کی تھی، لیکن قطب شاہی حکومت نے مغلوں سے ڈر کر کوئی مدد نہیں کی بلکہ خواص خاں کے فریق کو جو بیجاپور میں مغلوں کے خلاف تھا نیچا دکھانے کی کوشش کی، اور اس پر طرّہ یہ کہ جب مغل سفیر شیخ معین الدین، بیدر میں گرفتار ہو گیا تو گولکنڈے سے اس کو مدد دی گئی، اور جھجھار سنگھ جو مغل سلطنت سے بغاوت کر کے گولکنڈے کی سلطنت میں آیا تو فوراً اس کو مغلوں کے حوالے کر دیا گیا (حدیقۃ السلاطین ص ۱۰۲)۔ ظاہر ہے کہ اس کمزوری سے نہ صرف گولکنڈہ، بلکہ پورے دکن کو نقصان پہنچا۔

مغل فوجوں کی مزاحمت نہ کریں بلکہ دکن کے امن و امان کے لیے مغل سلطنت کے ساتھ اتحاد عمل کریں گولکنڈے کو عبداللطیف گجراتی بھیجا گیا۔ اس سفارت کا انداز اور شاہی فرمان کا لہجہ بالکل حاکمانہ تھا، اور اس میں مندرجۂ ذیل مطالبات کیے گئے کہ جن کی تکمیل عین حکم برداری تھی۔ اس میں تین قسم کی تہدیدیں تھیں:۔

(۱) ایک یہ کہ اصحابؓ کبار پر تبرا نہ پڑھا جائے۔

"از روئے ارشاد حکم می فرمایم کہ از ملکِ خویش این امر قبیح و فعل شنیع بر طرف گرداند ورنہ۔۔۔
بر ما لازم است کہ در مقام تسخیر آن ملک شویم۔"

(۲) دوسرے شاہِ ایران کا نام خطبے میں نہ پڑھا جائے بلکہ:۔

"در آن ملک خطبہ بہ نام نامی و القاب سامی ما مزین باشد۔"

(۳) تیسرے شہنشاہ کی خدمت میں گرانبہا پیشکش ارسال کرے جس میں ہاتھی، آلات و جواہر ہوں اور اس میں وضاحت کر دی گئی تھی کہ یہ سب چیزیں اچھی قسم کی ہوں اور مقررہ اوقات پر پہنچنی چاہئیں ورنہ:۔

"افواجِ قاہرہ و عساکرِ منصورہ بہ آن ملک خواہند آمد۔"

اس فرمان میں سلطان محمد قطب شاہ کی تعریف بھی تھی اور اس سلسلے میں کہ "خدمتے کہ از ان مرحوم وقوع آمدہ" یہ سلطنت مرحوم کے بیٹے پر بحال کی جا رہی تھی۔[1]

شاہجہاں کے دوبارہ دکن آنے سے عبداللہ اس قدر سہم گیا کہ عبداللطیف گجراتی کے گولکنڈہ پہنچنے سے قبل ہی اس نے اپنے سفیر ملا تقیا کو بیش بہا تحفوں کے ساتھ شہنشاہ کے پاس بھیج دیا۔[2] اب شہنشاہ کے تہدیدی احکام کے خلاف چون و چرا ناممکن تھا۔ عبداللطیف کا بڑا استقبال ہوا، اور جگہ جگہ پر اس کی ضیافتیں ہوئیں،[3] اور جب

---

[1] بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد ا حصہ ۲ ص ۱۴۲ تا ۱۴۳۔ [2] اس وقت شاہجہاں دولت آباد آگئے تھے، ملا تقیا یہیں باریاب ہوا۔

[3] جب سفیر حدودِ سلطنت میں داخل ہوا تو کریم خاں اور اس کے بعد میر معزالدین مشرف نے استقبال کیا، اور حیدر آباد کے قریب شیخ محمد طاہر نے خیر مقدم کیا، اور اس کو میر جملہ ماضی کی حویلی میں ٹھیرایا گیا۔

بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو اس کو بے شمار انعامات دیے گئے لیکن شہنشاہ نے مزید دباؤ ڈالنے کے لیے خانِ دوراں کو گولکنڈے کے لیے اور خانِ زماں کو بیجاپور کے لیے روانہ کر دیا تاکہ یہ سلاطین کوئی جنبش نہ کر سکیں[1]۔ خانِ دوراں کی فوج ناندیڑ تک پہنچ گئی جو گولکنڈے کی سرحد سے بہت قریب تھا۔ سرحد کے لوگ سخت پریشان ہوئے۔ عبداللہ قطب شاہ نے نصیر الملک، عین الملک، یحییٰ بیگ اور شجاع الملک کو مدافعت کے لیے بھیجا، اور خود مرکز میں قلعۂ گولکنڈے کی مرمت کروائی اور قلعے میں ہتھیار اور توپیں اور ضروری غلّہ جمع کر دیا لیکن یہ تمام مدافعتی تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں کیونکہ شہنشاہ نے جو مطالبات پیش کیے تھے ان کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا[2]۔ شیخ محمد پیشوا نے عبداللطیف کی اپنے گھر میں پر تکلف ضیافت کی اور گفت و شنید کے بعد ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں ایک صلحنامہ یا "انقیادنامہ" لکھا گیا جس میں شہنشاہ کی تمام شرطیں تسلیم کی گئیں یعنی خطبے میں چار خلفائے راشدینؓ کو شاہجہاں کا نام لیا جائیگا[3] اور سکے پر

---

[1] گولکنڈے کا مورخ کہتا ہے کہ "شاہجہاں کو عبداللطیف سے متعلق کہ اس کا کس طرح خیر مقدم ہوا تھا، کوئی اطلاع نہ تھی۔ غالباً شہنشاہ نے یہ سمجھا تھا کہ اس کی شرطیں تسلیم نہیں کی گئیں" (حدیقۃ السلاطین)۔ [2] نظام الدین کہتا ہے کہ "اس مدافعتی انتظام سے عبداللطیف بہت گھبرایا، اور اس نے شاہجہاں کو اطلاع دی کہ عبداللہ قطب شاہ جو تحفے دے ان کو قبول کر لینا چاہیئے" (حدیقۃ السلاطین)۔

[3] خطبے سے متعلق عبداللہ قطب شاہ نے اپنے ملک کے علما سے رائے لی تھی کہ آیا یہ شرط تسلیم کرنی چاہیئے۔ علما نے خونریزی سے بچنے کے لیے اس کے متعلق اپنی رضامندی ظاہر کر دی (حدیقۃ السلاطین)

گولکنڈے کے سلاطین بہت زمانے سے ایرانی صفوی خاندان سے متحد تھے، اور اس کا محرک ایشیا کی خاص سیاست تھی یعنی ایران کی صفوی سلطنت شیعہ مذہب کی پیرو تھی اور اس کے مغرب میں سلطنتِ عثمانیہ اور مشرق میں سلطنتِ مغلیہ سنی مذہب کی پیرو تھیں۔ صفویوں کی ان دو طاقتوں سے ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اگر یہ دو طاقتیں متحد ہو جائیں تو ایران کو بہت کچھ نقصان پہنچتا۔ اس لیے شاہانِ صفوی دکن کی شیعہ سلطنتوں کو جن میں قطب شاہی سلطنت بھی تھی اپنے ساتھ یکجہت رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کی ہمسایہ مغل سلطنت ہمیشہ الجھی رہے۔ اور دکن کی شیعہ سلطنتیں بھی اپنے مذہبی اور سیاسی مصلحت کی بنا پر ایران سے ملی ہوئی تھیں (مقدمات رقعات عالمگیری نجیب اشرف صاحب)

اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ نے شروع سے سلطنت کا مذہب شیعہ قرار دیا تھا لیکن اس سلطنت کا تعلق ایران سے محمد قلی قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں شاہ عباس کا مشہور سفیر اغزلو سلطان، گولکنڈہ آیا، اور ایک مرصع تاج، خنجر، اور چالیس[40] عراقی گھوڑے پیش کیے۔ اس کے جواب میں حاجی قنبر علی اور اس کے بعد مہدی قلی سلطان گولکنڈے سے روانہ کیے گئے، اور جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو سنہ ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء میں مبارکباد کے لیے ایران سے حسین بیگ قبچاقی آیا، اور اس موقعے پر بھی تاج، خنجر اور پچاس[50] عراقی گھوڑے پیش کیے، اور یہاں سے سنہ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں شیخ محمد ابن خاتون ایران بھیجا گیا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب شیخ محمد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایران کا سفیر قاسم بیگ آیا۔ مبارکباد دی اور تحفے پیش کیے لیکن بدقسمتی سے گولکنڈے میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے محمد قلی بیگ کو گولکنڈے کے سر نوبت خیرات خان کے ساتھ یہاں بھیجا گیا۔ ایرانی سفیر گولکنڈے میں رہنے لگے اور ان کی بہت آؤ بھگت ہوتی تھی۔ یہ آمد و رفت برابر جاری رہی اور خطبے میں شاہِ ایران کا نام لیا جاتا تھا جس پر مغل حکومت کو بہت اعتراض تھا۔

شاہجہاں کا نام ضرب کیا جائیگا، نیز شاہجہاں کے نویں جلوس سے دو لاکھ ہون جن کی مالیت آٹھ لاکھ روپیے ہوتی ہے ہر سال شہنشاہ کے پاس، یا صوبہ دار دکن کے پاس بھیجے جائینگے! اور یہ وعدہ ہوا کہ تیس لاکھ روپیے جو گذشتہ بقایا ہے وہ بہ اقساط ادا کیے جائینگے، چنانچہ اس وقت ایک لاکھ روپیے کی ایک قسط ادا کی گئی، نیز ہون اور مغل سکے کی قدر میں جو فرق پڑیگا اس کی بھی تکمیل کی جائیگی،[۱] اگر کبھی بیجاپور کی سلطنت دست درازی کر بیٹھے تو مغل حکومت گولکنڈے کی مدد کریگی، اور آخر میں عبداللہ قطب شاہ نے لکھا کہ:-

"در حضور... مولانا عبداللطیف بر قرآن مجید دست گذاشتہ قسم یاد کردم کہ خلاف آنچہ
بعہد کردم از من سر نزند و اگر عیاذاً بخواستہ باشد مصدر خلاف آن گردم اولیائے دولت
قاہرہ در انتزاع ملک من محق خواہند بود"۔[۲]

اس انقیاد نامے کی تکمیل کے بعد عبداللطیف نے کئی مہینے حیدرآباد میں رہ کر اپنے سامنے معاہدے کی تکمیل کروائی۔ آخر میں حیات آباد میں اس کی پُر تکلف ضیافت ہوئی اور ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء میں یہ قیمتی تحفوں کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت میں واپس کیا گیا! ان تحفوں میں جواہر، کئی ہزار اشرفی، ایک سو ہاتھی، پچاس گھوڑے تھے جن کی جملہ مالیت چھ لاکھ روپیے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ قطب شاہی سفیر شیخ محمد طاہر بھی بھیجا گیا جب یہ لوگ دولت آباد کے قریب پہنچے تو شاہ علی بیگ۔ مرزا خاں قلی اور افضل خاں نے ان کا خیر مقدم کیا، اور یہ شہنشاہ کے سامنے پیش ہوئے تو ان کی غیر معمولی عزت ہوئی اور شہنشاہ نے قطب شاہی سفیر کو اپنے سفیر خواجہ طاہر کے ساتھ گولکنڈہ واپس کرتے وقت اپنی ایک تصویر جو طلائی فریم میں نصب تھی، نیز ہاتھی اور قیمتی کپڑوں کے کئی تھان عنایت کیے اور انقیاد نامے کے جواب میں اپنی طرف سے ایک عہد نامہ لکھ دیا جو طلائی تختی پر ماہ ربیع الثانی ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء میں کندہ کیا گیا تھا! اس کا خلاصہ یہ ہے:-

---

[۱] "بادشاہ نامہ" عبدالحمید لاہوری، جلد اول حصہ دوم ص ۱۸۰-۱۸۱۔ یہی دو لاکھ ہون گولکنڈے کی طرف سے نظام شاہی سلطنت کو بطور امداد دیے جاتے تھے۔ سالانہ خراج و بقائے سے متعلق شاہی مکتوب میں اس کی وضاحت نہیں تھی بلکہ حاجب نے زبانی کہا تھا کہ اس کی پابجائی ہونی چاہیئے۔ [۲] بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری ص ۱۸۰-۱۸۱۔

"چونکہ قطب الملک نے ہماری شرطیں تسلیم کر لی ہیں یعنی خطبے میں خلفائے راشدینؓ، اور ہمارا
نام لیا جا رہا ہے اور سکّے پر ہمارا نام مضروب ہو چکا ہے اور مقرّرہ پیشکش بھیج دی ہے اس لیے
تقصیراتِ گذشتہ او را عفو فرمودیم و ملکے کہ در تصرف آن عمدہ ارباب دول است برو
مقرر و مسلم داشتیم" اور جب تک ان شرطوں کی پابندی ہوگی ہم بھی اپنے وعدے کی پابندی
کرینگے اور گولکنڈے کو کوئی ضرر نہیں پہنچیگا۔"[1]

جب یہ شہنشاہی عطیات گولکنڈہ پہنچے تو عبداللہ قطب شاہ نے بڑے انکسار کے ساتھ شکریہ ادا کیا جس میں انتہائی خوشامدی
اور شکرانے کے طور پر ایک قیمتی ہاتھی جس کا نام گجموتی تھا، اور ایک قیمتی الماس شہنشاہ کے پاس روانہ کیے۔[2]

اس معاہدے سے جو ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء میں ہوا قطب شاہی سلطنت کی ہمیشہ کے لیے آزادی سلب ہوگئی اور اب یہ
مغل سلطنت کے زیرِ حمایت ایک ریاست یا محمیت ہو کر رہ گئی جس کا سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد سے برابر
ڈر لگ رہا تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سلطنت بیجاپور پر یہ شرطیں عائد نہیں کی گئیں حالانکہ اسی زمانے میں بیجاپور کی
قسمت کا بھی یہی فیصلہ ہوا، اور گولکنڈے کی طرح اس کو بھی ریاست بنا دیا گیا لیکن اس پر کوئی مذہبی شرط لگائی گئی
نہ خراج عائد کیا گیا غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپور کی حکومت گولکنڈے کی طرح کمزور نہ تھی۔

---

[1] ۔ "بادشاہ نامہ" عبدالحمید لاہوری، جلد اول حصہ دوم ص: ۲۱۰ ۔ ۲۱۱ ۔

[2] ۔ "بادشاہ نامہ" عبدالحمید لاہوری، جلد اول حصہ دوم ص ۲۱۴ ۔ ۲۱۵ ۔

پندرھواں باب

کرناٹک کی فتوحات اور ان کا بندوبست

جنگ تالیکوٹ سے بیجاپور اور گولکنڈے کو بہت فائدے پہنچے یعنے ان کو کرناٹک میں کئی فتوحات حاصل ہوئیں جن کی بہ دولت یہ سلطنتیں جنوب میں بہت پھیل گئیں اور ان کی دولت میں اضافہ ہوا جو ان سلطنتوں کی تاریخ کا بڑا باب ہے، لیکن ان فتوحات کو سب کچھ جنگ تالیکوٹ کا نتیجہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ تالیکوٹ کی ایک جنگ سے وجیانگر کی تمام طاقتوں کا یک لخت خاتمہ نہیں ہو سکا بلکہ اس سلطنت کے کئی اجزا باقی رہ گئے اور ان کو مغلوب کرنے کے لیے اور بے شمار لڑائیوں کی ضرورت تھی۔ رام راج کے خاتمے کے بعد اس کے بھائی تیرومل راج اور وینکٹ پتی کئی علاقوں پر قابض رہے، انھی کے جانشین جو رائل کہلاتے ہیں مشرقی کرناٹک کے حکمران تھے۔ ان لوگوں نے ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء میں پنگنڈے کو اپنا پائے تخت بنالیا تھا جو وجیانگر سے ۱۴۰ ایک سو چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے لیکن جب سلطنت بیجاپور اور گولکنڈے نے یہاں حملے شروع کر دیے تو ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں تمارایا جو غالباً وینکٹ پتی کا جانشین تھا پنگنڈے کو چھوڑ کر چندرگری میں آبسا[1] اور اس کو اپنا پائے تخت بنا لیا[2] لیکن اس کے آس پاس وجیانگر کے جتنے صوبہ دار اور زمیندار تھے وہ بھی خود مختار ہو گئے اور ان لوگوں نے اپنی راجدھانیاں قایم کرلیں۔ پنگنڈے کے رائل، تنجور، مدورا، چناپٹم کے نائک، اور سری رنگ پٹن کے وودیار تھے جو برائے نام چندرگری کے ماتحت تھے اور اصل میں

---

[1] تاریخ جنوب ہند جلد اول، دکیس ص ۶۱۔

[2] یہ رائل، راجہ چندرگری کے رشتہ دار تھے، جب انھوں نے بیجاپور کے حملے کا خاطر خواہ مقابلہ کیا تو اس کے صلے میں پنگنڈہ ان کو دیا گیا تھا۔

خود مختارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف یہ آپس میں لڑتے بھڑتے تھے بلکہ خود چندر گری کے راجہ سے دست بہ گریباں ہو جاتے تھے چنانچہ مدورا کے نائکوں نے بار ہا چندر گری پر حملہ کیا، اور اپنے فایدے کے لیے دکن کے مسلمان حملہ آوروں کو دعوت دی۔ اسی وجہ سے بیجاپور، اور گولکنڈے کے حملہ آوروں کے لیے خوشگوار مواقع ہاتھ آگئے۔

جنگ تالیکوٹ کے بعد احمد نگر اور بیجاپور کی سلطنتوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اول الذکر سلطنت شمال میں پیشقدمی کرے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق اس نے برار پر قبضہ کر لیا۔[1] اس کو جنوب میں حملہ کرنے کے مواقع نہیں البتہ بیجاپور، اور گولکنڈے کی سلطنتیں جن کی حدود کرناٹک سے ملتی تھیں جنوب میں پیشقدمی کرنے لگیں۔ چونکہ مغلوں کے تسلط کی وجہ سے شمال کے راستے بند ہو گئے تھے اس وجہ سے بھی یہ سلطنتیں کرناٹک میں نفوذ کرنے کے لیے مجبور تھیں۔ بیجاپور کے مشہور جنرل رندولہ خاں نے ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء میں کرناٹک کے بہت سے علاقے مثلاً بنکاپور، ہری ہر، بسواپٹن فتح کر لیے، اور بدنور تک بڑھ آیا۔ ۱۰۵۰ھ ۱۶۴۰ء میں سیرا مسخر ہوا، اور اس کے بعد ویلور، اور جنجی فتح ہو گئے۔ رندولہ خاں کے بعد بیجاپور کے دوسرے جنرل شاہجی نے فتوحات جاری رکھیں، بنگلور، اور جنجی مسخر کر لیے۔ گولکنڈے کی فتوحات ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہو چکی تھیں۔ جنگ تالیکوٹ کے بعد اس سلطنت نے اپنے بہت سے کھوئے ہوئے علاقے جن پر رام راج قابض ہو گیا تھا، حاصل کر لیے۔ ابراہیم کے جانشین محمد قلی قطب شاہ نے نہ صرف تلیم راج، اور وینکٹ پتی کے حملوں کو مسترد کر دیا، بلکہ کرناٹک کے مشہور قلعے نندیال، کلکور، اور موسلمورک فتح کیے۔ اس کے بعد گندی کوٹہ، اور پنکنڈے پر جہاں وینکٹ پتی نے اپنا پائے تخت بنا لیا تھا، حملہ کر کے فتح کر لیے۔ ان حملوں اور فتوحات کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کی بیرونی حدود مستحکم ہو جائیں تاکہ وجیانگر کی کوئی طاقت سر نہ اٹھا سکے۔ چنانچہ اس انتظام سے جنوب مشرقی حدود اس قدر قابل اطمینان ہو گئے کہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں ان علاقوں میں کوئی فوجی نقل و حرکت کی ضرورت داعی نہیں ہوئی۔

جب عبداللہ قطب شاہ کا عہد آیا تو اس میں اس زمانے کے حالات کے مدنظر قطب شاہی سلطنت نے پھر

---

[1] تاریخ جنوب ہند۔ ولکس ص ۹۱۔

کرناٹک کی طرف توجہ کی۔ غالباً اس توجہ کا محرک یہ تھا کہ بیجا پور کی طرف سے رندولہ خاں اور شاہجی کرناٹک میں پیشقدمی کر رہے تھے اور ان کی فتوحات سے ہر روز عادل شاہی سلطنت وسیع ہو رہی تھی۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ قطب شاہی سلطنت کو بھی توسیع سلطنت کا شوق ہوا لیکن جب تک مغل سلطنت سے معاملات کی یکسوئی نہیں ہوئی کرناٹک کی طرف توجہ کرنا ممکن نہیں تھا جب ۱۰۴۲ھ ۱۶۳۶ء میں مغلوں کے معاہدے سے اطمینان ہوگیا تو پھر فوجی نقل و حرکت شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اس سلطنت کے لیے صرف کرناٹک ہی ایک ایسا میدان تھا جہاں یہ اپنی جولانیاں دکھا سکتی تھی کیونکہ مغلوں کے تسلط کی وجہ سے شمالی راستے مسدود تھے، البتہ شمال مشرق میں جہاں تسخیر کی ضرورت تھی حملے ہوسکتے تھے چنانچہ ۱۰۶۲ھ ۱۶۵۲ء میں وزیگا پٹم پر قبضہ کیا گیا، اور قطب شاہی سلطنت تلنگانے کے آخری حدود تک پہنچ گئی۔ سکاکول، کو شمالی فوج کی چھاؤنی بنایا گیا۔ اتفاق سے عبداللہ قطب شاہ کے لیے محمد سعید جو اردستان سے ایک تاجر کی حیثیت میں آیا تھا، کرناٹک کی فتوحات کے لیے بہت موزوں ثابت ہوا۔ یہ پہلے سلطنت میں میر جملہ بنایا گیا، اور اس کے بعد اس کو کرناٹک کی طرفداری دی گئی، کرناٹک کی تسخیر اسی کے سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں جبکہ محمد سعید طرفدار بنایا گیا تھا کرناٹک میں قطب شاہی حدود دکیم سے، جو کڑپہ کے شمال مشرق میں واقع ہے، آگے نہیں تھے۔ اس سے آگے کرناٹک کی سطح مرتفع کو مسخر کرنے کی بہتیری کوششیں ہوئی تھیں، لیکن وہ سب ناکام ہو چکی تھیں، کیونکہ چندرگری کا راجہ سری رنگ رائل، یہاں کافی طاقتور تھا۔ کرناٹک کا طرفدار ہونے کے بعد میر جملہ نے یہاں اپنی طاقت بہت بڑھائی۔ یعنے اس کی فوج پانچ ہزار سوار، اور بیس ہزار پیدل، تین سو ہاتھی، چار پانچ سو اونٹ پر مشتمل تھی۔ اور ان کے علاوہ بیس ہزار بیل تھے جو سامانِ حرب لیجایا کرتے تھے۔ ان فوجوں میں اس نے باقاعدگی پیدا کی، اور مغربی فوجوں سے بھی کام لیا چنانچہ اس کی فوج میں فرانسیسی سپاہی۔ انگریزی۔ ولندیزی اور اطالوی بندوقچی اور توپچی بھی تھے،

لہ ۔ مدراس کے اوراق پارینہ جلد اول ص ۹۹ ۔ ۱۰۰۔

جن سے اس کو بہت مدد ملتی تھی[1]۔ سنہ ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء سے میر جملہ کے حملے شروع ہو گئے اور بہت جلد اس نے کڑپا۔ سدہوٹ فتح کر لیے، لیکن اس کی سب سے بڑی فتح گندی کوٹ کی تسخیر تھی جو سنہ ۱۰۵۶ھ ۱۶۴۶ء میں عمل میں آئی۔ گندی کوٹ کڑپہ کے قریب یرملائی پہاڑوں میں واقع ہے، ٹیورنیر کے الفاظ میں "یہ بڑا قلعہ تھا"۔ اس کی تسخیر سے مشرقی کرناٹک کے بڑے اور اہم حصے پر قطب شاہی قبضہ ہو گیا چنانچہ اس سے ڈر کر راجہ چندرگری، سری رنگ رائل نے مغلوں سے مدد کی درخواست کی تھی لیکن قطب شاہی سلطنت کی پیشقدمی میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ برابر ساحل تک بڑھتی گئی اور یعنی ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء تک تمام مشرقی کرناٹک ساحل سمندر تک قطب شاہی عملداری میں آگیا۔ سری رنگ رائل، میسور کی طرف بھاگ گیا۔ ان جدید فتوحات کی وسعت کوئی تین سو (۳۰۰) میل سے زیادہ تھی[2] اور ان کا محصول چالیس (۴۰) لاکھ ہون وصول ہوتا تھا۔

انگریزوں سے تعلقات

جب قطب شاہی حدود ساحل کارومنڈل تک پہنچ گئیں تو مغربی اقوام سے جو ان ساحلوں پر قابض تھیں، سیاسی تعلق ہونا ضروری تھا۔ پرتگالی تو بہت زمانے سے ساحل کارومنڈل پر قدم جمائے ہوئے تھے، چنانچہ یہ سان تھوم پر جو مدراس سے سات میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے قابض تھے۔ لیکن جب ان کے پیچھے یورپ کی دوسری قومیں یعنی انگریز، اور ولندیزی ہندوستان آئے تو پرتگالیوں سے ان کی کشمکش شروع ہو گئی۔ آخر الذکر دونوں قوموں نے سنہ ۱۰۰۹ھ ۱۶۰۰ء میں ہندوستانی ساحلوں پر اپنا قدم جمایا۔ ولندیزی پلی کٹ پر، انگریز مسولی پٹم پر اپنی تجارتی منڈیاں قایم کر کے تجارت کرنے لگے۔ انگریزوں کا توطن مسولی پٹم میں قطب شاہی سلطنت کی منظوری سے ہوا تھا، کیونکہ یہ قطب شاہی بندرگاہ تھی۔ یہ لوگ اپنا اثر بڑھانے کے لیے پرتگالیوں کو ساحل کارومنڈل سے خارج کرنا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے انگریزوں نے قطب شاہی اثر سے پہلے راجہ چندرگری سری رنگ رائل سے

---

[1] فرانسیسی سیاح ٹیورنیر کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ اس کی فوج میں نہ ہوتے تو وہ گندی کوٹ نہیں فتح کر سکتا۔ (سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۲۲۷)۔

[2] کرناٹک کے یہ علاقے جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مسخر ہوئے تھے وہ اصطلاح میں "قبلہ پٹی" کہلاتے ہیں۔

۱۶۴۳ء میں ایک "قول" کی تکمیل کرکے مدراس حاصل کر لیا تھا! اس قول کی رُو سے انگریزوں کو قلعہ سینٹ جارج کی تعمیر کی اجازت، و محصول در آمد و بر آمد سے استثنا حاصل ہو گیا، اور مدراس کے آس پاس کی تمام زمین مل گئی جس میں ان کو عدالتی اختیارات حاصل ہو گئے،[1] اور جب ۱۰۵۶ھ ۱۶۴۶ء میں یہاں قطب شاہی عملداری قایم ہو گئی اور میر جملہ بڑھتے بڑھتے سان تہوم تک پہنچ گیا تو انگریزوں نے پرتگالیوں کی مخالفت میں اس کا پُر جوش خیر مقدم کیا، اور پرتگالیوں کی لڑائی میں اس کی مدد کی اور اپنے توپچی اور سپاہی دیئے چونکہ اب کرناٹک میں قطب شاہی عملداری قایم ہو گئی تھی اس لیے سری رنگ رائل کا پُرانا "قول" جو مدراس کے بابت دیا گیا تھا، فسخ ہو گیا تھا، اس لیے انگریز کمپنی کے صدر ایوی نے میر جملہ سے تجدید قول کی درخواست کی۔ میر جملہ نے اپنی چند شرطیں منوا کر اور انگریزوں سے ضروری توپیں حاصل کرکے ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء میں پُرانے قول کی توثیق کر دی۔ چنانچہ اس توثیق کی رُو سے انگریزوں کو وہی حقوق مل گئے جو ان کو سری رنگ رائل کے تحت حاصل تھے۔

آیندہ دس سال اطمینان سے گزرے لیکن ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۶ء میں یہ مشکل آ پڑی کہ محمد سعید میر جملہ اپنے مربی سلطنت کے خلاف بغاوت کرکے مغلوں سے مل گیا! اس بغاوت سے قطب شاہی کرناٹک میں افراتفری پیدا ہو گئی اور ممکن ہے کہ اس میں خود میر جملہ کا بھی ہاتھ ہو۔ سری رنگ رائل جو میسور بھاگ گیا تھا وہ پھر ویلی کٹ اور چنا ملی پر حملہ آور ہو گیا،[2] اور قطب شاہی حکومت کو پھر اس طرف توجہ کرنی پڑی لیکن مشکل یہ تھی کہ اسی زمانے میں میر جملہ کی بغاوت کی وجہ سے مغل سلطنت سے ایک لڑائی ہو گئی۔ جب اس لڑائی سے فراغت ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ نے نیک نام خاں[3] کو جو میر جملہ کے تحت کرناٹک میں کام کر چکا تھا، اس صوبے کا سر لشکر اور طرفدار مقرر کیا۔ غالباً ۱۰۶۷ھ ۱۶۵۷ء میں نیک نام خاں

---

[1] ۔ اس "قول" کی تاریخ ۱۵ ر نومبر ۱۶۴۳ء ہے (مدراس کے اوراق پارینہ جلد اول ص ۵۹۲)۔

[2] ۔ مدراس کے اوراق پارینہ ص ۱۶۶۔

[3] ۔ اس کا اصل نام رضا قلی ہے۔ یہ پہلے ایران میں شاہ عباس صفوی کا ملازم تھا، غالباً یہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں

کرناٹک آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کرناٹک کے کام کے لیے نیک نام خاں سے زیادہ موزوں آدمی نہیں تھا۔ پہلے تو اس نے ہندو طاقتوں کا مقابلہ کیا، اور شکستیں دیں اور چند ہی روز میں تمام قطب شاہی مقبوضات حاصل کر لیے۔ ۱۰۷۰ھ ۱۶۵۹ء میں اس کی فوجیں مدراس کے قریب پہنچ گئیں۔ رسان تھوم پر جہاں پرتگالیوں کو خارج کر کے قطب شاہی عملداری قایم کی گئی تھی، ولندیزی بڑھ رہے تھے۔ ۱۰۷۳ھ ۱۶۶۲ء میں نیک نام خاں نے سان تھوم کا محاصرہ کر لیا، اور قطب شاہی قبضہ ہو گیا۔ اس طریقے سے میر جملہ کی غداری کے باعث جو سیاسی تلاطم برپا تھا، اس کا سد باب ہو گیا۔ نیک نام خاں نے کوئی چالیس ہزار فوج کے ساتھ پیشقدمی کی تھی۔ ایڈورڈ ونٹر جو اس زمانے میں انگریزی کمپنی کا صدر تھا، ایک خط

گولکنڈہ آیا، اور محمد سعید میر جملہ کے تحت کرناٹک میں مامور کیا گیا۔ پہلے اس کو رضا خاں کا خطاب ملا، اور جب میر جملہ کی بغاوت کے بعد کرناٹک میں اس سے اہم کام انجام پائے تو اس کو نیک نام خاں خطاب دیا گیا۔ اس نے محمد سعید سے زیادہ قابلیت کے ساتھ کرناٹک کا بند و بست کیا تھا۔ اس کے وفادارانہ کام سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو ۱۰۸۱ھ ۱۶۷۰ء میں سلطنت کا دیوان بنا دیا، اور اس سے سلطنت کے دوسرے اہم کام لیے۔ نیک نام خاں نے قطب شاہی سلطنت کی بڑی وفادارانہ خدمت کی۔ فوجی اور غیر فوجی بڑے کام کیے۔ وزارت کے فرایض اس خوبی سے انجام دیے کہ اس کا نام اب تک زبان زد ہے۔ یہ عالم و شاعر تھا، اس وجہ سے علماء کی بڑی سرپرستی بھی کی۔ محمد ابراہیم خادم نے جو نیک نام خاں سے بہت وابستہ تھا، اس کی تعریف میں ایک بڑی مثنوی لکھی ہے جس کا پہلا شعر ہے:۔

رضا خان جم نور خورشید رائے ز سر تا بہ پا محض لطف خدائے

خود اس کا کلام بھی بہت دستیاب ہوتا ہے۔ عبد اللہ قطب شاہ کی وفات (۲۱ اپریل ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء) کے چند دنوں کے بعد ۱۲ رمضان ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء کو نیک نام خاں کا انتقال ہوا۔ اس کی وفاداری کی وجہ سے عبد اللہ کے جانشین نے اس کی اس قدر کی کہ اس کو قطب شاہی مقبروں کے قریب دفن کیا، اور اس کے ایصال ثواب کے لیے ایک موضع وقف کر دیا۔ قبر کے کتبے میں اس کو "مغفرت پناہ"، "جنت مکان" لکھا گیا ہے۔

مورخہ ۱۰ ردسمبر ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں لکھتا ہے کہ نیک نام خاں چالیس ہزار فوج کے ساتھ مدراس کے قریب پڑا ہوا ہے، لیکن اس ضروری کام کے ساتھ اس نے مزید فتوحات بھی حاصل کرلیں، یعنی اگر حدیقۃ السلاطین کے الفاظ پر اعتماد کیا جائے تو "تمام آن مملکت تسخیر نمودہ" یعنی کرناٹک کے زرخیز اقطاع جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے سخر کیے گئے، غالباً گوتی کرم کنڈہ اس نے فتح کیے تھے اور یہ کندی کوٹہ اور سدھوٹ کے ساتھ شامل ہوکر جو میر جملہ کے زمانے میں فتح ہوئے تھے ایک مستقل سلطنت ہوگئی تھی اس کو نیک نام خاں کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔

نیک نام خاں کی اس پیشقدمی سے انگریز کمپنی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی! ایک تو اس وجہ سے کہ یہ چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ سینٹ طامس پر قبضہ کر بیٹھا تھا جو مدراس کے قلعۂ سینٹ جارج سے بہت قریب ہے۔ نیز نیک نام خاں انگریز کمپنی کا بہت مخالف تھا، اس کو ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء کے "قول" سے جو میر جملہ نے انگریز کمپنی کو عطا کیا تھا، اتفاق نہیں تھا، یہ انگریزوں سے جدید قول چاہتا تھا تاکہ ان سے زیادہ رقم وصول ہو، کیونکہ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء کے قول کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ انگریز کمپنی کروڑگیری کی آدھی رقم گولکنڈے کی حکومت کو دیا کریگی، اگر قول کے مطابق اس کی پابجائی ہوتی تو کوئی مضایقہ نہیں تھا، لیکن ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء میں گریبن ہل نے ایک اور شکل اختیار کرلی تھی یعنی بجائے آدھی کروڑگیری ادا کرنے کے صرف تین سو اسی ہون سالانہ ادا کرتا تھا، اور اس کو "شہر کا کرایہ" کہا جاتا تھا، یعنی یہ رقم کمپنی مدراس کی سکونت کے معاوضے میں قطب شاہی سلطنت کو ادا کرتی تھی لیکن انگریز کمپنی کے بیان کے مطابق جب نیک نام خاں ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں کرناٹک کا گورنر ہو کر آیا تو اس نے یہ رقم لینے سے انکار کردیا، اور نہ صرف کروڑگیری کی تمام رقم طلب کی بلکہ یہ بھی کہا کہ میں مدراس میں ایک حوالدار رکھوں گا جو سختی کے ساتھ تمام رسایدکی تنقیح کیا کریگا! انگریز کمپنی اس سے بہت ڈرگئی۔ ونٹر نے رعایت چاہی، لیکن نیک نام خاں نے ایک نہ سُنی، کمپنی کو اس کی شرائط ماننی پڑیں۔ لیکن بدقسمتی سے کرناٹک کے نائکوں نے پھر شورش شروع کردی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیک نام خاں کی تمام فوجیں اس شورش کے سدباب کے لیے متوجہ ہوگئیں اور کمپنی کو چندروز کے لیے دم لینے کا موقع مل گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء تک نیک نام خاں کو کئی سال اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ نائکوں کی شورش سے فراغت پاکر ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء میں

اس نے پھر انگریزوں کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے میں ونٹر کی جگہ فاکس کرافٹ کمپنی کا صدر ہو کر آیا تھا، نیک نام خاں نے اس سے مطالبات کیے، کرافٹ نے لیت ولعل کیا تو مدراس کے راستے بند کر دیے گئے اور ٹریلی کین پر قبضہ ہو گیا جس سے اہل مدراس اور کمپنی کو بہت تکلیف ہوئی اور کمپنی ایسی مجبور ہوئی کہ بالآخر ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۲ء میں نیک نام خاں کے تمام مطالبات منظور کر لیے۔ گذشتہ بقائے میں گیارہ ہزار ہون ادا کر دیے اور آیندہ شہر مدراس کا کرایہ سالانہ ایک ہزار دو سو ہون ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ "قول" فاکس کرافٹ کے جانشین لینگ ہارن سے طے ہوا۔

۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں قطب شاہی سلطنت میں بڑی تبدیلی ہو گئی، یعنی اسی سنہ میں عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہو گیا، اور اس کی جگہ اس کے داماد ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی، لیکن اس تغیر سے حکومت کرناٹک کے مسلک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عبداللہ قطب شاہ کی وفات کے چند دنوں بعد ہی نیک نام خاں کا بھی انتقال ہو گیا، اور اس کی جگہ نئے بادشاہ نے موسیٰ خاں کو کرناٹک کا طرفدار مقرر کر دیا۔ اس نئے طرفدار نے ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۴ء میں نیک نام خاں کے "قول" کی توثیق کر دی، اور اسی سال بادشاہ نے رچرڈ موہن کو جو مسولی پٹم کا صدر تھا، بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت دے دی لیکن ایک سیاسی دشواری یہ پیدا ہوئی کہ عبداللہ قطب شاہ اور نیک نام خاں کے مرنے کی وجہ سے فرانسیسیوں کو جو مدراس کے جنوبی ساحلوں پر قابض تھے پھر جرأت ہو گئی اور انھوں نے میدان خالی دیکھ کر سان تہوم پر دھاوا بول دیا۔ فرانسیسی قطب شاہی سلطنت پر پہلے سے خار کھائے ہوئے تھے کیونکہ اس سلطنت نے مسولی پٹم میں انگریزوں کے مقابلے میں ان کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔ اس وقت فرانسیسی مقبوضات کے گورنر ڈی لاہے نے سید مظفر کو جو اس زمانے میر جملہ تھا، اپنے ساتھ ہموار کر لیا۔ سید مظفر، اور موسیٰ خاں میں عداوت تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت سے موسیٰ خاں کی کوئی مدد نہیں کی گئی اور اس کو پسپا ہونا پڑا۔ فرانسیسی سان تہوم پر قابض ہو گئے اور مسلمانوں کی کشتیوں اور جہازوں کو نقصان پہنچانے لگے۔ سید مظفر کی طرفداری کی وجہ سے نہ صرف حکومت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی بلکہ اس کے اشارے سے بادشاہ ان کو ایک لاکھ کراون کے معاوضے میں سان تہوم تفویض کرنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن موسیٰ خاں خاموش نہیں رہا، بلکہ اس نے باباصاحب کو فوج کی کمان دی اور اس کے بعد

چناپلی مرزا کو فرانسیسیوں کے مقابلے میں بھیجا، اور اس نئے حملے سے سان تھوم کی بازیافت چند دنوں کی بات رہ گئی تھی، لیکن سید مظفر نے پھر بے وفائی کی، اس خیال سے کہ مبادا موسیٰ خاں کا۔ تار بڑھ جائیگا، اس کو مرکز میں واپس بلا لیا، اور اس کی جگہ نام دار خاں مامور کیا گیا لیکن اس تبدیلی سے لڑائی میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ چناپلی مرزا فرانسیسیوں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ چونکہ ولندیزی اور انگریز بھی ان کے مخالف تھے اس لیے ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں فرانسیسیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قطب شاہی فوجیں سان تھوم پر قابض ہوگئیں، اور اسی زمانے میں بادشاہ نے سید مظفر کو خدمت سے علحدہ کرکے مادنّا کو وزیر بنا دیا تھا جو نیک نام خاں کے مسلک کا پابند تھا۔

قطب شاہی فوجوں کی اس کامیابی سے انگریزوں پر خاطر خواہ رُعب بیٹھ گیا، چنانچہ انھوں نے حکومت کو خوش کرنے کے لیے مرکزی اور مقامی عہدہ داروں کو بے شمار نذرانے اور تحفے دیے۔ مرکزی حکومت میں بادشاہ اور اس کے دیوان مادنّا، و پیشکار اکنّا تھے، اور کرناٹک میں نام دار خاں کے بعد مسکی میاں اور اس کے بعد محمد ابراہیم خلیل اللہ کرناٹک کے طرفدار مقرر ہوئے تھے۔ ان سب کو انگریز کمپنی نے بے شمار نذرانے اور تحفے دیے جن میں کپڑے۔ آلات۔ ہتھیار وغیرہ شامل تھے۔ جو تحفے ابوالحسن قطب شاہ کو دیے گئے تھے ان کی مالیت چار سو پچھانو ہون[۴۹۵] تھی۔ اس کے علاوہ مادنّا کو ایک سو چوراسی ہون[۱۸۴] اور نواب مسکی میاں کو ساڑھے اٹھیانوے ہون[۹۸½]، اور اکنّا کو ساڑھے باون ہون[۵۲½] کی مالیت کے تحفے دیے گئے۔ اس کے علاوہ جب کرناٹک کے طرفدار محمد ابراہیم کے بیٹے سکندر (جس کا خطاب "سنجر خاں" تھا) کی شادی مدراس میں ہوئی تو اس موقع پر بھی انگریزوں نے اس کو چار سو ہون[۴۰۰] نذرانہ دیا تھا۔ جب کبھی بادشاہ نے ملک کا دورہ کیا، اور مسولی پٹم کے معاینے کے لیے گیا تو تمام کمپنیوں نے اس کی خدمت میں گراں قدر نذرانے پیش کیے چنانچہ ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء کے دورے میں کافی نذرانے ملے، اور جب ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء کا دورہ ہوا تو ولندیزوں نے بادشاہ کو دس ہزار ہون[۱۰] اور انگریزوں نے تین ہزار ہون[۳] نذرانہ دیے۔ اس سنہ میں جب اکنّا، اور مادنّا کے بیٹوں کی شادی قرار پائی تو اس موقع پر بھی انگریز کمپنی نے ان وزرا کو سو ہون[۱۰۰] نذرانہ دیا تھا۔ اس زمانے میں انگریز کمپنی کا صدر لینگ ہارن کی جگہ اسٹرنیہام ماسٹر تھا جو ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء میں صدر مقرر ہوا تھا۔

ابو الحسن قطب شاہ کا عہد حکومت جس میں مادنا وزیر تھا، انگریز کمپنی کے لیے مت سخت ثابت ہوا انگریز کمپنی کو اپنے عرایض بادشاہ تک پہنچانے کے لیے مرکزی حکومت میں اپنا ایک سفیر رکھنا پڑتا تھا۔ مادنا کی ابتدائے وزارت میں انگریز کمپنی نے چند ا رموضع کرایے پر لینے کی کوشش کی اور اجازت چاہی لیکن مادنا دیوان نے یہ درخواستیں اس وجہ سے رد کردیں کہ اس سے سلطنت کا بہت نقصان تھا۔ ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۴ء میں جب اسٹرنہام ماسٹر کی جگہ گے فورڈ صدر ہو کر آیا، اور اس نے نہایت انکسارت درخواست کی تو بڑی مشکل اور غور وخوض کے بعد اس کو مدراس میں، صرف چاندی کے سکے بنانے کی اجازت دی گئی، لیکن شرط یہ تھی کہ وہ قطب شاہی سکے کے ہم وزن اور ہم قدر ہوں۔ تانبے کے سکوں کی اجازت نہیں ملی مغربی قوام کے مقابلے میں دیسی تاجروں کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی تاکہ یہ لوگ پیچھے نہ رہیں۔ مقامی عہدہ دار بھی انگریزوں سے سختی کے ساتھ سلطنت کے وقار کی خاطر قاعدوں کی پوری پابندی کرواتے تھے۔ چنانچہ پودلی لنگپا جو تقریباً ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء میں پونا ملی کا طرفدار مقرر ہوا تھا، اور بعد کو مسولی پٹم کی نگرانی بھی اس کے سپرد ہوئی، بہت سخت گیر آدمی تھا۔ اس نے انگریزوں سے قانون ملک کی پوری پابندی کروائی چنانچہ ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء کا واقعہ ہے کہ لنگپا نے ان علاقوں کا دورہ کیا جہاں انگریز کمپنی متمکن تھی۔ اہل کمپنی نے اس کا استقبال نہیں کیا، اور بادشاہ کی طرف سے جو خلعتیں آئی تھیں وہ قبول نہیں کیں۔ اس کے علاوہ لنگپا کو یہ بھی شکایت تھی کہ کمپنی دیسی تاجروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی، یعنی انگریزوں کو تو بلا محصول درآمد و برآمد کی اجازت تھی لیکن جب دیسی تاجر اپنا سامان مدراس میں لاتے تھے تو ان پر انگریز کمپنی محصول لگاتی تھی چنانچہ اس کی پاداش میں لنگپا نے مدراس کو محصور کرلیا، اور درآمد و برآمد بند کردی۔ کمپنی بالآخر مجبور ہوگئی اور لنگپا کے شرایط تسلیم کرلیے۔ ۱۰۸۸ھ ۱۶۷۷ء میں جبکہ اسٹرنہام ماسٹر کمپنی کا صدر مقرر ہوا تو لنگپا سے ایک اور آویزش ہوگئی، یعنی کمپنی قلعہ سینٹ جارج کی مرمت کے لیے دیسی تاجروں پر محصول عاید کرنے لگی، اور دوسرے مدراس کا کرایہ براہ راست مرکزی حکومت کو بھیجا جاتا تھا جس سے لنگپا کو اعتراض تھا۔ جب کمپنی مخالفت پر اڑ گئی تو لنگپا نے ۱۰۸۹ھ ۱۶۷۸ء میں مدراس کا محاصرہ کرلیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی نے نذرانہ دے کر معافی مانگی۔ کمپنی نے لنگپا کو نیچا دکھانے کے لیے بہتری کوششیں کیں کہ اپنا مرکز سے تعلق ہوجائے، لیکن مرکزی حکومت نے منظور نہیں کیا، برخلاف اس کے لنگپا کا

وقار بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء میں پورے کرناٹک کا گورنر ہو گیا۔ اور کمپنی کی کوئی کاروائی لنگپا کے توسط کے بغیر مرکز میں نہیں آ سکتی تھی جب ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۶ء میں لنگپا اپنی خدمت سے علحدہ ہوا، اور اس کی جگہ عبدالنبی خاں مقرر ہوا تو اس نے بھی لنگپا کے مسلک کی پابندی کی، چنانچہ اس کے زمانے میں بھی انگریز اور ولندیزی، قانون شکنی کی جرات نہیں کر سکے جب ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں جنگ ملکھیڑ ہوئی اور قطب شاہی سلطنت مغلوں کے مقابلے میں منہزم ہو گئی تو اس سے فایدہ اٹھا کر انگریز اور ولندیزی کمپنیوں نے مسولی پٹم پر قبضہ کرنا چاہا، اور ادائی کرایہ سے پہلو تہی کرنے لگیں، لیکن یہ ناممکن تھا، سلطنت نے ان سے سختی سے کرایہ وصول کر لیا۔ البتہ ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں جب گولکنڈے کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو انگریز کمپنی کی بالآخر مرادیں بر آئیں اور یہ ایسی مقتدر ہوئی کہ پورے دکن پر مسلط ہو گئی۔ اگر مغل، قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ نہ کرتے تو قرائن یہ ہیں کہ انگریز کمپنی کو یہ ترقی نصیب نہ ہوتی۔

شیواجی سے تعلقات: قطب شاہی سلطنت نے کرناٹک کی مزید فتوحات کے لیے مرہٹوں کے مشہور رہنما شیواجی سے بھی کام لیا تھا۔ ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں جبکہ بیجاپور اور صوبہ دار دکن بہادر خاں کو کشاکش میں لڑائی ہو رہی تھی خود شیواجی بھی کرناٹک میں لشکر کشی کر کے روپیہ اور علاقے حاصل کرنا چاہتا تھا، کیونکہ اول تو شیواجی کا بھائی یکوجی کرناٹک کے اکثر علاقوں پر قابض تھا جو اس کے باپ شاہ جی کے مفتوحہ تھے۔[1] اس کے علاوہ اس زمانے میں شیواجی نے مغل سلطنت سے صلح کر لی تھی، اور اس صلح کی وجہ سے اب وہ شمال میں اپنا قدم نہیں بڑھا سکتا تھا لیکن کرناٹک کی یہ فتوحات قطب شاہی امداد کے بغیر ممکن نہ تھیں، اس لیے شیواجی ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۷ء میں حیدر آباد آیا، اور قطب شاہی سلطنت سے ایک قرار داد کر لی گولکنڈے کے

---

[1] شاہ جی نے بیجاپور کی طرف سے جنجی تک کرناٹک کے بہت سے علاقے فتح کیے تھے اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا یکوجی، جو شیواجی کا بھائی تھا، ان علاقوں کا طرفدار تھا، اس زمانے میں یہ تنجور، اور مدورا کے نائکوں کی باہمی کشمکش سے فایدہ اٹھا کر تنجور پر قبضہ کر بیٹھا تھا۔ یکوجی کی یہ ترقی شیواجی کے لیے حد درجہ تکلیف دہ تھی، وہ یکوجی کو ہٹا کر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

ارباب سیاست جن میں بادشاہ اور اس کا وزیر مادنّا دونوں شامل ہیں شیواجی کے اتحاد کو اس وجہ سے ضروری سمجھتے تھے کہ مغلوں کے ڈر سے وہ خود کرناٹک میں پیشقدمی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ مغل سلطنت محمد سعید میر جملہ کی عیاری کی وجہ سے کرناٹک پر آنکھ لگائے ہوئے تھی اور میر جملہ کے مفتوحہ علاقے طلب کر رہی تھی۔ شیواجی سے معاہدہ یہ ہوا کہ دونوں طاقتیں مغلوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ دوسرے شیواجی کی فوجی خدمات جو کرناٹک میں ہونے والی تھیں، اس کے معاوضے میں قطب شاہی سلطنت کی طرف سے ایک لاکھ ہون شیواجی کو دئیے جائینگے، اور جب تک وہ کرناٹک میں ٹھیرا رہیگا فوجی اخراجات کے لیے تین ہزار روپیے ہر روز دئیے جائینگے، اور کرناٹک میں جو فتوحات حاصل ہونگی ان میں سے شاہ جی کے مقبوضات کو چھوڑ کر باقی قطب شاہی سلطنت کو ملینگی۔

بہ ظاہر یہ معاہدہ خوشگوار معلوم ہوتا تھا، کیونکہ اس سے یہ توقع تھی کہ قطب شاہی سلطنت کے تمام منصوبے شیواجی کے توسط سے حاصل ہو جائینگے لیکن شیواجی نے اس معاہدے کی ذرہ برابر پابندی نہیں کی اس نے گولکنڈے کو سبز باغ دکھا کر تمام فایدے تو حاصل کر لیے لیکن کرناٹک کی فتوحات میں سے اس سلطنت کو کچھ نہیں دیا، جو کھلی بدعہدی تھی۔ اس نے ایک طرف قلعہ جنجی فتح کر لیا، کیونکہ یہاں عادل شاہی عہدہ دار ناصر محمد اور شمشیر خاں آپس میں لڑ رہے تھے اور ابوالحسن قطب شاہ سے مدد مانگی تھی، دوسری طرف اس نے سطح مرتفع میسور کے بے شمار علاقے اور قلعے فتح کر لیے۔ مفتوحہ قلعوں کی تعداد سَو بتائی جاتی ہے اور ان کی آمدنی چالیس لاکھ ہون تھی، کیونکہ یہاں سونے اور جواہر کے معدن بھی تھے، لیکن شیواجی ان فتوحات میں سے گولکنڈے کو کچھ نہیں دیا، بلکہ یہاں سے سیدھے بیجاپور چلا گیا۔ قطب شاہی حکومت شیواجی کے اس غلط طرز عمل سے بہت برافروختہ ہو گئی۔ مادنّا نے محمد ابراہیم سرلشکر کو جنجی اور ویلور کے قلعوں پر وار کرنے کے لیے بھیجا اور ادھر لنگپا کو حکم ہوا کہ میسور کے مفتوحہ علاقوں پر دھاوا کر کے مرہٹہ اقتدار اٹھے سلب کر لیں۔ لیکن اس کے خاطر خواہ نتایج برآمد نہیں ہوئے۔[1]

---

[1] اس باب میں کرناٹک اور مغربی اقوام سے متعلق جو معلومات درج کیے گئے ہیں ان میں اکثر مدراس کے انگریزی وثایق سے حاصل ہوئے ہیں، اور مجھے بھوپال راؤ صاحب ام۔ اے کے توسط سے ملے۔ ان کے لیے میں موصوف کا بہت ممنون ہوں۔

سولھواں باب

مغل سلطنت سے پرخاش

نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ اور گولکنڈہ و بیجاپور کی حکم برداری، دونوں لازم و ملزوم تھے، اس واقعے کے بعد دکن کی فضا ایسی خاموش ہوگئی کہ آیندہ بیس سال تک کوئی تلاطم نہیں ہوا، اور مغل سلطنت کو اس طرف کوئی توجہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں جب شاہجہاں نے دکن کے معاملات سے فراغت پائی تو شہزادہ اورنگ زیب کو دکن کا صوبہ دار بنایا، اور خود شمال چلا گیا۔ یہ اورنگ زیب کی پہلی گورنری ہے جو ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء سے ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء تک جاری رہی۔ اس دوران میں مغل علاقوں کی خاطر خواہ نگہداشت ہوئی اور گولکنڈہ و بیجاپور کی ریاستوں نے اپنے معاہدوں کی پوری پابندی کی اور شکایت کی کوئی وجہ نہیں پیدا ہوئی لیکن جب شمال کے ناگزیر حالات میں اورنگ زیب کو اس نظامت سے برخاست کیا گیا تو دکن کے حالات پھر خراب ہوگئے، کیونکہ اس کے بعد جو لوگ دکن کی نظامت پر مامور ہوئے تھے وہ اس کام کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ خانِ دوراں۔ جے سنگھ، اسلام خاں مشہدی۔ شاہ نواز خاں۔ مراد بخش، اور شایستہ خاں، سب ناکام ہوئے۔ ان لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے نہ صرف دکن کے چاروں صوبوں (جو راست مغلوں کی عملداری میں تھے) کی حالت خراب ہوگئی اور مالگزاری میں بے حد خسارہ پڑ گیا، بلکہ گولکنڈے اور بیجاپور کی ریاستوں سے بھی مغل سلطنت کے تعلقات کشیدہ ہوگئے، کیونکہ مغل صوبہ داروں کی کمزوری سے فایدہ اٹھا کر ان سلطنتوں نے ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء کے معاہدے سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق یہ ہے کہ اسی زمانے میں مغلوں کو قندھار کے محاصرے میں شکست ہوگئی، اور اس کا نفسیاتی اثر ملک کے دور دراز گوشوں میں

پڑنے لگا، اور دکنی سلاطین بھی اس سے بہت خوش ہوئے۔ یہ اپنے موجودہ خراج و پیش کش کی ادائی اور سیاسی و مذہبی بندشوں کی پابندی میں ہر روز لیت و لعل کرنے لگے۔ ان حالات میں شہنشاہ نے پھر (۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء) اورنگ زیب کو دکن کی نظامت سپرد کی۔ شہزادہ اورنگ زیب ۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۲ء میں جب دوسری مرتبہ دکن کا ناظم بن کر آیا تو اس کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ اب دکن کے سیاسی اور معاشی حالات بے حد پیچیدہ ہوگئے تھے۔ شہزادے کو نہ صرف مغل صوبوں میں از سر نو اصلاحات اور نظم و نسق کر کے نقصانات کی تلافی کرنی پڑی، بلکہ معاہدوں کی روشنی میں بیجاپور اور گولکنڈے کے سیاسی تعلقات کو پھر رو بہ راہ کرنا پڑا، جیسے ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء میں تھے۔

اورنگ زیب کو قطب شاہی سلطنت سے سخت شکایتیں تھیں۔ سب سے پہلی شکایت یہ تھی کہ اس سلطنت نے ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء کے معاہدے کو بالکل پس پشت ڈال دیا تھا، یعنی اول تو یہ سلطنت اپنا سالانہ خراج جس کی مقدار دو لاکھ ہون تھی ادا نہیں کر رہی تھی۔ حالانکہ مغلوں کے نقطۂ نظر سے یہ سلطنت ایسی سیر حاصل تھی کہ اس کو خراج کی ادائی میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ اورنگ زیب نے صوبہ داری کا جائزہ لیتے ہی فوراً خراج اور پیش کش طلب کیے جو سلطنت کے ذمے کئی سال سے باقی تھے۔ نیز ہون کی قدر میں جو اضافہ ہو گیا تھا، یعنی اس کی قدر بجائے چار کے پانچ روپیے تک پہنچ گئی تھی، وہ بھی طلب کیا گیا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے لکھا تھا کہ:۔

"تتمۂ پیش کش و سابق بزودی روبراہ گشتہ۔ ۔ ۔ ۔ بہ حضور پُرنور برسد و وصول وجوہ
پیکش حال از میعاد درنہ گذشتہ اہمالے درآن نہ رود"[1]

گولکنڈے کی دوسری عہد شکنی یہ تھی کہ پھر سب صحابہ کبارؓ کی مذموم رسم شروع ہوگئی تھی اور ایران سے وہی سیاسی تعلقات پیدا ہوگئے تھے جو معاہدے سے پہلے تھے چنانچہ اورنگ زیب کے الفاظ میں:۔

"ترکِ سُنت و اظہار بدعت شعارِ خود ساختہ۔ ۔ ۔ ۔ وخود را بہ فتراک والی ایران

---

[1] "رقعات عالمگیری" مولفہ نجیب اشرف صاحب ندوی۔

بستہ ہمہ وقت پیش کش ہائے گراں بہ او می فرستد۔"

اس کے علاوہ ایک اور تازہ شکایت یہ تھی کہ راجہ چندرگیری سری رنگ رائل نے گولکنڈے کی دست درازیوں سے بچنے کے لیے مغل سلطنت کا سہارا ڈھونڈنا چاہا، چنانچہ اس نے شہزادہ اورنگ زیب اور شہنشاہ کے پاس اپنے آدمی روانہ کیے اور امداد کے بدلے شہنشاہ کی خدمت میں پچاس لاکھ ہون۔ دو سو ہاتھی قیمتی جواہر، اور سالانہ پیش کش و نذرانہ دینے کا وعدہ کیا، اور یہ بھی لالچ دی کہ اگر شہنشاہ چاہیں تو میں مسلمان ہونے کے لیے تیار ہوں۔ اس لالچ میں اورنگ زیب اور شاہجہاں دونوں، بیجاپور اور گولکنڈے کے مقابلے میں کرناٹک کے راجہ کی مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے پُر زور الفاظ میں شہنشاہ کو راجہ کی امداد کے لیے توجہ دلائی تھی۔

میر جملہ کی غداری یہ تمام شکایتیں آسانی سے حل ہو جاتیں اور معاملات انتہائی حد کو نہیں پہنچے، چنانچہ سری رنگ رائل کے معاملے میں سلاطین دکن نے بالا بالا شاہجہاں کی خدمت میں نذرانے پیش کر کے شہنشاہ کو راضی کر لیا کہ وہ اس میں دخل نہ دیں، اور شہنشاہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ اور اب رہا عہد شکنی، اس کی بھی انھوں نے تلافی شروع کر دی تھی، یعنی عبداللہ قطب شاہ نے اپنے بقائے میں اٹھائیس لاکھ روپیے ادا کر دیے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد تو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے تھی، لیکن قطب شاہی سلطنت کی بدقسمتی سے محمد سعید میر جملہ کا ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا جس کا سلجھانا قطب شاہی سلطنت کے بس کی بات نہ تھی۔ محمد سعید وہ شخص ہے جو ~~۱۰۴۰~~ ۱۰۴۳ھ میں بہت خستہ حالت میں گولکنڈہ آیا تھا۔[1]

---

[1] محمد سعید کا ابتدائی خاندانی تعلق اردستان سے تھا، لیکن اس کی پیدائش اصفہان میں ہوئی تھی، کیونکہ اس کا باپ اصفہان میں آباد تھا، اور تیل بیچتا تھا، اس لیے اس کو از سادات اردستان اور اصفہان کہا گیا ہے (ماثر الامراء جلد سوم ص ۵۳۰)، چونکہ گولکنڈے کی سلطنت اپنے جواہر کی وجہ سے بہت مشہور تھی اس لیے محمد سعید اپنی قسمت آزمائی کے لیے ~~۱۰۴۰~~ ۱۰۴۳ھ میں گولکنڈہ آ گیا، غالباً اس کا ورود گولکنڈے میں کسی بڑے تاجر کے ساتھ ہوا تھا جو یہاں جواہر کی تجارت کرتا تھا، اور محمد سعید اس تاجر کے کاروبار میں معمولی نوکر کی حیثیت میں شریک تھا (مدراس کے اوراق پارینہ جلد اول)

لیکن اپنے سیاسی ہتھکنڈوں سے کام لے کر جلد ترقی کر گیا، ور ۱۰۴۹ھ ۱۶۳۹ء میں میر جملہ ہوگیا جو قطب شاہی سلطنت کا جلیل القدر عہدہ تھا چونکہ اس زمانے میں تسخیر کرناٹک کی بہت رواروی تھی، بادشاہ نے محمد سعید ہی کو اس کام کے لیے موزوں سمجھا غالباً محمد سعید نے خود اس کی خواہش کی تھی کہ یہ کام اس کے سپرد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ کرناٹک کے کمزور رائلوں اور نائکوں کو مغلوب کرنا کچھ مشکل نہیں تھا چنانچہ پچھلے باب میں ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ ۱۰۵۵ھ ۱۶۴۵ء میں میر جملہ نے کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر جس کے حدود ساحل مدراس سے ملتے تھے، مسخر کر لیا! ان فتوحات کی وسعت جن میں کڑپا، سدھوٹ اور گنڈی کوٹہ شامل تھے تین سو میل طول اور پچاس میل عرض بتائی جاتی ہے اور چالیس لاکھ ان کا محاصل تھا۔[1] خود گنڈی کوٹہ ایک چھوٹی راجدھانی تھی۔ زراعت اور جواہر کے معدنوں کی وجہ سے یہ خطہ اس قدر زرخیز تھا کہ میر جملہ نے یہاں اپنی جاگیریں پیدا کر لیں اور ہزاروں کی دولت جمع کر لی، اس کے علاوہ نئے معدن دریافت کر کے لاکھوں روپیے کے جواہر حاصل کر لیے۔ سمندر میں اس کے جہاز چلتے تھے، قطب شاہی فوج کے علاوہ

منوچی کہتا ہے کہ محمد سعید ایران کے ایک بڑے تاجر کا نوکر تھا، اور یہ تاجر گھوڑوں کی تجارت کے لیے گولکنڈہ آیا تھا۔ محمد سعید ان گھوڑوں کی نگرانی کیا کرتا تھا، لیکن جب یہ گولکنڈہ آیا ہے تو اس کی حالت یہ تھی کہ وہ راستوں میں جوتے بیچتا پھرتا تھا، لیکن چند ہی روز میں چھوٹے کاروبار سے بڑھ کر جواہر کی تجارت شروع کر دی اور ایک بڑی دولت جمع کر لی اور درباریوں کو فراہم کر کے بادشاہ کے پاس رسوخ پیدا کر لیا۔ جب بادشاہ کے پاس پیش ہوا تو کئی عمدہ ہاتھی، یورپ اور چین کے نایاب کپڑے پیش کیے جن سے بادشاہ بہت خوش ہوا، اور اس کو نوکری دی، غالباً اس کو درجہ بہ درجہ ترقی دی گئی تھی، اور جب وہ اپنے کام میں اہل ثابت ہوا تو بالآخر بادشاہ نے اس کو کرناٹک کا طرفدار بنا دیا (منوچی جلد اول ص ۲۳۲)۔

[1] ۔ مآثر الامراء جلد اول ص ۵۳۰۔

جو سلطنت نے اس کے سپرد کی تھی اپنے ذاتی خرچ سے ایک اور مستقل فوج جمع کر لی تھی جس میں فرانسیسی توپیں تھیں اور توپچی نوکر تھے! اس فوج کی تعداد کوئی پانچ ہزار سوار، اور بیس ہزار پیدل بتائی جاتی ہے[1]۔ میر جملہ کے اس شاہانہ انداز سے آس پاس کے لوگ بہت ڈرتے تھے چنانچہ مغربی تاجر، یعنی پرتگالی اور فرانسیسی اس کے پاس تحفے اور نذرانے بھیجتے تھے[2]۔ مدراس کے "قول" کے سلسلے میں اس نے انگریزوں سے توپیں وصول کی تھیں۔

ان حالات میں محمد سعید کرناٹک کا ایک مقتدر رئیس بن بیٹھا تھا، اور اس غیر معمولی اقتدار کے گھمنڈ میں وہ اپنے کو قطب شاہی سلطنت سے بے نیاز سمجھنے لگا، اور ایک خود مختار سلطنت کی ٹھان لی۔ ادھر بادشاہ اور اس کے درباری بھی اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بدگمان ہونے لگے اور بادشاہ کو لوگوں نے سمجھایا کہ وہ ایک روز باغی ہو جائیگا۔ یہ بدگمانی بے معنی نہیں تھی، کیونکہ کرناٹک کی فوج کشیوں میں میر جملہ کو جو مالِ غنیمت دست یاب ہوا تھا وہ مرکزی حکومت کے حوالے نہیں کیا گیا، اور جس وقت اس مالِ غنیمت کا مطالبہ ہوا تو اس کی پابجائی سے صاف انکار ہونے لگا، اور اس کی یہ وجہ بتائی کہ کرناٹک کی تمام فتوحات اور ان کا مالِ غنیمت اسی کی کوششوں کا پھل ہے، اس سے سلطنت کو کوئی سروکار نہیں۔ حالانکہ یہ دعویٰ غلط تھا، میر جملہ آخر گولکنڈے کا ملازم تھا، یہ سب اس کے فرائض تھے۔ مرکزی حکومت کو ہر روز یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ اس کے پنجے سے باہر نہ نکل جائے، کیونکہ کرناٹک کے ایک دُور دراز خطے میں جہاں مرکزی حکومت کی کوئی گرفت نہیں تھی، وہ ایسا مستحکم تھا کہ بادشاہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اب بادشاہ کے پاس صرف ایک ہی چارۂ کار تھا کہ اس کو گولکنڈہ طلب کر کے پھانس لے۔ چنانچہ درباریوں کے کہنے سے بادشاہ نے اس کو

---

[1] منوچی، جلد اول ص ۲۳۲۔ ٹیورنیر جلد اول ص ۲۲۷۔

[2] منوچی جلد اول ص ۲۳۲۔ پرتگالی مقبوضات کا گورنر و ام فلب سکرینہا نے گو اسے میر جملہ کے پاس بہت سے نایاب تحفے بھیجے تھے۔

بار بار گولکنڈہ طلب کیا، پہلے تو اس نے بادشاہ کے ہاں آنے سے انکار کر دیا، لیکن جب مرکزی حکومت سے اصرار ہوا تو چند روز کے لیے گولکنڈہ آیا، اور غالباً دربار میں بھی باریاب ہوا تھا لیکن جب اہلِ دربار کے اشارے سے بادشاہ نے اس کو پھانسنا چاہا[1]، اور محمد سعید کو اس کی خبر لگی تو وہ پھر راتوں رات کرناٹک بھاگ گیا، اور قطب شاہی حکومت سے آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی، قطب شاہی نمک کا تو اسے پاس و لحاظ نہیں تھا کہ وہ عبداللہ کی اطاعت کر لیتا لیکن اس کے ہاں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ سلطنت سے کھلی لڑائی مول لیتا اپنی فوجی طاقت کے باوجود جس میں اہلِ یورپ بھی نوکر تھے اس کا سربراہ ہونا مشکل تھا، اس لیے وہ ایران۔ بیجاپور اور مغل سلطنت کی حمایت ڈھونڈنے لگا کہ ان میں سے کوئی طاقت اس کو پناہ دیدے! اس غرض کے لیے اس نے ایک طرف شاہِ ایران اور والیِ بیجاپور کو خطوط لکھے تو دوسری طرف مغل سفیر کو اپنے ارادے کی اطلاع دی جو گولکنڈے میں متعین تھا! اول الذکر دو سلطنتوں نے اس کی درخواست فوراً منظور کر لی، اور ادھر جب گولکنڈے کے حاجب عبداللطیف کی رپورٹ اورنگ زیب کے ہاں پہنچی تو یہ محمد سعید کی مدد کے لیے تیار ہو گیا، اور شاہجہاں کے پاس سفارش کر دی کہ:-

"محمد سعید میر جملہ ہموارہ اظہارِ عقیدت و ارادت نسبت بہ درگاہ سلاطین پناہ
می نماید۔ درین وقت اورا بہ انواع نوازشات بادشاہی مستمال ساختہ
بہ بندگی درگاہ والاجاہ رہنموں گرداند۔"

اور شہنشاہ نے یہ سفارش منظور کر لی[2]۔ اور محمد مومن کو جو سری رنگ رائل کے لیے مقرر ہوا تھا محمد سعید میر جملہ کے پاس

---

[1] ۔ ایک روایت یہ ہے کہ بادشاہ، محمد سعید کو گرفتار کر کے اندھا کرنا چاہتا تھا، یا ٹیورنیر کے الفاظ میں، اس کو زہر دینا چاہتا تھا (سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۴)۔

[2] ۔ ایک باغیِ سلطنت کی مدد کرنا نہ صرف بین اقوامی اصول بلکہ معاہدے کی رو سے بھی جائز نہ تھا بادشاہی سلطنت سے

اظہار ہمدردی کرنے کے لیے کرناٹک بھیجا گیا۔

جب گولکنڈے اور بیجاپور کی حکومتوں کو یہ معلوم ہوا کہ مغل سلطنت محمد سعید کی تائید کرنا چاہتی ہے تو یہ دونوں بہت پریشان ہوئیں، اوران کو یہ خیال ہوا کہ اگر محمد سعید سچ مچ شاہجہاں کے پاس چلا جائے تو اس کے ذریعے سے ان سلطنتوں کے تمام راز فاش ہو جائینگے اس لیے ان دونوں سلطنتوں نے اس کی خوشامد شروع کردی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے الفاظ سے کہ:۔"قطب الملک نیز در مقام استمالت اوست" اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوسری طرف خود میر جملہ بھی مغل سلطنت کو دھوکا دینے لگا، یہ دراصل مغلوں کی ملازمت نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ مغلوں کے اثر سے کام لے کر قطب شاہی سلطنت کو مرعوب کرے اور اس طریقے سے کرناٹک میں اپنی خود مختارانہ ہستی قایم رکھے چنانچہ محمد مومن کے بیان سے جو کرناٹک سے واپس آیا تھا اس کی تصدیق ہوگئی اور جب اورنگ زیب نے شہنشاہ کے اصرار پر میر جملہ کو بار بار ترغیب دی تو اس نے جواب دیا کہ:۔

بہ انقضائے مدت دو سال یا بدیدن قطب الملک بیاید یا ترک نوکری کردہ عزیمت حرمین شریفین نماید۔"[2]

واقعہ یہ ہے کہ اگر میر جملہ دکنی طاقتوں سے نہ ڈرتا تو وہ غالباً مغلوں کی پناہ میں نہیں جاتا لیکن اب

جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اس کی صراحت تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے باغیوں کو پناہ نہ دینگے (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری) جلد اول حصہ دوم ص ۱۷۲) غالباً قطب شاہی سلطنت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا۔

[1] ۔مقدمہ رقعات عالمگیری مولفہ نجیب اشرف صاحب۔

[2] ۔لیکن اس کے بیٹے محمد امین نے جو گولکنڈے میں تھا مغل حاجب محمد امین کو یقین دلایا کہ اس کے باپ کا بیان صرف ایک وقتی مصلحت پر مبنی ہے۔ دراصل ہم لوگ مغل ملازمت میں آنا چاہتے ہیں (مقدمہ رقعات عالمگیری مولفہ نجیب اشرف صاحب)۔

اس کے لیے ایک خطرہ یہ تھا کہ اس کے دھوکے اور فریب سے گولکنڈہ و بیجاپور کی سلطنتیں اس کی تباہی کے درپے ہوگئیں کیونکہ اس نے بیجاپور کو بھی دھوکے میں رکھا تھا۔[1] ان خوفناک حالات سے مجبور ہو کر میر جملہ نے بالآخر مغل سلطنت کا دامن پکڑ لیا کیونکہ اس کے سوا اب اس کے پاس بچاؤ کی کوئی اور صورت نہ تھی، چنانچہ اس کی درخواست[2] پر شہنشاہ نے ۱۴ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ / ۳ دسمبر ۱۶۵۵ء کو محمد عارف کشمیری کے ساتھ "خلعتِ فاخرہ با منشور نوازش متضمن عنایت منصب پنج ہزاری پنج ہزار سوار بہ او و دو ہزاری دو ہزار سوار بہ محمد امین پسرش بھیج دیئے۔" اس کے ساتھ عبداللہ قطب شاہ کو بھی دھمکی دیگئی کہ "محمد سعید کے متعلقین پر کوئی دست درازی نہ کرے۔" کیونکہ محمد سعید کا بیٹا، اور دوسرے متعلقین گولکنڈے میں تھے۔

لیکن ابھی شہنشاہی فرمان جو میر جملہ (محمد سعید) اور عبداللہ قطب شاہ کے نام تھے گولکنڈہ نہیں پہنچے تھے کہ میر جملہ کے بیٹے محمد امین نے اپنی احمقانہ حرکات کی وجہ سے سیاسی فضا اور بھی مکدّر کر دی۔ یہ پہلے سے "بہ نشہ دہ بالائے جوانی و دولت سرشار رعونتے در سر داشت" اب اپنے باپ کی روز افزوں طاقت اور مغل سلطنت کی حمایت سے اور بھی مغرور ہو گیا، یعنی "پا از حد خود فروتر گذاشت۔" ایک روز نشہ میں چور دربار میں آکر مسند پر سو گیا، اور قے کر دی،[3] یہ ایسی گستاخانہ حرکت تھی کہ بادشاہ اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا بلکہ حکومت کا وقار قایم رکھنے کے لیے اس کا تدارک کرنا ضروری تھا چنانچہ بادشاہ نے اس کو گرفتار کر کے اس کا مال و جائداد ضبط کر لی۔ گو اس دوران میں محمد امین کے لیے

لہ۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ میر جملہ نے بنگال کے گورنر شجاع کو بھی لکھا تھا کہ "تم گولکنڈے پر حملہ کرو اور میں تم کو مدد دیتا ہوں" (ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۲۵)۔

لہ۔ اس نے اپنی درخواست میں اپنے چالیس ہزار سوار مغل شہنشاہت کی خدمت کے لیے پیش کیے کہ اگر گولکنڈے پر حملہ ہو تو اس کے لیے میں تیار ہوں، اور اورنگ زیب کو ترغیب دی کہ فوراً حملہ ہونا چاہیئے (منوچی، جلد اول ص ۲۳۳)۔

سلہ۔ مآثر الامرا، جلد سوم ص ۵۳۱۔

شہنشاہی احکام بھی پہنچگئے تھے اور یہ عبداللہ کو دکھلائے گئے، لیکن اس نے ایک نہیں سُنی اور بہا بر تدارک کیا۔ چونکہ یہ گولکنڈے کی طرف سے شہنشاہی احکام کی خلاف ورزی تھی اس لیے مغل حکومت شہنشاہی وقار کی حفاظت کے لیے عبداللہ قطب شاہ کی سرکوبی پر تُل گئی۔ پہلے تو عبداللہ کے نام احکام پہنچے کہ "باید کہ پسرش (محمد امین) را روانہ این جانب نماید و الا لشکر ظفر اثر را بہ گولکنڈہ رسیدہ داند۔" اور اس اثنا میں ہادی داد خاں نامی ایک مغل جنرل کو جو دیوگڈہ میں تھا، قندھار پر کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا، اور ۸ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ (۲۶ دسمبر ۱۶۵۵ء) کو اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد سلطان کو ناندیڑ روانہ کر دیا گیا، اور اس شہزادے کو یہ حکم تھا کہ "اگر قطب الملک پسر میر جملہ و متعلقان را خلاص نسازد بے توقف بہ حیدرآباد در آمدہ بہ موجب حکم اقدس کام و ناکام محبوسان را از قید برآورد۔" محمد سلطان ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ (۷ جنوری ۱۶۵۶ء) کو ناندیڑ پہنچگیا، اور عبداللہ قطب شاہ کو شہنشاہی حکم کی اطلاع کر دی۔[1]

گولکنڈے پر حملہ

یہاں گولکنڈے میں قطب شاہی حکومت عجیب کش مکش میں پڑ گئی۔ اگر شہنشاہی تہدید سے محمد امین اور اس کے متعلقین رہا کر دیے جاتے تو اس سے نہ صرف سلطنت کا وقار غایب ہو جاتا بلکہ اس کا شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ تھا، اور اگر شہنشاہی احکام سے بے اعتنائی کی جاتی تو مغل فوج گولکنڈے پر دھاوا بولنے کے لیے تیار تھی۔ عبداللہ نے خلاف توقع بہت دنوں تک شہنشاہی احکام سے بے اعتنائی کی اور وہ اس میں بہت کچھ حق بجانب تھا۔[2] یہ عجیب بات تھی کہ مغل سلطنت صرف اپنے وقار کی پچ کرتی تھی اور قطب شاہی وقار کی اصلا پروا نہیں کی، حالانکہ یہ سلطنت مغلوں کی حمایت میں تھی! اس عدول حکمی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ محمد سلطان کی فوج

---

[1] رقعات عالمگیری مولفہ نجیب اشرف صاحب ندوی۔

[2] ٹیورنیر کہتا ہے کہ عبداللہ تو پہلے سے ہتھیار ڈالنے اور قلعہ مغلوں کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا، لیکن اس کا داماد میر احمد اس کو روکتا رہا، اور خسرہ کو دھمکی دی کہ اگر وہ ایسا کریگا تو مار ڈالا جائیگا (سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۳۶)۔

۲۳ ربیع الاول کو ناندیڑ سے روانہ ہوئی اور حیدرآباد میں داخل ہوگئی۔ اس کے پیچھے اورنگ زیب نے بھی گولکنڈے
۱۰ جنوری
کی طرف کوچ کر دیا۔ اب عبداللہ جیسے ڈرپوک آدمی سے زیادہ استقامت کرنا ناممکن تھا۔ اب تک جو کچھ
استقامت ہوئی تھی وہ اس کے حوصلوں سے زیادہ تھی۔ اس نوبت پر اس نے مغل حملے سے ڈر کر فوراً محمد امین
اور اس کے متعلقین کو رہا کر دیا۔ چنانچہ یہ باغی حیدرآباد سے چوبیس میل کے فاصلے پر محمد سلطان سے آکر ملے۔
اگرچہ اب پیشقدمی کی ضرورت بالکل نہ تھی لیکن ابھی محمد امین کا مال و جایداد ضبط تھے اور محمد سعید کو بھی جو کرناٹک سے
آرہا تھا پناہ میں لینا تھا، اس لیے محمد سلطان کو یہ حکم ہوا کہ آگے بڑھ کر حیدرآباد میں کسی مناسب جگہ قیام کرے اور
میر جملہ کا منتظر رہے چنانچہ محمد سلطان کی فوجیں ۶ ربیع الثانی کو تالاب حسین ساگر پر جاگزیں ہوگئیں اور دو روز
۲۳ جنوری
کے بعد حیدرآباد میں داخل ہوگئیں کیونکہ فوجی نقطۂ نظر سے اول الذکر جگہ اچھی نہیں تھی۔ مغل فوج کے حسین ساگر پہنچنے کے
ایک روز پہلے ہی عبداللہ، حیدرآباد چھوڑ کر قلعہ میں محصور ہوگیا[1]۔ چونکہ شہر میں کوئی حفاظت کا سامان نہیں تھا
اس لیے یہاں لوٹ مار شروع ہوگئی، اور شرفاء و روساء کے مکان اور محلات تاخت و تاراج کے نذر
ہوگئے۔ اس طریقے سے شہر کے تمدن کو بہت نقصان پہنچا۔ اگرچہ محمد سلطان نے اس تاخت و تاراج کو روکنے کی
کوشش کی اور محمد بیگ کو اس کام کے لیے مقرر کیا لیکن اس سے کوئی فایدہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ اس لوٹ میں
مغل سپاہی بھی شریک ہوں[2]۔

---

[1] لیکن قلعے سے عبداللہ نے محمد سلطان سے مدد کی درخواست کی کہ "چالیس لاکھ روپیے نقد دینے کے لیے تیار ہوں، اور
اپنی بیٹی شہزادے کے عقد میں دیتا ہوں" لیکن محمد سلطان کو اس کا کوئی اختیار نہ تھا، اس لیے صلح نہیں ہوئی۔
عبداللہ پر یہ اعتراض ہے کہ وہ صلح کی درخواست بھی کر رہا تھا، اور حملہ بھی کر رہا تھا۔ غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ
اگر احیاناً صلح نہ ہو تو مدافعت کا ہتھیار ہاتھ سے نہ جائے۔ اور عادل شاہی کمک کا انتظار بھی تھا کیونکہ بیجاپور سے ایک فوج آرہی تھی۔

[2] مآثر الامراء، جلد سوم ص ۴۳۳۔

اگرچہ محمد سلطان کے حسین ساگر آنے کے بعد قطب شاہی فوجوں سے کچھ چھیڑ چھاڑ ضرور ہوئی تھی لیکن باضابطہ مقابلہ اورنگ زیب کے آنے کے بعد ہوا۔ ۶ ر فروری (۲۰ ر ربیع الثانی) کو اورنگ زیب حیدر آباد پہنچا اور قلعے کا محاصرہ کرلیا جو ۷ ر فروری (۱۲ ر ربیع الثانی) سے ۳۰ ر مارچ (۱۴ جمادی الثانی) تک جاری رہا، اور ۴ ر جمادی الثانی مطابق ۳۰ ر مارچ کو میر جملہ بھی کرناٹک سے آکر مغل فوج کے ساتھ محاصرے میں شریک ہوگیا[1]۔ محاصرے کا حال یہ تھا کہ قدرتی طور پر مغلوں کو قلعے پر وار کرنے کے لیے اچھے مواقع تھے۔ قلعے کے باہر شمال مشرقی سمت ایک اچھی پہاڑی تھی جس پر مغل فوجوں نے اپنے مورچے باندھ کر قلعے پر زد کردی اور اس وجہ سے قطب شاہی فوجوں کو قدم جما کر لڑنے کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ فوجیں قلعے سے باہر نکل کر حملہ کرتی تھیں اور شکست کھا کر واپس ہوجاتی تھیں۔ قلعے کے مشہور برج سے جو بعد کو "موسیٰ برج" کے نام سے موسوم ہوا، بڑی مدافعت کی گئی، اس برج میں گولکنڈے کا مشہور جنرل میر میراں، مر گیا، اور اس کے بعد موسیٰ خاں متعین ہوا تھا[2]۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر یہ لڑائی برابر جاری رہتی تو

---

[1] منوچی کہتا ہے کہ وہ (محمد سعید) عبداللہ قطب شاہ سے انتقام لینے کے درپے تھا (منوچی جلد اول ص ۲۲۵)۔

[2] "موسیٰ برج" جس کو دھرما چار مستری نے بنایا تھا، اس محاصرے کی مشہور یادگار ہے، چونکہ یہ برج موسیٰ خاں کی نگرانی میں بنا تھا، اس لیے آج تک اس کا نام "موسیٰ برج" ہے اور اس پر یہ کتبہ کندہ ہے :-

"بہ میر میران حکم عالی صادر گردید کہ شما قایم بودہ مورچہ و نقب نزدیک این برج تا بخندق رسانید چون درین جا برج کوچک بود، احکم جہان مطاع عالم مطیع خسرو زمان شہنشاہ دوران السلطان العادل ظل اللہ ابوالمظفر ابوالمنصور ابوالغازی سلطان عبداللہ قطب شاہ بہ دستور الوزراء فی الزمان مقرب الحضرت السلطانیہ معتمد الدولہ الخاقانیہ خان ذی شان سپہ سالاری موسیٰ خان چنان شرف صدور یافت کہ خود درین جا بودہ بہ دفع غنیم مشغول باشند بر آن خان عالی شان شب و روز

اس کا فیصلہ کس فریق کے حق میں ہوتا لیکن عبداللہ اپنی فطری کمزوری سے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی قلعے میں سے اورنگ زیب کے پاس کئی آدمی اور تحفے آئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اس قلعے کو مسخر کر کے اسی وقت قطب شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے شرایط صلح ماننے سے انکار کر دیا۔ اس اثنا میں شاہجہاں کی طرف سے بھی احکام آئے کہ عبداللہ کے شرایط پہ صلح کر لی جائے[1] لیکن اورنگ زیب نے یہ احکام چھپا دیے اور لڑائی جاری رکھی۔ پھر عبداللہ قطب شاہ نے ناچار شہزادہ محمد سلطان کی خوشامد کی، میر فصیح، اور اپنے داماد میر احمد کو شہزادے کے پاس بھیجا، اور اورنگ زیب کی منظوری سے عبداللہ کی ماں حیات بخشی بیگم بھی درخواست صلح کے لیے آگئی۔ چنانچہ حیات بخشی بیگم، میر فصیح کے ساتھ اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی اور اس کا باقاعدہ احترام کیا گیا، یعنی ایک مؤرخ کے الفاظ میں "پس از وصول استمالت نامہ بہ امید حصول مرام

بہ ہشیاری تمام در دفع غنیم بودن از قضاء ربانی غلولہ توپ بر وجود میر میران چنان خورد کہ در ہماں مورچہ ہلاک گشت و بعد از فوت او بہ سہ روز صلح شد و بعد از گذاشتن محاصرہ بہ خان مشار الیہ حکم عالی شد کہ برج عظیم درین جا بنا باید کرد تا غنیم را فرصت نقب مورچہ کندن مجال نباشد بنا بر حکم ہمایون اعلیٰ بہ اندک زمانی این برج عظیم بہ سعی خان موسیٰ الیہ در سال سنہ ہزار و ہفتاد و ہفت ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۶ء بہ اتمام رسید و اسم معمار دھرما چار۔" (مآثر دکن، علی اصغر صاحب بلگرامی)

[1] چونکہ دارا شکوہ، اور اورنگ زیب میں مخالفت تھی، اس لیے قطب شاہی حکومت نے اس مخالفت سے فائدہ اٹھایا، یعنی اپنے ایک سفیر ملا عبدالصمد کو آگرے میں بٹھایا تھا جو دارا شکوہ کو سمجھایا کرتا تھا، اور دارا کے ایما سے احکام آیا کرتے تھے۔ لیکن ٹیورنیر کا بیان ہے کہ شاہجہاں اپنے پرانے تعلقات کی بنا پر کہ قطب شاہی سلطنت نے انھیں اڑے وقت میں پناہ دی تھی گولکنڈے پر مہربان تھا (سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۴۰)۔

والدہ را فرستاد۔حسب الامر عالی جمعے بہ استقبال شتافتہ بعزت و احترام در منزل شایستہ محان فرود آوردند[1]

اس اثنا میں شاہجہاں کے تہدیدی احکام بھی پہنچ گئے کہ موجودہ شرایط کے ساتھ صلح کرکے محاصرہ اُٹھا لیا جائے اور نیز حیات بخشی بیگم کی شخصیت کی وجہ سے اورنگ زیب نے بالآخر شرایط صلح تسلیم کر لیے اور لڑائی موقوف کردی۔ شرطیں یہ پیش کی گئی تھیں کہ عبداللہ کی بیٹی محمد سلطان کے عقد میں دی جائیگی اور ایک کروڑ مالیت کے نقد جواہر اور ہاتھی تاوان جنگ دیا جائیگا۔لیکن حیات بخشی بیگم کی درخواست پر خود اورنگ زیب نے اور بعد کو شاہجہاں نے تاوان میں بہت تخفیف کردی یعنی صرف ستر لاکھ روپیہ دینے پڑے[2]۔اور شاہجہاں کے تہدیدی احکام کی وجہ سے جس میں داراشکوہ کا مخالفانہ ہاتھ تھا ۱۴ جمادی الثانی کو فوراً قلعے سے فوج ہٹالی گئی اور اس کے پانچ دن بعد محمد سلطان کا قطب شاہی شہزادی سے عقد عمل میں آیا۔اس شہزادی کے جہیز میں رام گیر کے علاقے دیے گئے اور اس میں یہ قرارداد ہوئی تھی کہ عبداللہ کے انتقال کے بعد محمد سلطان اس کا جانشین ہوگا۔غالباً اس ضمیمے کی شہنشاہ کو اطلاع نہیں تھی[3]۔لیکن عبداللہ قطب شاہ نے جو عہد نامہ لکھ دیا تھا،اس میں اس کی کافی صراحت تھی۔معاہدے کے الفاظ

---

[1] عمل صالح۔

[2] لیکن عبداللہ قطب شاہ نے جو معاہدہ لکھ دیا تھا اس سے کوئی تخفیف نہیں معلوم ہوتی:" مبلغ بست لک ہون را بہ طریق نذر و نیاز از نقد و جواہر نفیسہ و از فیلان کہ بہتر از آن پیش مرید موروثی نباشد برساند"۔اس کے علاوہ یہ بھی وعدہ تھا کہ پانچ ہزار سوار مغل سلطنت کی امداد کے لیے دیے جائینگے۔اور مغل سلطنت سے یہ درخواست تھی کہ ہر اڑے وقت میں وہ قطب شاہی سلطنت کی مدد کرے (تاریخ ظفرہ)۔

[3] مقدمہ رقعات عالمگیری،مولوی نجیب اشرف صاحب۔ٹیورنیر،اور منوچی نے اس کی صراحت کی ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے بعد محمد سلطان کی جانشینی معاہدے میں شریک تھی (ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۷) منوچی جلد اول ص ۱۳۵۔

یہ ہیں :۔ "اول این کہ .... صبیہ صلبیہ خویش را بہ حبالہ ازدواج تازہ نہال .... محمد سلطان .... در آوردہ کہ بعد از مزید موروثی ایالت این مملکت بہ آن بیدار بخت متعلق باشد و دیگر آنکہ سوائے پیش کش مقررے مبادلہ دو لک و پنجاہ ہزار ہون قلعۂ رام گیر را با ولایات متعلقہ سابق آن حوالہ وکلائے سرکار فیض آثار نماید۔" [1]

میر جملہ کی غداری سے، جس کا کوئی پہلو بھی حق بجانب نہیں تھا، قطب شاہی سلطنت کو بہت برے دن دیکھنے پڑے۔ اس ڈیڑھ سو سال کے دوران میں جب سے یہ سلطنت قایم ہوئی تھی، غداری کی پہلی مثال تھی۔[2] اس بے وفائی سے سلطنت کو جس قدر نقصان پہنچا اس کی پھر تلافی نہیں ہوسکی اور اس گرتے ہوئے زمانے میں کہاں تلافی ہوسکتی تھی۔ چونکہ قطب شاہی سلطنت کو دب کر صلح کرنی پڑی تھی اس لیے شہنشاہت کو جابرانہ مداخلت کا موقع تھا۔ اب یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ قطب شاہی سلطنت نہ صرف شہنشاہ اور صوبہ دار دکن کو لاکھوں روپیوں کا نذرانہ دیتی تھی بلکہ مغل حاجبوں پر جو گولکنڈے میں رہتے تھے زر و جواہر کی بوچھار کرتی تھی اور اس وقت سلطنت کے بقا کی یہی ایک سبیل رہ گئی تھی! اور اگر فرانسیسی سیاح برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو گولکنڈے کی اصل حکومت مغل حاجب کے ہاتھ میں تھی اور گولکنڈے کا حکمران بالکل بے دست و پا تھا۔ برنیر کہتا ہے کہ :۔

"گولکنڈے میں اورنگ زیب کا سفیر احکام جاری کرتا، پروانے دیتا، عوام کے ساتھ بدسلوکی کرتا، اور دھمکیاں دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے افعال اور اقوال ایسے خودمختارانہ ہوتے ہیں جیسے ایک مطلق العنان حکمران کے۔" [3]

---

[1] تاریخ ظفرہ۔

[2] جمشید قطب شاہ کے انتقال کے بعد سیف خاں عین الملک۔ جگدیو راؤ، اور سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں محمد امین میر جملہ ماضی نے سلطنت سے انحراف کیا تھا، لیکن ان سے حکومت کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔

[3] سفرنامہ برنیر ص ۱۹۵۔

نیز اس باغی (محمد سعید) کی حمایت سے جو مغل سلطنت کی طرف سے ہوئی تھی نہ صرف گولکنڈے کے وقار کو زبردست دھکا لگا، بلکہ سلطنت کا رُعب و داب غایب ہوگیا، اور راعی و رعایا کے تعلقات جو ضبط و تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے، ٹوٹ گئے۔ اکابر سلطنت بادشاہ کی کوئی وقعت نہیں کرتے اور من مانے ظلم و زبردستی کرتے ہیں اور عوام اس سلطنت کا جُوا اُتار کر مغل سلطنت میں شامل ہونے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خود عبداللہ قطب شاہ نے شہر حیدرآباد چھوڑ کر گولکنڈے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو "عبداللہ نے دربار کی نشست بھی چھوڑ دی تھی"[۱]۔

مرہٹوں کا احیا

قسمت کے اس فیصلے میں گولکنڈے کے ساتھ بیجاپور کی سلطنت بھی اسی طرح شریک تھی جس طرح ۱۰۶۶ھ/۱۲۳۶ کے معاہدے پر تھی۔ گولکنڈے سے فراغت پاکر مغل فوجوں نے بیجاپور کا رُخ کیا اور بیدر و کلیانی فتح کر کے ۱۰۶۷ھ/۱۲۵۷ میں اس سلطنت سے بھی کچھ اسی قسم کی شرطیں منوالیں جو قطب شاہی سلطنت سے ہوئی تھیں۔[۲] لیکن مغل سلطنت کو اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ عین اسی زمانے میں دکن میں ایک نئی طاقت پیدا ہو رہی تھی جو آگے چل کر بہت خطرناک ہوگئی اور یہ مرہٹوں کی طاقت تھی جو شیواجی بھونسلہ[۳] کی رہنمائی میں

---

[۱] سفرنامہ برنیر ص ۱۹۴۔۱۹۵۔

[۲] بیجاپور کے ساتھ بہت سی شکایتیں پیدا ہوگئی تھیں، لیکن قریبی شکایت جس کی بنا پر اورنگ زیب نے حملہ کر دیا، یہ تھی کہ ابھی چند روز پہلے جبکہ مغل فوج گولکنڈے پر حملہ آور ہو رہی تھی محمد عادل شاہ نے قطب شاہی سلطنت کی مدد کے لیے ایک فوج بھیجی تھی۔

[۳] شیواجی بھونسلہ جس کا ننیال اور ددیال نظام شاہی سلطنت کے ملازم و جاگیردار تھے جنیر میں (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷) پیدا ہوا، اور یہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۰۵۷ھ/۱۲۴۲ سے اس نے نظام شاہی سلطنت کے لیے بے روزگار سپاہیوں کو (جو موالی کہلاتے ہیں) جمع کر کے بیجاپور کے قلعوں پر وار کرنا شروع کر دیا۔ اس سنہ میں اس نے پہلے قلعۂ تورنا پر حملہ کیا، اس کے بعد سین گڈھ، پورندھر وغیرہ کے قلعے حاصل کر لیے جو بیجاپور کے مقبوضات تھے اور

آہستہ آہستہ تمام دکن پر چھا گئی اور مغل سلطنت کے لیے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا جو بہت صبر آزما ثابت ہوا۔ دکن کی مسلمان سلطنتوں کو نیچا دکھانا تو ہر وقت آسان تھا لیکن مرہٹوں کو مغلوب کرنا بے حد مشکل ثابت ہوا۔ شیواجی کی جولانیاں ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء سے شروع ہوئیں۔ اس کے پہلے دس سال تو بیجاپوری علاقوں کی تاخت و تاراج میں گذرے جس کا ناخدائے سیاست محمد عادل شاہ جیسا کمزور بادشاہ تھا۔ جب تک محمد عادل شاہ زندہ رہا شیواجی کی کوئی مزاحمت نہ ہو سکی، جب بیجاپور پر اس کے داؤ چل گئے اور اس کی طاقت بڑھ گئی تو مغل علاقوں پر حملے شروع کر دیے اور یہاں بھی اس کے لیے میدان کھلا ہوا تھا کیونکہ ادھر ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء سے مغل سلطنت میں اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کے مابین ایک سخت خانہ جنگی شروع ہو گئی جو اورنگ زیب کی شہنشاہیت پر ختم ہوئی۔ لیکن نئے شہنشاہ بہت زمانے تک دکن کی طرف توجہ کرنے کے قابل نہ تھے، اور اس کی وجہ سے شیواجی کو دکن میں اچھی طرح اُدھم مچانے کا موقعہ مل گیا چنانچہ عادل شاہی علاقوں پر قبضہ کر کے شیواجی نے ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء سے مغل علاقوں پر وار کرنے شروع کر دیے، اور سوائے جے سنگھ کے تمام مغل جنرلوں کو ایسا زِچ کیا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکے[1]

لیکن محمد عادل شاہ کے مرنے کے بعد جب اس کا جانشین علی عادل شاہ اول ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء میں تخت پر بیٹھا تو پھر عادل شاہی سلطنت میں جان آگئی اس نوجوان بادشاہ نے جس کو دکن کا آخری سورما کہنا چاہیے، عادل شاہی سلطنت کو بچانے کی کامیاب کوششیں کیں اور شیواجی کی جولانیوں کا پورا جواب دیا۔ پہلے اس نے

اس طرح آہستہ آہستہ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء تک دس سال میں بیجاپور کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ایک طاقت فراہم کر لی۔ حالانکہ یہ لوگ ایک زمانے میں اسی بیجاپوری سلطنت کے نمک خوار تھے۔

[1] جے سنگھ سے پہلے جو ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں دکن آیا تھا، شایستہ خاں اور جسونت سنگھ شیواجی کے مقابلے کے لیے آئے، لیکن ان دونوں کو ہزیمت ہوئی۔

مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لیے افضل خاں کو ۱۰۷۰ھ ۱۶۵۹ء میں بھیجا جو بدقسمتی سے شیواجی کے مکر و فریب کا شکار ہوگیا، اس کے بعد جب سدی جوہر صلابت خاں گیا، اور یہ بھی بہت جلد اس کے دامِ فریب میں آگیا تو علی نے خود ۱۰۷۱ھ ۱۶۶۰ء میں بڑھ کر پنالہ کے قلعے میں شیواجی کو شکست دی اور اُنکو بھگا دیا۔[1] چنانچہ بیجاپور کے ملک الشعراء ملّا نصرتی نے اس واقعے کی تعریف میں کہا تھا ؎

"علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں"[2]

اور ادھر شمال سے شایستہ خاں و جسونت سنگھ کی شکست ۱۰۷۰ھ کے بعد شہنشاہ نے اپنے مشہور جنرل جے سنگھ کے تحت ایک بڑی فوج بھیج دی اور عادل شاہی سلطنت سے اتحادِ عمل کی درخواست کی گئی تو علی عادل شاہ نے اس صدا پہ لبیک کہا، اور جے سنگھ کے آنے سے بہت پہلے بیجاپور کے مشہور جنرل خواص خاں کو شیواجی کے مقابلے کے لیے بھیج دیا جو اس خاں نے ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء میں شیواجی کو ایسا تھکا دیا کہ مغل فوجوں کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔[3] چنانچہ جب جے سنگھ دکن آیا اور اپنے حملے شروع کیے ہی تھے کہ شیواجی نے ہتھیار ڈال دیے اور مغل سلطنت کی اطاعت اختیار کرلی۔

لیکن اس واقعے کا ایک تاریک رُخ یہ تھا کہ شیواجی نے مغل سلطنت کی چند روز اطاعت کر کے جے سنگھ کو اپنے دیرینہ منصوبوں میں شریک کرلیا، یعنی عادل شاہی سلطنت کا خاتمہ اور مرہٹہ طاقت کا احیا اس کا اصل مقصد تھا! اول تو شیواجی کی اطاعت بھروسے کے قابل نہ تھی اور یہ ایک دھوکا تھا، دوسرے بیجاپور کے خلاف جے سنگھ کو آمادہ کرنا بھی فریب سے خالی نہ تھا۔ جے سنگھ اتحادِ عمل کے پچھلے معاہدے کو بالائے طاق کر کے جو شہنشاہ اورنگ زیب نے علی عادل شاہ کے ساتھ کیا تھا شیواجی کے ساتھ شریک ہوگیا اور عادل شاہی سلطنت پر اُمنڈ آیا، اور اس کی یہ حرکت کھُلی بدعہدی تھی۔ اب اُلٹا یہ ہوا کہ جو فوجیں شیواجی کے مقابلے کے لیے آئی تھیں وہ بیجاپور پر پلٹ پڑیں[4] جس سے عادل شاہی سلطنت سخت پریشان ہوئی کیونکہ اب اس کو دو دشمنوں کا سامنا تھا۔

---

[1] بساتین السلاطین ص ۳۷۶۔ [2] علی نامہ ملّا نصرتی۔ [3] بساتین السلاطین ص ۳۹۸۔۹۹۔۱۰۰۔ [4] بساتین السلاطین ص ۴۰۳۔۴۰۵۔

لیکن علی عادل شاہ ثانی جو اچھا مدبّر اور سپاہی تھا پوری تیاری کے ساتھ جے سنگھ کے مقابلے کے لیے آگیا، اور بیجاپور کی دیواروں کے سامنے اس کو ایسی شکستیں دیں کہ مغلوں کے چھکّے چھوٹ گئے۔ بیجاپور سے جے سنگھ کی چار پانچ لڑائیاں ہوئیں جن میں بیجاپور کے نامور سپہ سالار خواص خاں اور سید الیاس۔ شرزہ خاں نے جان توڑ کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس دارو گیر میں قطب شاہی سلطنت نے بھی اپنی پرانی روایت کے مطابق حصہ لیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے خود اپنے طور پر گولکنڈے سے مدد بھیج دی۔[1] کیونکہ اب نظام شاہی سلطنت کے خاتمے کے بعد بیجاپور ہی دکن کا آخری سہارا رہ گیا تھا۔ پہلے قطب شاہی جنرل شرزہ خاں روانہ ہوا، اور اس کے بعد بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیدل کے ساتھ نیک نام خاں، جو اس زمانے میں قطب شاہی سلطنت کا میر جملہ ہو گیا تھا موقع جنگ پر پہنچ گیا۔[2]

---

[1] ۔ ۱۰۴۳ھ ۱۶۳۳ء میں جبکہ مہابت خاں نے قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کیا تھا عبداللہ قطب شاہ نے اس موقعے پر کوئی مدد نہیں کی، حالانکہ محمد عادل شاہ نے مقدور بھر اس امداد میں حصہ لیا، اور گولکنڈے کو بھی اشارہ کیا تھا، اور غالباً اسی اتحادِ عمل کو مضبوط کرنے کے لیے ۱۰۴۳ھ ۱۶۳۳ء میں محمد عادل شاہ نے عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطانہ سے شادی کی تھی، لیکن اُس وقت عبداللہ مغلوں سے ایسا سہما ہوا تھا کہ مدد کی ہمت نہیں کی۔ لیکن اس زمانے میں جبکہ مغلوں سے بیجاپور کی لڑائی ٹھنی ہوئی تھی مرہٹوں کی وجہ سے دکن کے حالات بالکل بدل گئے تھے، یعنی مغل سلطنت مرہٹہ طاقت سے اُلجھی ہوئی تھی اس لیے اب قطب شاہی سلطنت کو مغلوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطانہ جو "حاجی بڑے صاحب" کے نام سے مشہور تھی بیجاپور میں بہت ذی اثر تھی۔ اسی نے علی عادل شاہ ثانی کی اپنے آغوش میں پرورش کی جو بڑے نتایج کا باعث ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ علی کی عظمت جس کا نصرتی گیت گاتا ہے اسی خاتون کی فیضِ صحبت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اور اس وقت گولکنڈے سے جو بیجاپور کی امداد ہوئی تھی اس میں بھی غالباً اسی کا ہاتھ تھا۔

[2] ۔ بساتین السلاطین ص ۳۱۴۔ زبیری نے نیک نام خاں کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے: "نیک نام خاں کہ در شجاعت و

اور اس نے عادل شاہی فوج کے ساتھ پورا اتحادِ عمل کیا۔ غالباً اسی اتحادِ عمل کا نتیجہ تھا کہ مغل سپہ سالار جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے ایسی فاش شکستیں ہوئیں کہ وہ اسی شرم کے مارے راہی عدم ہوگیا[1] اور اس طریقے سے ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۶ء میں دکن میں چاند بی بی اور ملک عنبر کی پھر یاد تازہ ہوگئی اور بیجاپور آیندہ اور بیس سال کے لیے محفوظ ہوگیا ورنہ جے سنگھ اس کا خاتمہ کرنے کے لیے آیا تھا۔

بسالت وکفایت ودرایت ممتاز اقران وسرآمد اعیان بود۔"

[1] ان شکستوں کی وجہ سے جو پانچ مرتبہ ہوئی تھیں جے سنگھ کی بہت بدنامی ہوئی اور شہنشاہ بھی اس پر بہت خفا ہوئے چنانچہ اسی شرم کے مارے یہ ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۷ء میں برہانپور میں مرگیا، شمال نہیں جاسکا۔



سلطان ابوالحسن تاناشاہ

سترھواں باب

ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی

عبداللہ کا طویل عہد جو ناکامیوں کی ایک دل خراش داستان ہے[1] ۳ محرم ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء پر ختم ہوا۔ ملک کی یہ بدنصیبی جو پچھلے ابواب میں ہم دیکھ آئے ہیں صرف بادشاہ کی تخت نشینی سے نہیں بلکہ اس کی پیدائش سے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن یہ عجیب دلچسپ منظر ہے کہ ان پیہم ناکامیوں کے باوجود جن سے سلطنت کی سیاست کو بڑا دھکا لگا ملک کی رفتارِ ترقی میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء کی شکست کے پانچ چھ سال کے بعد حکومت پھر اپنے پرانے ڈھرے پر آگئی چنانچہ حکومت نے

[1] عبداللہ قطب شاہ کا عہد حکومت کوئی چھیالیس سال طویل ہے۔ ہجری سنہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دو سال اور زیادہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ یہ بہت ڈرپوک آدمی تھا، اور لڑائی سے گریز کرتا تھا جس کی وجہ سے سلطنت کو سخت نقصان پہنچا لیکن اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ اول تو یہ بہت خوب صورت آدمی تھا، اور نظام الدین نے اس کو ہر جگہ "خاقانِ یوسف جمال" لکھا ہے، غالباً اس کے آباو اجداد اتنے خوب صورت نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت بہت نیک اور خدا ترس تھی۔ اس نے کسی پر سختی نہیں کی اور اس کو علم و فن کا چسکا بھی تھا۔ اپنے دادا محمد قلی قطب شاہ کی طرح یہ بہت مذہب پرست بھی تھا چنانچہ محرم اور ربیع الاول میں بڑے اہتمام سے مذہبی رسوم ادا کیے جاتے تھے۔ محرم میں تمام خوشی کی تقریبیں موقوف کر دی جاتی تھیں، اور نہ صرف مسکرات کی دکانیں، بلکہ پان کی دکانیں بھی بند کی جاتی تھیں، تاکہ کوئی

ضرورت کے مطابق دفاعی انتظامات بھی کیے اور جہاں ضرورت ہوئی فوجی مزاحمت سے کام لیا جب مغلوں نے محاصرہ اٹھالیا تو اس پہاڑی کو جو قلعے سے باہر شمال مشرقی سمت واقع تھی اور جہاں سے مغلوں نے قلعے پر زد کی تھی فصیل اور ضروری برجوں کے ذریعے سے محصور کرکے قلعے میں شامل کیا گیا۔ "موسیٰ برج" کی از سرِ نو تعمیر ہوئی جو اس کے کتبے سے ظاہر ہے۔ کرناٹک کے قطب شاہی مقبوضات پر پورا قابو رکھا گیا۔ ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء میں قطب شاہی فوج سان تھوم پر قابض ہوگئی اور انگریز کمپنی سے قطب شاہی آئین کی پوری پابندی کروائی سلطنت کے شمالی سمت ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں مغلوں کے خلاف بیجاپور کی مدد کی گئی، پھر ملک کی خوش حالی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا، اور خوشگوار نظم و نسق کی وجہ سے ملک میں پورا امن رہا۔ زراعت و تجارت میں ترقی نہیں تو تنزل بھی نہیں ہوا۔ اور ملک کی دولت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا! اس کے علاوہ اس عہد میں شاندار علمی اور تعمیری کام بھی ہوئے۔ نہ صرف شاعروں اور عالموں کی سرپرستی ہوئی بلکہ خود بادشاہ کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ نے حیدرآباد میں کئی عمارتیں بنوائیں جو اپنے تعمیری حسن کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

پان نہ کھائے۔ سب کو سیاہ کپڑے پہننے کا حکم تھا۔ سرکاری ملازمین کو جامہ دار خانے سے سیاہ کپڑے دیے جاتے تھے اور دولت خانۂ عالی میں روشنی کی جاتی تھی اور مرثیے بھی پڑھے جاتے تھے۔ ہر روز عصر کے وقت بادشاہ سیاہ لباس پہن کر سنگاسن میں آتے اور اپنے ہاتھ سے الاوے میں روشنی کرتے تھے آدھی رات تک تعزیہ ہوتا تھا۔ "داد محل" میں بھی یہ انتظام تھا، اور یہاں بھی بادشاہ آتے تھے، اور اس انتظام میں بہت روپیہ صرف ہوتا تھا۔ ربیع الاول کی تقریب جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جاری ہوئی تھی، بڑے اہتمام سے کی جاتی تھی۔ یہ تقریب سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں مسدود ہوگئی تھی لیکن عبداللہ نے اس کو پھر جاری کر دیا، اور اس میں بارہ ہزار ہون صرف ہوتے تھے اور مختلف محلات میں روشنی کی جاتی تھی۔ غرباء اور مستحقین کو کھانا کھلایا جاتا تھا، مولود خوانی بھی ہوتی تھی۔ ۲۸ رشعبان ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء کو حیات بخشی بیگم کا انتقال ہوا۔

بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم نے جس طرح سیاست کی مدد کی تھی اسی طرح قطب شاہی تمدن میں بھی اضافہ کیا۔ اگر کچھ نہیں تو اس خاتون کا تعمیر کیا ہوا "حیات آباد" جس میں ایک بڑی کاروان سرائے مسجد و مدرسہ ہے ہمیشہ یادر ہیگا، اور یہ چیزیں ہیں اگلے ابواب میں تفصیل کے ساتھ ملیں گی۔ ان ترقیوں کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس سلطنت کی تعمیر ایسے سیاسی مسالے سے ہوئی تھی جو زمانے کے ہر خشک و تر کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ نیز بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم کا اخلاقی اثر بھی اس سلطنت کو آخر دم تک سہارتا رہا۔ "حیات ماں صاحب" آخری عہد تک زندہ رہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کی اولاد

عبداللہ قطب شاہ کے کوئی بیٹا نہ تھا بلکہ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی حجاز کے ایک شریف زادے کو دی گئی تھی جس کا نام سید احمد تھا، بعض لوگ اس کا نام سید نظام الدین احمد بتاتے ہیں۔ گو ٹیورنیر اس کو عرب کا ایک شہزادہ لکھتا ہے[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص حجاز کے ایک شریف گھرانے کا آدمی تھا، اور جس طرح اور لوگ اپنی تلاش معاش میں گولکنڈہ آتے تھے اسی طرح یہ بھی یہاں آیا، اور اپنی شرافت و قابلیت کے زور سے قطب شاہی دربار میں داخل ہو گیا۔ اس کا رسوخ اتنا بڑھا کہ عبداللہ قطب شاہ کی شرفا نوازی نے اس کو اپنی دامادی کے لیے منتخب کر لیا، اور اپنی بڑی بیٹی سے اس کی شادی کر دی، اور اس بیٹی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری بیٹی اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد سلطان کو دیگئی تھی، یہ سیاسی شادی تھی جو ۱۹ رجادی الثانی ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۶ء کو عمل میں آئی، شادی کے بعد یہ بیٹی شمال چلی گئی[2]۔ تیسری بیٹی جس کا نام بعض لوگ بادشاہ بی بی بتاتے ہیں، ابوالحسن کو دیگئی جو حالات کے زور سے

---

[1] سفرنامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۶۱-۱۶۲۔

[2] یہ نہیں معلوم کہ شادی کے بعد اس بیٹی کا کیا حشر ہوا، اور آیا اس کی کوئی اولاد ہوئی تھی۔ چونکہ بعد کو شہنشاہ اورنگ زیب محمد سلطان سے ناراض ہو گئے تھے اور اس کو قید کر دیا تھا، اس لیے قیاس یہ ہے کہ یہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ قید میں مر گئی۔

عبداللہ قطب شاہ کا جانشین ہو گیا۔

ابو الحسن کا حسب و نسب

اس بات کی وضاحت بہت مشکل ہے کہ شادی سے پہلے ابو الحسن کا قطب شاہی خاندان سے کیا رشتہ تھا! ان روایتوں کو چھوڑ کر جو حیدر آباد کے بعض اضلاع میں زبان زد ہیں اور ان خیالات سے قطع نظر جو بعض مورخ بلا تحقیق ظاہر کرتے ہیں[1] قرائن یہ ہیں کہ ابو الحسن عبداللہ قطب شاہ کا داماد ہونے کے علاوہ قطب شاہی خاندان کا راست قرابت دار بھی تھا[2]۔ اب قرابت میں بھی بہتوں کو اختلاف ہے

---

[1] سدی پیٹ کی مقامی روایت یہ ہے کہ ابو الحسن موضع ننت گیری کا رہنے والا (واقع سدی پیٹ) اور رلدات کا بیٹا تھا۔ اس موضع کے برہمن اکنا، اور، مادنا نے اس کی پرورش کی تھی جب اتفاق سے یہ بادشاہ ہوگیا تو ان برہمنوں کو بہت ترقی دی یہ روایت خلیل اللہ صاحب بی۔ اے ساکن سدی پیٹ سے معلوم ہوئی۔ (مجلۂ عثمانیہ جلد ۱۰ شمارہ ۳-۴)۔

بعض مورخ اس کو قطب شاہی خاندان سے تو کجا ہندوستانی بھی نہیں کہتے بلکہ اس کو ایرانی اور عربی شمار کرتے ہیں، اور غالباً انھیں یہ غلط فہمی اس کے ہم زلف سید احمد کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لالہ جگجیون داس کا بیان ہے کہ "ابو الحسن مرد بیگانہ کارہا وارستہ از قوم مغل ہمدانی بود بعد مردن عبداللہ قطب الملک دخترش بہ عقد ازدواج در آوردہ بہ حکومت آن ملک رسید۔" (منتخب التواریخ) مفتاح التاریخ کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"والی این دیار سلطان ابو الحسن از نجیب زادہائے ایران بود۔ در لباس فقیری بہ سیاحت آمدہ چون والی حیدرآباد قطب الملک عبداللہ قطب شاہ را پسرے نبود بر فطنت وذکائے او مفتون شدہ او را بہ دامادی گرفت۔"

[2] برنیر، ٹیورنیر، اور منوچی، سب ابو الحسن کو عبداللہ کا رشتہ دار بتاتے ہیں۔ ٹیورنیر تو ابو الحسن کو عبداللہ کا رشتہ دار بھائی بتاتا ہے (سفرنامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۳۸)۔ منوچی اور مارٹن اس کو پچھلے قطب شاہوں کی اولاد میں بتاتے ہیں (منوچی جلد چہارم ص ۴۴۴)۔ تھیونو تو قطب شاہی خاندان سے اس کا خونی رشتہ بتاتا ہے۔ (سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم ص ۱۰۱)۔

اور ہر مؤرخ اپنا خاص خیال رکھتا ہے مثلاً مؤرخ محمد ساقی کہتا ہے کہ ابوالحسن، عبداللہ قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا[۱] جو بہت کچھ بحث طلب ہے۔ مقامی تاریخیں اور روایتیں یہ کہتی ہیں کہ ابوالحسن کا رشتہ عبداللہ قطب شاہ سے براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تھا، چنانچہ یہ مقامی مؤرخ ابوالحسن کا رشتہ بادشاہ کے ساتھ اس کی ماں یعنی حیات بخشی بیگم کی طرف سے ظاہر کرتے ہیں یعنی حدیقۃ العالم کے الفاظ میں :- "ابوالحسن کہ از طرف مادر با بادشاہ قرابت قریبہ دارد"[۲] اور خافی خاں کے الفاظ ہیں :- "از طرف مادر سلسلہ او بہ قطب شاہیہ می رسد"[۳] دوسری مقامی تاریخیں اس حقیقت کو اور زیادہ منکشف کر دیتی ہیں۔ ماہ نامہ کے مولف کا بیان یہ ہے کہ جب نسبت کے لیے عبداللہ قطب شاہ نے ابوالحسن کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ تو محل کی ذمہ دار عورتوں نے جن کے نام ماہ بانو اور سرو ما تھے بیان کیا کہ :- "خواہے از نبائر عین الملک و از احفاد این دودمان ۔ . . . شایستہ این نسبت است"[۴] اگر ابوالحسن سیف خاں عین الملک کا پوتا ہے تو اس کا قطب شاہی خاندان کا رشتہ دار ہونا ضروری ہے کیونکہ سیف خاں سلطان قلی قطب شاہ کے چچا زاد بھائی فتحی خاں کا بیٹا تھا۔[۵] ولندیزی سیاح ہیورٹ کے بیان سے بھی اس کی

۱۔ مآثر عالمگیری ص ۱۴۳۔

۲۔ حدیقۃ العالم جلد اول ص ۱۶۱۔

۳۔ منتخب اللباب جلد سوم ص ۷ . ۴۔ خافی خاں کے الفاظ پھر مبہم ہو جاتے ہیں اور رشتہ ابوالحسن کی ماں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے لیکن غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رشتہ حیات بخشی بیگم کی طرف سے تھا۔

۴۔ "ماہ نامہ" ۱۲۲۹ھ میں لکھی گئی اس کا مولف غلام حسین کہتا ہے کہ اس نے اپنے زمانے میں ابوالحسن کے بھانجے ابو محمد سے جو اس زمانے میں بہت بڈھا ہو گیا تھا یہ حالات دریافت کیے تھے اور غلام حسین سے اس کی قرابت بھی تھی اس لیے اس کا بیان زیادہ مستند ہے۔ (ماہ نامہ ص ۳۱۵ - ۳۱۶)۔

۵۔ تاریخ قطب شاہی ص ۳۰۔

تصدیق ہوتی ہے! اس کا بیان ہے کہ ابوالحسن براہ راست قطب شاہی خاندان کا رشتہ دار ہے[1]۔ اسی وجہ سے دوسری تاریخیں تو اس کو عبداللہ قطب شاہ کا بہت بڑا قرابت دار بھی کہتی ہیں! اور بعض نے "در قرابت قریبہ سرکار است"[2] لکھا ہے۔ اس طریقے سے اس کو نہ صرف اس بات کا حق تھا کہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد بنے بلکہ قطب شاہی تخت کا بھی مالک ہو۔ چنانچہ قدرتی حالات نے خود بہ خود اس کا انتظام کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندانی رشتے کی وجہ سے ابوالحسن کی قطب شاہی خاندان میں شادی ہونی چاہیئے تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی زندگی میں ابوالحسن ایک درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور غالباً اس بے راہ روزندگی کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ نہ صرف اس سے ناراض تھا بلکہ خافی خاں کے الفاظ میں "عبداللہ قطب شاہ از بعضے اطوار او رنجیدہ خاطر گشتہ او را از نظر انداختہ بود"[3] ٹیورنیر نے اس میں ایک اور اضافہ یہ کیا کہ "جس لڑکی سے ابوالحسن کی شادی ہوئی اس کا پہلے سے بہ رضا و رغبت انتظام ہو سکتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ ابوالحسن ایک عیاش آدمی تھا، اور اسی وجہ سے بادشاہ اس کی وقعت و عزت نہیں کرتا تھا، شادی کے بعد اس کے اخلاق و عادات درست ہوئے ہیں"[4]۔ یہ تمام بیان بے سروپا معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ابوالحسن کے اخلاق و عادات میں کوئی خرابی نہ تھی اور نہ یہ عیاش تھا۔ اگر "ماہ نامہ" سے استناد کیا جائے تو "ابوالحسن شخص عالم و متقی بود۔ اصلا بہ منہیات و مسکرات میل نہ داشت"۔ اس سے زیادہ یہ کہ "بہ کمالات صوری و

---

[1] سفرنامہ ہیورٹ جلد سوم ص ۴۲۵۔ یہ سیاح یہاں تک کہتا ہے کہ ابوالحسن، ابراہیم قطب شاہ کی اولاد میں سے ہے۔

[2] گلزار آصفیہ ص ۴۷۔

[3] منتخب اللباب جلد سوم ص ۴۰۷۔

[4] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۳۸۔

معنوی آراستہ و از مقدمات علمی آشنا[1] تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان سے اس کی کوئی راہ و رسم نہ تھی، اور چونکہ اس کو شاہی خاندان میں شادی کی امید نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر شاہی محل کے غیر معمولی واقعات اس کے موافق نہ ہوتے تو شاہی خاندان میں ابوالحسن کی شادی نہ ہوتی، اس لیے اس عالم مایوسی میں اس نے ایک صوفیانہ زندگی اختیار کی تھی اور حیدر آباد کے مشہور بزرگ شاہ راجو قتال[2] کا مرید ہوگیا تھا جن کی خانقاہ میں اس کے آٹھوں پہر گذرتے تھے، اور کچھ اسی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ اس سے واقف نہ تھا، یہ اس وقت واقف ہوا ہے جبکہ محل کے غیر معمولی واقعات سے وہ مجبور ہوگیا، اور اہل محل نے اس کو واقف کرایا۔ اس سے پہلے عبداللہ کو مطلق خیال نہ تھا کہ اس کی بیٹی ابوالحسن کے عقد میں دیجائیگی اتفاق سے کچھ حالات ایسے نمودار ہوئے کہ ایک دم کایا پلٹ ہوگئی اور ابوالحسن کی شاہی خاندان میں شادی ہوگئی۔[3]

جن اسباب سے اور جس سُرعت کے ساتھ یہ کایا پلٹ ہوئی ہے وہ بہت حیرت انگیز ہیں۔ بات یہ تھی کہ جس لڑکی سے ابوالحسن کی شادی ہوئی ہے اس کی نسبت بہت پہلے سید سلطان نامی ایک حجازی بزرگ سے ہوچکی تھی۔ یہ سید سلطان بھی اسی طرح حیدر آباد میں آیا تھا جس طرح سید احمد کا ورود ہوا تھا چونکہ سید احمد کی طرح اس کا تعلق بھی حجاز کے ایک ذی عزت خاندان سے تھا، اس لیے دربار میں اس کی بہت آؤ بھگت ہونے لگی اور

---

[1] ۔ ماہ نامہ ص ۳۱۴ ـ ۳۱۵ ـ ۳۱۶۔

[2] ۔ ان کا اصل نام شاہ رضی الدینؒ ہے رفتح دروازے سے باہر ان کا مزار ہے، ان کے دادا کا بھی شاہ رضی الدینؒ نام تھا جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں حیدر آباد میں رہتے تھے، لیکن چند سیاسی حالات سے مجبور ہو کر بیجاپور چلے گئے تھے۔

[3] ۔ یہ روایت مشہور ہے کہ ابوالحسن کے مرشد شاہ رضی الدین راجوؒ نے پورے ایقان کے ساتھ پیشین گوئی کردی تھی کہ بادشاہ کی بیٹی سے اس کی شادی ہوگی۔

یہ عجیب اتفاق کی بات تھی کہ سید سلطان کے ساتھ سید احمد کے آبائی روابط بھی تھے، چنانچہ جب عبداللہ قطب شاہ نے سید احمد سے سید سلطان کی بابت دریافت کیا تو اس نے پوری صداقت کے ساتھ سید سلطان کے تمام واقعات بتا دیے، ان کی جان پہچان اس طرح کی تھی کہ دونوں ایک ہی دیار کے رہنے والے تھے، اور اس کے علاوہ سید سلطان سید احمد کے باپ کا شاگرد بھی تھا، اور اس میں سید احمد سے زیادہ خاندانی شرافت تھی۔ اس لیے عبداللہ قطب شاہ نے اپنی تیسری بیٹی، سید سلطان سے منسوب کر دی، ظاہر ہے کہ اس نسبت میں سید احمد کا مشورہ ضرور شامل تھا چونکہ یہ بڑا داماد تھا، اور سلطنت کے حل وعقد میں بھی شریک تھا، اس لیے ازدواجی نسبت کا سرانجام سید احمد کے مشورے کے بغیر کہاں ممکن تھا! اس نسبت کے ساتھ شادی کی تیاری شروع ہو گئی۔ اور اگر اس کے بعد غیر معمولی و ناگوار واقعات ظہور پذیر نہیں ہوتے تو سید سلطان سے شادی ہو جاتی اور گولکنڈے کی تاریخ کا انجام کچھ اور ہوتا۔ لیکن ایک واقعے سے سید احمد اور سید سلطان میں غایت درجے کی مخالفت ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ ایک روز عبداللہ قطب شاہ نے دربار میں سید سلطان سے دریافت کیا کہ تم سید احمد کے خاندان سے کس حد تک واقف ہو، وہ کس پایہ کا خاندان ہے؟ اس سوال کا جواب اچھا نہیں تھا، اس نے سید احمد اور اس کے خاندان کی مذمت تو نہیں کی بلکہ ان الفاظ میں تعریف ہی کی کہ: "وہ میرے استاد زادے ہیں اور ان کو خاندانی فضیلت بھی حاصل ہے"[1] لیکن یہ الفاظ سید احمد کی توقع سے بہت گرے ہوئے تھے، وہ اس سے زیادہ

---

[1] منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۰۶ ۔ حدیقۃ العالم جلد اول ص ۳۶۱ ۔ بعض مؤرخ اسی جواب کو بہت کھینچ تان کر پیش کرتے ہیں کہ سید سلطان نے اپنے خاندان کی بڑائی اور سید احمد کے خاندان کی حقارت کی۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس منزل پر جبکہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، اور اس تقریب کا سرانجام سب کچھ سید احمد کے ہاتھ میں تھا، سید سلطان اپنے مربی کی نسبت ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

تعریف چاہتا تھا، اس کو یہ خیال ہوا کہ سید سلطان اپنے کو بڑھانے کے لیے مجھے بادشاہ کی نظروں میں گرانا چاہتا ہے۔ اس واقعہ سے وہ سید سلطان کا دشمن ہو گیا۔

جوں جوں شادی کی تیاری ہو رہی تھی، سید احمد کی مخالفت کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ یہ اور اس کی بیوی اس نسبت کو توڑنا چاہتے تھے اور ہر خطرے کے لیے تیار تھے۔ شادی کی تیاریاں ہو گئیں اور بالآخر عقد کا دن آ گیا، اس کے ایک روز پہلے سید احمد نے بادشاہ کو اطلاع کر دی کہ "ہم اس شادی کے مخالف ہیں۔ اگر یہ شادی اٹل ہے تو میں گولکنڈے میں نہیں رہوں گا، بلکہ یہاں سے کوچ کر کے عالمگیر بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لوں گا"[1] چنانچہ اس کوچ کا بندوبست بھی شروع ہو گیا، صورت حال بہت نازک ہو گئی۔ عبداللہ قطب شاہ نے سید احمد کو بہتیرا سمجھایا، اور اس کو راضی کرنے کے لیے متعدد آدمی بھیجے، لیکن یہ سب بے فایدہ ہوا۔ سید احمد کی یہ دھمکی کہ وہ عالمگیر بادشاہ کے پاس بھاگنا چاہتا تھا عبداللہ قطب شاہ کو ڈرانے کے لیے خود کافی تھا۔ اول تو بادشاہ کو اپنی بڑی بیٹی اور داماد کا زیادہ پاس تھا، دوسرے اس میں مغلوں کا آیندہ خطرہ تھا، کیونکہ مغل تو گولکنڈے پر اپنی آنکھ لگائے بیٹھے تھے، چونکہ اس وقت سلطنت کی عنان حکومت سید احمد کے ہاتھ میں تھی اس لیے اس شخص کا مغلوں کے پاس بھاگ جانا سلطنت کے لیے بہت خطرناک ہوتا۔ بادشاہ سخت کشمکش میں پڑ گیا، لالچی درباریوں نے سمجھایا کہ اب سید سلطان سے شادی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، چونکہ شادی کی پوری تیاری بھی ہو چکی ہے اس لیے بجائے سید سلطان کے ابوالحسن سے شادی کر دی جائے تو مناسب ہے[2] اور اس مشکل کا واحد حل یہی تھا۔ بادشاہ نے

---

[1] بعض مورخ اس بیان میں بہت مبالغہ کرتے ہیں کہ سید احمد اور اس کی بیوی کے اغوا سے خود دلہن اور اس کی ماں خودکشی کرنے کے لیے تیار ہو گئیں کہ جونہی عقد کی تو پیں سر ہوں گی خنجر سے اپنے آپ کو بھونک لیں گی (گلزار آصفیہ ص ۱۴)۔

[2] دوسری طرف حضرت شاہ راجو کی خانقاہ کا عجیب منظر تھا، یہاں قدم قدم پر شادی کی تیاریوں کی خبر ملتی تھی، ابوالحسن تو مایوس ہو جاتا، لیکن حضرت راجو اس کو یقین دلاتے تھے کہ شادی تم سے ہی ہوگی، شادی کے

ناچار اس سے اتفاق کر لیا چنانچہ جس روز جبکہ سید سلطان کی شادی ہونے والی تھی ابوالحسن فوراً گولکنڈہ طلب کیا گیا، اور ان تمام تیاریوں کے ساتھ جو، اب تک عمل میں آئی تھیں ابوالحسن کی شادی ہوگئی اور سید سلطان عالمِ وحشت میں گولکنڈے سے فرار ہوگیا۔

ابوالحسن کی تخت نشینی

جس طرح ابوالحسن کی شادی ایک حیرت انگیز طریقے سے ہوئی تھی تقریباً اسی طرح اس کی تخت نشینی بھی ہوئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سید احمد کے ہوتے ہوئے جو عبداللہ قطب شاہ کا بڑا داماد تھا اور جو بادشاہِ وقت کے ساتھ اُمورِ سلطنت میں دخل رکھتا تھا، ابوالحسن کو تخت ملنے کی کیا توقع ہوسکتی تھی۔ یوں تو اس معاہدے کی رو سے جو ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۶ء میں ہوا تھا، اورنگ زیب کا بیٹا محمد سلطان وارث تخت تھا، لیکن یہ بھی اتفاق ہے کہ محمد سلطان اپنے باغیانہ رویہ کی وجہ سے شہنشاہ کی نظروں سے گر چکا اور نظربند تھا۔ شہنشاہ نے کبھی اس پر زور نہیں دیا کہ عبداللہ کے بعد محمد سلطان گولکنڈے کا بادشاہ ہو۔ ان حالات میں گولکنڈے کی جانشینی کا مسئلہ زیر بحث ہوگیا۔ اس وقت عبداللہ قطب شاہ کے دو داماد تھے، ایک تو سید احمد دوسرے ابوالحسن۔ ان میں سے ایک کو تخت ملنا چاہیئے تھا۔ سید احمد بڑا داماد تھا، اور اس کے علاوہ وہ اُمورِ سلطنت میں بادشاہ کا شریک تھا، اور خود عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں حکومت کی باگ تمام تر سید احمد کے ہاتھ میں تھی۔ جب تک بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم زندہ رہی ہے وہی حکومت کو مشورہ دیا کرتی تھی اور جب ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء میں اس کا انتقال ہوا تو عنانِ حکومت سید احمد کے ہاتھ آگئی۔ نیز اس کی بیوی جو ماں صاحب یا بڑی صاحبنی کے نام سے مشہور ہے

ایک روز پہلے ابوالحسن کو معلوم ہوا کہ گولکنڈے میں رسم ساچق ہونے والی ہے تو اس نے اپنے مرشد کو اس کی اطلاع کردی اور مرشدؒ نے اپنی خانقاہ میں بھی اس ساچق کا انتظام کر دیا، یعنی مٹی کے کونڈے جمع کر کے چند ضروری لوازم کے ساتھ ساچق کی شکل پیدا کر دی (گلزار آصفیہ ص ۴۶) اور یہ اس بات کا یقین تھا کہ گولکنڈے میں جو شادی ہو رہی ہے وہ خود ابوالحسن کی ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ہوئی۔

محل میں ذی اثر تھی اور اپنے شوہر کی جانشینی کے لیے اپنی پوری قوت استعمال کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس طریقے سے سید احمد کے بادشاہ ہونے کے بہت سے قرائن تھے۔ برخلاف اس کے ابوالحسن کو نہ تو تخت کا کوئی حق تھا نہ بظاہر اس کے کوئی اسباب تھے۔

قیاس یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کا کوئی بندوبست نہیں کیا اس کی وضاحت کسی تاریخ سے مشکل ہے[1] البتہ بادشاہ کی خاموشی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ غالباً سید احمد کی جانشینی کو پسند نہیں کرتا تھا اگر وہ اس کی جانشینی کو پسند کرتا تو نہ صرف اس کا کھلا اعلان کر دیتا بلکہ جہاں تک ہو سکتا اس کا قبل از وقت انتظام کر دیتا چونکہ یہ بندوبست نہیں ہوا تھا، اس لیے قرائن یہ ہیں کہ غالباً عبداللہ قطب شاہ ابوالحسن کی طرف مائل ہوگا، اور اس کے اسباب بھی ہیں کیونکہ ابوالحسن نہ صرف لائق اور پاکیزہ اخلاق آدمی تھا بلکہ قطب شاہی خاندان کا رکن بھی تھا اگر ٹیورنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو شادی ہونے کے بعد ابوالحسن کے اخلاق و عادات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت راجو کا مرید ہونے کی وجہ سے اس کے اخلاق و عادات کے خلاف کوئی بدگمانی نہیں کی جا سکتی۔ مقدس مرشد کا اس کے اخلاق پر ضرور اثر پڑا ہوگا، اس لیے اب اس سے کوئی بدگمانی اور مخالفت نہ تھی۔ اس طریقے سے اگر یہ قیاس کیا جائے کہ عبداللہ قطب شاہ، دل سے ابوالحسن کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا تو بے محل

---

[1] فرائر کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے سید مظفر کے کہنے سے ابوالحسن کو اپنا جانشین بنا دیا تھا (سفرنامہ فرائر جلد اول ص ۸۲۔۸۴) لیکن یہ بیان بہت کچھ بحث طلب ہے! اول تو سید مظفر کا اس زمانے میں اتنا اثر نہ تھا کہ وہ بادشاہ کو سید احمد کے خلاف مشورہ دیتا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ سید احمد کے خلاف بادشاہ کو مشورہ دینا کیا معنی رکھتا ہے! خصوصاً سید سلطان کی شادی کے فسخ ہونے کے بعد تو اہل گولکنڈہ سید احمد کے خطرے سے ضرور واقف تھے۔ لیکن اس قدر صحیح ہے کہ اہلِ گولکنڈہ سید احمد کے مقابلے میں ابوالحسن کی طرف مائل تھے اور سید مظفر ابوالحسن کا ہمدرد تھا۔

نہ ہوگا چنانچہ "ماہ نامہ" کا بیان ہے کہ شادی کے بعد بادشاہ نے اس کو خزانوں کی کنجیاں سپرد کر دی تھیں جن میں قیاس یہ ہے کہ پچاس کروڑ، پانچ لاکھ ہون تھے، اور امورِ سلطنت کی بھی تلقین کی تھی[1]" یہ الفاظ بڑی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ نیز قرائن کے خیال سے اس کی بالواسطہ تائید ہوتی ہے۔ اس کے متعلق اعلان کرنا، اور اس کا انتظام کرنا عبداللہ کے لیے ناممکن تھا۔

جانشینی کے متعلق عبداللہ قطب شاہ کا یہ خیال ہو یا نہ ہو، حالات تمام تر ابوالحسن کے موافق تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سید احمد کے غرور و تمکنت کے باعث گولکنڈے کے تمام اُمرا اور عمائدِ سلطنت اس کے مخالف ہوگئے تھے۔ اول تو ابوالحسن فطرتاً تند مزاج واقع ہوا تھا، دوسرے اس گھمنڈ میں تھا کہ میں بادشاہ کا بڑا داماد ہوں، ایک روز سلطنت کا مالک ہو جاؤں گا۔ یہ سب اسباب اس کی مخالفت اور ابوالحسن کی تائید میں جمع ہونے لگے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی زندگی میں ہی ابوالحسن کی بادشاہی کا سامان ہو گیا، اور اس کا باعث یہ تھا کہ:-

"ابوالحسن چون شکنجہ روزگار کشیدہ پانزدہ شانزدہ سال در لباس فقیری بسر بردہ سخت و سست جہان را تماشا نمودہ بود و با اکثر اُمرائے قطب الملک بزمان خوش و سلوک برادرانہ زیست می نمود و بیشتری از مرا بہ او گرویدہ بودند[2]"

حقیقت یہ ہے کہ ابوالحسن نے اچھے اخلاق و عادات کی وجہ سے اپنے اردگرد بہتر فضا پیدا کر لی تھی اور تمام دوست دشمن اس کے ہواخواہ ہوگئے۔ چنانچہ سلطنت کے دوسرے عمائد سید مظفر اور موسیٰ خاں محلدار اس کے بڑے ہمدرد تھے۔ ان کے ساتھ پیشکار اکنّا و مادنّا بھی شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابوالحسن کی پوری تائید کی یعنی

---

[1] ماہ نامہ ص ۳۱۶۔

[2] منتخب اللباب جلد سوم ص ۴۰۷-۴۰۸۔

ان کی رہنمائی کے بغیر ابوالحسن کی کامیابی ممکن نہ تھی چنانچہ جب عبداللہ قطب شاہ کی آخری گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں سلطنت کے عائد مستقبل کی سوچ میں پریشان پھرنے لگے اور ہر طرف ایک ہیجان معلوم ہوتا تھا، اور یہ خیال ہوا کہ بادشاہ کے مرنے سے پہلے جانشینی کا مسئلہ طے ہوجانا چاہیئے۔ جو لوگ سید احمد کے ہمدرد تھے وہ اس کے لیے کوشش کرنے لگے۔ برخلاف اس کے سید مظفر اور موسیٰ خاں جیسے لوگ ابوالحسن کی تائید میں کھڑے ہو گئے لیکن مرنے والے بادشاہ سے کسی وصیت کی توقع نہ تھی، اس پر ایسی غشی طاری ہوئی کہ اس کے بعد پھر اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ جانشینی کا مسئلہ تنازع للبقا کے لیے ملتوی رہا۔ ۲۱ راپریل ۱۶۷۲ء ۱۰۸۳ھ کو عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہوا اس کے انتقال سے پہلے ہی خانہ جنگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے کیونکہ اس وقت جانشینی کے مسئلے کو حل کرنے والے دو فریق تھے جو ایک دوسرے کے حریف تھے اور ہر فریق اپنے امیدوار کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا۔ سید احمد کو یہ فایدہ تھا کہ اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل تھا، اور حکومت کے تمام آلات اس کے ہاتھ میں تھے، اس کی بیوی "بڑی صاحبتی" محل کے اندر اپنا پورا اثر رکھتی تھی اور ہر قسم کے مقابلے کے لیے تیار تھی! ابھی بادشاہ غشی کے عالم میں تھا کہ اس کی موت کا واویلا مچنے لگا۔ ابوالحسن اپنے کو بے دست و پا سمجھتا تھا اس خیال سے کہ خاموش بیٹھنا اچھا نہیں ہے، گھوڑے پر سوار ہو کر محل تک پہنچ گیا تاکہ صورتِ حال پر قابو حاصل ہوجائے۔ ابوالحسن کے اچانک آجانے سے محل میں ایک سنسنی سی ہوگئی۔ سید احمد کے ہواخواہوں کو ڈر ہوا کہ عین وقت پر یہ اپنے ہواخواہوں کی مدد سے مرکزی حکومت پر قبضہ حاصل کرلیگا۔ یہ کہا گیا کہ ابوالحسن آمادۂ فساد ہے اور اس لیے اس کی پوری مزاحمت کی تاکہ وہ اندر نہ آنے پائے! اس میں ایک چھوٹی سی جھڑپ ہوگئی۔ سید احمد کے ہواخواہوں نے ڈنڈوں کے ذریعے ابوالحسن کا مقابلہ کیا۔ چونکہ ابوالحسن نہتا تھا، اس لیے اس کو پسپا ہونا پڑا۔ یہ خود تو بچ گیا، لیکن عبداللہ نامی ایک شخص کے وار سے اس کے گھوڑے کا پٹھا مجروح ہوگیا۔ جب ابوالحسن مجبور ہو کر شاہی محل سے پلٹا تو سیدھے سید مظفر کے گھر گیا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس کے ہمدرد سید مظفر اور موسیٰ خاں تھے، اور روتے ہوئے اس کے سامنے زمین پر پڑ گیا[ا]۔ سید مظفر نے کہا کہ اُس گریہ وزاری کی کیا ضرورت ہے، ہمت سے کام لینا چاہیئے کہ اگر کامیاب ہوجائیں تو

[ا] خافی خاں تو کہتا ہے کہ "وہ بے ہوش ہو کر پڑ گیا"، لیکن یہ غالباً مبالغہ ہے۔ اتنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اسی دارو گیر میں

تخت ملیگا، ورنہ تختہ۔[1] ان الفاظ میں دھمکی اور نصیحت دونوں چیزیں شامل تھیں تاکہ ابوالحسن ہمت نہ ہارے۔ اور اسی سے سید مظفر کی سیاسی قابلیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان حالات سے پریشان نہیں ہوا بلکہ ٹھنڈے دل سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا۔ غالباً وہ اس راز سے واقف تھا کہ فریق مخالف میں کس قدر دم خم ہے۔

خانہ جنگی کا تمام سامان جمع ہوگیا۔ سید احمد محل کے باہر اپنے تمام ہواخواہوں اور آلات حکومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا، اور محل کے اندر اس کی بیوی زنانہ فوج کے ساتھ مسلح کھڑی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ "ماں صاحب" کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور اس کے ساتھ کنیزان حبشی اور ترکی مسلح کھڑی تھیں۔ ادھر سید مظفر اور اس کے شرکاء کار ابوالحسن کی تائید کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ چونکہ جانشینی کا فیصلہ فریقین کی تلوار پر منحصر تھا، اس لیے ایک خانہ جنگی یقینی تھی! اس سے پہلے ابوالحسن سے ایک جھڑپ تو ہو چکی تھی، اگر حالات پر ہوشیاری سے قابو حاصل نہیں کیا جاتا تو سخت لڑائی ہو جاتی جو گولکنڈے کے لیے مہلک ہوتی۔ لیکن اس معاملے میں دو چیزوں نے کام کیا، ایک تو سید احمد کی غیر ہر دلعزیزی تھی، صرف معدودے چند آدمی اس کے خیرخواہ رہ گئے تھے، اکثر ایسے تھے جو بظاہر اس کے ہمدرد معلوم ہوتے تھے لیکن دل سے اس کے مخالف تھے۔[2] سید احمد کا اعتماد ایسے لوگوں پر ہی تھا، چنانچہ جب کام کا وقت آیا تو یہ سب چپکے سے ابوالحسن کی تائید پر کھڑے ہوگئے اور سید مظفر کی غیر معمولی سیاسی قابلیت بہت جلد تمام حالات پر قابو پا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید مظفر نے نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ تمام سیاسی ہتھکنڈے

اس پر بدحواسی ضرور طاری ہوئی ہوگی اور اسی عالم میں وہ سید مظفر کے گھر آیا تھا۔

[1] منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۰۸۔

[2] موسیٰ خاں جوالدار کو بعض مؤرخ سید احمد کا موید بتاتے ہیں (حدیقۃ العالم جلد اول ص ۳۶۷) اور دوسرے اس کو سید مظفر کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اگر اس کا سید احمد کے ساتھ شریک ہونا صحیح بھی ہے تو وہ بظاہر ہوگا، مگر دل سے ابوالحسن کے ساتھ شریک تھا۔

پہلے سے سوچ لیے تھے اور وقت کا منتظر تھا۔ اگر اس موقع پر سید مظفر نہ ہوتا تو ابوالحسن کو کبھی تخت نہیں ملتا چنانچہ اس نے ابوالحسن کو ہمراہ لے کر پہلے ان مقامات کی گرفت کی جہاں نگرانی کی ضرورت تھی، چونکہ فوج اس کے ہاتھ میں تھی اس لیے اس نے آسانی کے ساتھ شاہی محلات کا محاصرہ کر لیا جہاں "ماں صاحب" تھی اور بادشاہ سسکیاں لے رہے تھے، اسی جگہ سید احمد بھی تھا اس محاصرے سے سید احمد اور اس کی بیوی جن سے مقابلہ تھا، بے دست و پا ہو گئے اور کوئی حرکت نہ کر سکے۔ پھر سید مظفر نے بعض اہل دربار کو جو بادشاہ کے مقرب تھے اشارہ کیا کہ وہ سید احمد سے کنارہ کش ہو جائیں اور ابوالحسن کی تائید کریں۔ اس طریقے سے سید احمد اور ماں صاحب کے حوصلے اور تیاریاں خاک میں مل گئیں، اور جوں ہی عبداللہ قطب شاہ کی روح پرواز ہوئی ابوالحسن قطب شاہ کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا۔

سید احمد قید میں رکھا گیا، اسی قید میں وہ ایک سال کے بعد مر گیا۔ غالباً اس کی بیوی بھی قید میں ہی مری۔ سید احمد کے ساتھ اس کے بعض متعلقین بھی گرفتار ہوئے تھے۔ سید سلطان تو بہت پہلے فرار ہو گیا، اور شہنشاہ اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس کو وہاں خطابات و مناصب بھی عطا ہوئے، لیکن اس کا ایک بیٹا سید معصوم علی اس وقت تک گولکنڈے میں تھا۔ ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد موقع پاکر یہ شخص بھی گولکنڈے سے بھاگ گیا، اور مغل سلطنت کا ملازم ہو گیا۔ ان لوگوں کا بھاگنا، اور مغل سلطنت میں شریک ہونا، آیندہ گولکنڈے کی سلطنت کے لیے بہت مضر ہوا۔

اٹھارھواں باب

مادنّا کی وزارت

ابوالحسن قطب شاہ، دکن میں "تانا شاہ" کے ہر دلعزیز لقب سے مشہور ہے جس طرح اس کی شادی اور تخت نشینی تلاطم خیز تھی، اسی طرح اس کا پندرہ سالہ عہد حکومت بھی بڑا پُر آشوب ثابت ہوا یہ ایسے وقت میں تخت نشیں ہوا تھا جبکہ دکن میں چاروں طرف گرم آندھیاں اُٹھ رہی تھیں۔ مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے دکن کی تمام سرزمین دہلی تھی۔ سیاست و معاشرت کے تمام تار و پود اس طرح بکھر رہے تھے کہ ان کو یکجا کرنا مشکل تھا۔ مغلوں کا سیلاب شمال سے اس زور سے اُمنڈ آیا کہ اس کے سامنے دکن کی کوئی طاقت ٹھیر نہیں سکتی تھی۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ تانا شاہ ان حالات کا اچھا مقابل تھا اس میں حکمرانی کی قابلیت تھی اور جہانبانی کے حوصلے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت شاہی محلوں سے دُور ایسے ویرانوں میں ہوئی تھی جہاں علمی و سیاسی تربیت کے اچھے مواقع تھے۔ اپنی خانگی اور صوفیانہ زندگی میں اس نے "شکنجہ روزگار کشیدہ ..... سخت و سُست جہاں را تماشا نمودہ بود"۔[1] اس کی بیدار مغزی میں کلام نہیں۔ سیاست میں اس نے ایک وسیع نظر پائی تھی۔ یہ اپنے پیشرؤوں سے زیادہ مستعد و جفاکش تھا۔ دکن کی تمام سیاست سے واقف تھا جو ہر روز اُلجھ رہی تھی یہ دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے کہ گو اس کی نشو و نما شاہی محلوں میں نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے ایسے شاہانہ طور و طریق اختیار کیے تھے کہ گویا بادشاہی اس کا

---

[1] قطب شاہوں کی تاریخ میں سلطان قلی قطب شاہ کے بعد ابوالحسن قطب شاہ کا درجہ ہے جس نے غربت سے شاہی حاصل کی تھی اور زندگی کے مختلف مدارج دیکھے تھے۔

حقیقی ورثہ تھا۔ اس کے بلند کردار اور غیر متزلزل خودداری و استقلال جو ہر موقعے پر ظاہر ہوئے ایسے اوصاف تھے کہ ان کی مثال نہیں۔ اور یہ ایک کامیاب جہانبانی کے ضروری لوازم ہیں۔ اگر شمال سے مغلوں کا زور دار ریلا نہیں آتا جو شہنشاہ اورنگ زیب کے جلو میں آیا، اور دکنی طاقتوں کو بہالے گیا، تو قرائن یہ ہیں کہ ابوالحسن دکن کا اچھا رہنما ہوتا۔

۵ر محرم ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ء) کو ابوالحسن کی بادشاہی کا اعلان ہوا لیکن غالباً ماہ محرم کا لحاظ کر کے تخت نشینی کی اصل رسم آٹھ روز کے بعد یعنی ۱۳ر محرم کو منائی گئی۔ اس روز شاہی دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ کی تخت نشینی کے ساتھ پرانے دستور کے مطابق اُمراء و عمائد سلطنت نے نذرانے دیے اور بادشاہ کی طرف سے انہیں خلعتیں ملیں جن لوگوں نے ابوالحسن کی تخت نشینی میں مدد کی تھی وہ سب سے زیادہ شاہی عنایات کے مستحق تھے، بادشاہ نے ان کا احسان مانا، اور ان کی محنت کا صلہ دیا۔ چنانچہ اس دور کے روح رواں سید مظفر کو جو عبداللہ کے آخری زمانے میں سرخیل کی خدمت پر مامور تھا، امیرالاُمراء کا خطاب اور میر جملگی کا عہدہ عطا کیا گیا۔ موسیٰ خاں حوالدار کو خانخاناں کے خطاب کے ساتھ سرخیل کے عہدے پر فائز کیا گیا، یہ اب تک محلدار تھا۔ اکنّا اور مادنّا جو دونوں سگے بھائی تھے اور سید مظفر کے ساتھ تخت نشینی کے معرکے میں شریک تھے ترقی دی گئی۔ مادنّا کو سید مظفر کا پیشکار بنایا گیا، اور اکنّا اپنے بھائی کا معتمد مقرر ہوا۔ رضا قلی نیک نام خاں جو کرناٹک کا طرفدار تھا، اپنی خدمت پر بحال رہا۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا گیا، اور ادھر شمال میں مغل سلطنت سے سیاسی تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب کی خدمت میں نذرانہ ارسال کر کے اطاعت کا وعدہ کیا گیا۔ شہنشاہ نے میر عبدالرحمٰن اور خواجہ عثمان کے ذریعہ ایک فرمان بھیجا جس میں ابوالحسن کی بادشاہی تو تسلیم کر لی لیکن یہ ہدایت کی کہ مقررہ پیش کش برابر ادا کیا کرے، اور سیواجی کی مدد نہ کرے[1]۔ اور اس کے بعد ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵ء) میں ابوالحسن نے قوام الدین حاجب کے ہمراہ شہنشاہ کی خدمت میں

---

[1] شہنشاہ اورنگ زیب کا فرمان، ابوالحسن کے نام :-

"در حضور خانہ زاد . . . . عبدالرحمٰن کہ حامل این فرمان است . . . . وخواجہ عثمان . . . .

دست بر قرآن گذاشتہ باشد قسم واللہ و باللہ یاد کند کہ اصلاً و مطلقاً در ہیچ امرے

نو لاکھ روپیے جواہر، اور ہاتھی بطور پیش کش بھیجے تھے[1]۔ اگر ان جدید عہدہ داروں کی جن کو ابوالحسن نے ترقی دی تھی، بے وفائی

از امور بہ ظاہر و باطن از طریق اطاعت و انقیاد و خلوص و اعتقاد تخلف و انحراف نہ ورزد۔
و در استیصال سیوائے مقہور ...... بہ اولیائے دولت قاہرہ متفق بودہ از امداد و اعانت او
اجتناب واجب شناختہ ..... و مبلغ چہل ولک روپیہ پیش کش حال را با وجہ پیش کش
مقررے و بقایائے سال بہ سال ...... بہ خزانہ عامرہ صوبۂ دولت آباد ......
ارسال پیش کشہائے بائستہ کند۔" (تاریخ ظفرہ ص ۲۷)۔

ابوالحسن کا انقیاد نامہ:۔

گلکنڈہ و مضافاتش کہ بہ عبد اللہ قطب الملک مرحوم متعلق بود پس از وفات آن مغفور و مبرور
بہ این مرید درست اخلاص بشرط اقامت بر جادۂ اطاعت و انقیاد .. بعطا فرمودہ فرمان ....
مزین بہ دستخط قدسی ... شرف صدر یافتہ این ارادتمند ظہور نمود کہ در ہیچ حالت سررشتہ اخلاص و
اطاعت نسبت بہ بندگان　کہ از استصواب ...... خان جہان بہادر کوکلتاش
قرار یافتہ سال بہ سال .... گذرانیدہ باشد ...... سیوائے مقہور
شقاوت پیشہ را .... بہ دل و جان دشمن دانستہ ....
از امداد اعانت او .... اجتناب لازم .... در حضور
میر عبد الرحمن .... و خواجہ عثمان .... دست
بر قرآن مجید گذاشتہ قسم واللہ باللہ باز نمود .... کہ تادم واپسین ... ہرگز پیرامون
خلاف و اختلاف نہ گردد۔ تحریر ۱۸ ر صفر سنہ ۱۰۸۶ھ" (تاریخ ظفرہ ص ۲۹۔

[1] مآثر عالمگیری ص ۱۴۴۔

سدراہ نہ ہوتی تو یہ نظام حکومت برسوں تک چلتا، اور غالباً مغل شہنشاہت کو اس سلطنت میں دخل دینے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ترقی پاتے ہی محمد سعید میر جملہ کی طرح سید مظفر نے بھی سلطنت سے بے وفائی کی۔

چونکہ سید مظفر جو، اب میر جملہ کی خدمت پر فائز تھا، ابوالحسن کی تمام ترقی کا باعث تھا، اس لیے اس کی حیثیت "بادشاہ گر" کی سی تھی، اور تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں "بادشاہ" اور "بادشاہ گر" ایک جگہ جمع ہوئے حصولِ اقتدار کی کش مکش شروع ہو گئی۔ سید مظفر یہ سمجھنے لگا کہ شاہی اقتدار اس کا حق ہے، کیونکہ اس کی دستگیری کے بغیر ابوالحسن کو یہ درجہ نصیب نہ ہوتا۔ اس نے بہت جلد تمام سیاہ و سفید اپنے ہاتھ میں کر لیے اور بادشاہ کو بالکل کٹھ پتلی بنانے کی کوشش کی اور جو لوگ ابوالحسن کے ہمدرد تھے ان کا بری طرح پیچھا کیا۔ چنانچہ موسیٰ خاں سے جو بادشاہ کا ہمدرد تھا، اس کی ان بن ہو گئی۔ جس طرح اس نے مرکزی حکومت میں بے وفائی کی اسی طرح سلطنت کے دُور دراز صوبوں میں بھی خود غرضی سے کام لیا، اور قطب شاہی مفاد کو نقصان پہنچایا۔ چنانچہ نیک نام خاں کے انتقال تک جو ۱۲؍ رجون ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کو ہوا، کرناٹک کے حالات بہ دستور رہے، کیونکہ مغربی تاجر اس سے بہت ڈرتے تھے، لیکن اس کے بعد جب موسیٰ خاں یہاں کا طرفدار ہوا تو سید مظفر نے اس کو بہت ستایا، اور فرانسیسیوں کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی سان تھوم اور پلی کٹ پر قابض ہو گئے اور مسلمان ملاحوں کی کشتیاں تباہ کر دیں جو گولکنڈے کے لیے بہت شرم کی بات تھی اور بادشاہ کو اس کی بالکل اطلاع نہیں دی گئی۔ اگر موسیٰ خاں اپنے طور پر ہمت نہیں کرتا تو یہ مغربی کمپنیاں بے قابو ہو جاتیں اور حکومت کو اپنا اقتدار قایم رکھنا بہت مشکل ہو جاتا۔ ابوالحسن نے اس خطرے کو دُور کرنے میں بڑی دُور اندیشی سے کام لیا۔ اگر وہ اس معاملے میں جلدی کرتا تو محمد سعید کا سا پھر نیا شاخسانہ پیدا ہو جاتا، اور اس سے سلطنت کو ایک نیا دھکا لگتا۔ پہلے تو ابوالحسن خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کرتا رہا، اور اپنی حالت کچھ اس طرح بنائی کہ گویا وہ بہت ہی تن آسان و عیاش آدمی ہے، اور امورِ سلطنت سے قطعی بے پروا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید مظفر بادشاہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا کہ گویا دربار سے اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوگی۔ اس کو صرف موسیٰ خاں سے ڈر لگتا تھا، اسی وجہ سے اس کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ مرکزی حکومت سے دُور کرنے کے لیے کہ وہ یہاں اپنا جال نہ پھیلائے، پہلے اس کو کرناٹک کا طرفدار بنا دیا۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ کرناٹک میں

موسیٰ خاں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے تو اس کو وہاں سے بھی برخاست کر دیا، اور جب یہ مرکز میں واپس آیا تو اس کو غدار اور خاین ٹھیرانے کے لیے اس کے حساب کی تنقیح شروع کر دی ظاہر ہے کہ میر جملہ کی حیثیت میں سید مظفر کو یہ حق حاصل تھا کہ جمع و خرچ کا حساب دیکھے، موسیٰ خاں کے برامن پیشکار سے تمام مواد حاصل کر کے تنقیح کی گئی اور پھر خیانت ثابت کی گئی اور اس علت میں وہ قید کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ خاں کے مکان سے پانچ لاکھ ہون نقد اور جواہرات برآمد ہوئے تھے

موسیٰ خاں کی گرفتاری سے سید مظفر کے حوصلے اور بڑھ گئے، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ موسیٰ خاں تنہا اس کے راستے میں حائل ہے۔ اب اس نے بادشاہ کو بالکل بے دخل کر دیا، اور تمام اُمورِ سلطنت خود فیصل کرنے لگا۔ بادشاہ کے لیے صرف یہ چارہ کار تھا کہ اپنے چند ہمدردوں کو جمع کر کے نہایت خاموشی کے ساتھ سید مظفر کو گرفتار کرائے۔ جب بادشاہ نے اپنے عہدہ داروں کو ٹٹولا تو کئی فوجی افسر اور سید مظفر کے پیشکار اکنّا و مادنّا، اس سازش کے لیے تیار ہو گئے۔ مادنّا نے سید مظفر کو بے دست و پا کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے ذی اقتدار فوجی عہدہ داروں کو دُور دراز صوبوں میں بھیج دیا تاکہ اس کا کوئی بس نہ چل سکے چنانچہ جب اس کی تیاری ہوگئی تو پھر ان لوگوں نے بادشاہ کو اشارہ کیا کہ وہ اب سید مظفر کے خلاف کارروائی کرے۔ اکنّا و مادنّا کی اس سازش سے تمام مطلع صاف ہوگیا۔[1] سید مظفر کو اس سازش کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ [illegible] دربارِ عام منعقد ہوا، اور اس کھلے دربار میں بادشاہ نے پورے اطمینان قلب کے ساتھ سید مظفر کی حرص و آز اور غدّاری بیان کی اور کہا کہ اس جرم کی سوائے موت کے کوئی دوسری سزا نہیں ہوسکتی لیکن اس کی دیرینہ خدمات کا لحاظ کر کے یہ رعایت کی گئی تھی کہ بخشی الممالک کی پرانی خدمت اور اس کی جاگیریں بحال رکھی گئیں۔[2] اس کے بعد اسی دربار میں

---

[1] اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ مادنّا نے اپنی ترقی کی خاطر بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سید مظفر کا خاتمہ کرے، چونکہ یہ سید مظفر کا پیشکار تھا، اور اس کے راز سے واقف تھا، اور سید مظفر کے تمام کاروبار اس کے ہاتھ میں تھے، اس لیے سید مظفر کو بے دست و پا کرنا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ خافی خاں جلد سوم ص ۔ ۳۱۴ ۔ مآثر عالمگیری ص ۲۲۷ ۔

[2] لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو سید مظفر نے بادشاہ کے اس فیصلے کے خلاف مزاحمت کی

مادنا کو میر جملہ بنایا گیا عطائے عہدہ کے ساتھ اس کو خلعت اور "سوریا پرکاش راؤ" خطاب ملا۔ اس کا بھائی اکنا، اس کا پیشکار ہوا موسیٰ بیگ خاں نامی ایک اور شخص کو فوج کا سرخیل بنایا گیا لیکن آیندہ کی احتیاط کر کے بادشاہ نے فوج کی تنخواہوں کی تقسیم راست اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ اس دربار کا انعقاد اور اس کی تمام کارروائی اس قدر اچانک طریقے سے ہوئی کہ سید مظفر اور اس کے حاشیے کے لوگ ششدر ہو کر رہ گئے۔ ان کو سان گمان نہ تھا کہ اس قدر جلد کایا پلٹ ہو جائیگی۔ اور جب بادشاہ اپنے احکام کا اعلان کر رہا تھا تو بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ماتھے پر بل تک نہیں پڑے، بلکہ ہر موقعے پر اس کا چہرہ شگفتہ رہا جس سے اس کے بلند پایہ کردار کا پتا چلتا ہے[1]۔

مادنا، اور اس کا خاندان ٹھیٹ تلنگانے کا رہنے والا تھا، اور ہنمکنڈے میں ان کا گھر تھا[2]۔ مادنا کے باپ، دادا سب قطب شاہی سلطنت کے پرانے متوسل اور خدمتگذار تھے۔ مادنا، اور اس کے دوسرے بھائیوں کی تعلیم و تربیت اس زمانے کی ضروریات کے مطابق ہوئی تھی، یہ فارسی اور ہندی جانتے تھے[3]۔ عجیب اتفاق ہے کہ قطب شاہوں کی دو سو سالہ تاریخ میں آج سب سے پہلے تلنگانے کا ایک باشندہ وزارت پر مامور ہوا جہاں اب تک ترک و ایرانی فائز ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو غالباً اس ملک کی زیادہ واقفیت نہ ہوتی تھی۔ مادنا کی خواہ کتنی ہی مذمت کی جائے لیکن اتنا تو

اس پیے وہ قید کر دیا گیا لیکن مغل حاجب نے قید سے رہا کر کے اس کو اور اس کے بیٹے سید ہاشم کو شہنشاہ اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا (مآثر عالمگیری ص ۲۲۷)۔

[1] اس دربار کے ضروری معلومات مدراس کے انگریزی وثائق سے ماخوذ ہیں اور بھوپال راؤ صاحب ام، اے کے توسط سے مجھے ملے، موصوف کا بہت ممنون ہوں۔

[2] مادنا کے باپ کا نام بھانوجی پنتلو، اور ماں کا نام بھاگیا، بتایا جاتا ہے۔ یہ ہنمکنڈے کے رہنے والے تھے بھانوجی پنتلو ہنمکنڈے کے عامل کے تحت مال کی خدمت پر فائز تھا، اس کے چار بیٹے تھے منجملہ ان کے بڑا، اکنا، اور اس کا بھائی مادنا بہت مشہور ہوئے۔

[3] بھانوجی نے اپنے بیٹوں کو اس زمانے کی ضرورت کے مطابق تلنگی اور فارسی کی تعلیم دی تھی، چنانچہ یہ لوگ شاہی فرامین

صحیح ہے کہ یہ قطب شاہی سلطنت سے جہاں اس کی کئی پشتیں گذری تھیں اپنے پیشروؤں سے زیادہ واقف تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس عہدے پر اچانک فائز نہیں ہوا تھا بلکہ درجہ بہ درجہ ترقی کر کے تجربے سیکھے تھے۔[1] بادشاہ کو اس پر پورا اعتماد تھا، اور یہ اعتماد آخر وقت تک رہا۔ ملک کے تمام لوگ اس کے دشمن ہو گئے تھے لیکن ابو الحسن اس سے کبھی بدگمان نہیں ہوا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ابو الحسن اور سید مظفر کی اَن بن ہو گئی تو اس نے اپنے آقا کی اڑے وقت پر مدد کی۔ اور جب تک یہ وزیر رہا ملک و مالک کے ساتھ وفاداری کی، اور بادشاہ کو اس طرح بے دخل کرنے کی کوشش نہیں کی جس طرح سید مظفر نے کی تھی نیز اس کا سیاسی مسلک خارجی اور داخلی اُمور میں وہی تھا جو بادشاہ چاہتا تھا اور گزشتہ سلاطین کے ہمیشہ پیشِ نظر تھا۔ سلطنت کا دائمی مقصد یہ تھا کہ ملک کی خوش حالی و ترقی اور بیرونی حملہ آوروں کا ایسا سدباب ہو جس سے نہ صرف قطب شاہی سلطنت، بلکہ تمام دکن کی حفاظت ہو سکے۔ صوبۂ کرناٹک کا بندوبست ایسا قابلِ اطمینان تھا جیسا نیک نام خاں کے دَور میں تھا۔ متوفی تاجروں پر ایسی گرفت تھی کہ وہ آخری دَور تک سلطنت کے آئین کی پوری پابندی کرنے کے لیے مجبور تھے۔

پڑھ سکتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ابو الحسن کے عہد میں شہنشاہی فرمان آیا جو سفید روشنائی میں لکھا ہوا تھا، صرف مادنّا اس کو پڑھ سکا، اور اسی روشنائی میں اس کا جواب لکھ دیا۔

[1] یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ مادنّا، اور اس کے بھائی اکنّا کی ملازمت کب سے شروع ہوئی غالباً یہ لوگ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ملازم ہوئے ہوں گے۔ ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۹ء میں مادنّا نے محکمۂ مال کی خدمت انجام دی اور ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۶ء میں سید مظفر سرخیل کا معتمد مقرر ہوا تھا، اور اس کی تمام ترقی اسی کی وجہ سے ہوئی تھی چنانچہ سب مؤرخ اس کو "سید مظفر کا آفریدہ" لکھتے ہیں، اور جب ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۶ء میں سید مظفر میر جملہ ہو گیا تو یہ اس کا پیشکار مقرر ہوا، اور اس کے تمام کاروبار اسی کے ہاتھ میں تھے۔ ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۶ء میں مادنّا میر جملہ یا دیوان ہو گیا، اور غالباً یہ پیشوائی کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ مادنّا، اور اس کے خاندان سے متعلق یہ ضروری معلومات تلنگی ماخذوں سے دستیاب ہوئے ہیں، اور مجھے بھوپال راؤ صاحب ایم، اے کی مہربانی سے ملے۔ مادنّا کے پسماندگان ہنمکنڈے میں اب تک موجود ہیں اور ان کے ہاں اسناد بھی ہیں۔

اس عہد میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ مرکزی حکومت کی کارکردگی بڑھانے کے ساتھ مرکزی اور مقامی حکومتوں میں خاطر خواہ ربط پیدا ہو تاکہ اس ذریعے سے جو کارکردگی مرکز میں ہو وہی مقامی حکومتوں کو حاصل ہو سکے یہ بات پیشرو حکومتوں میں یقینی جس زمانے سے مادنّا نے وزارت کا جائزہ لیا تھا بادشاہ اور اس کے وزیر نے کئی مرتبہ تمام سلطنت کا، اور خاص طور پر کرناٹک کا دورہ کیا، کیونکہ یہ نو مفتوحہ صوبہ تھا، اور یہاں مغربی تاجروں کی وجہ سے آئے دن بدانتظامی ہوتی تھی، چنانچہ پہلا دورہ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء نومبر میں شروع ہوا، اور ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء جنوری میں ختم ہوا۔ اس کے بعد دوسرا دورہ ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں اور تیسرا ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں ہوا۔ ان دوروں میں سلطنت کے تمام طول و عرض کا بہ ذات خود معاینہ کیا گیا[1]۔ مغربی تاجروں کی کمپنیاں جو مسولی پٹم۔ مدراس اور پلیکٹ میں تھیں ان کی نگرانی کی گئی۔ کونڈپلی[2]۔ کونڈبیر وغیرہ کے اہم قلعوں کی مرمت کروائی گئی اور فوجوں کا انتظام کیا گیا۔ مغربی تاجروں اور کمپنیوں کے چشم دید معلومات حاصل کر کے ان کے متعلق مستقل ضابطے بنائے گئے، اور جب کبھی یہ تاجر آئین شکنی کرتے تھے ان پر بہت سختی کی جاتی تھی اور اس معاملے میں مقامی عہدہ داروں کی پوری تائید کی گئی۔ زراعت کو فروغ دینے کے مختلف طریقے اختیار کیے گئے، تمام ملک میں جدید باؤلیاں۔ تالاب اور کنٹے بنائے گئے۔ وصول مالگزاری کا قدیم زمانے سے جو بے ڈھنگا طریقہ یعنی اجارہ داری رائج تھی، وہ مادنّا نے مسدود کر دی کیونکہ اس طریقے سے کاشتکاروں پر زبردستیاں ہوتی تھیں اور

---

[1] مغل مؤرخ لکھتے ہیں کہ "ابوالحسن اس قدر تن آسان تھا کہ کبھی محل کے باہر نہیں نکلا" محمد ساقی کا بیان ہے کہ "از شہر حیدرآباد غیر از مسافت یک کروہ از محمد نگر در پانزدہ سالہ حکومت سفر گزیں نہ شدہ (مآثر عالمگیری ص ۳۰۸) لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔

[2] کونڈپلی کے قلعے میں ابوالحسن بہت دنوں تک رہا تھا، یہاں سے اس نے تمام مشرقی تلنگانے اور کرناٹک کی نگہداشت کی تھی۔ یہ قلعہ جو بجواڑے سے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے مشرقی گھاٹ کی ایک بلند چوٹی پر بنا ہوا ہے، اس کا موقع محل مشرقی تلنگانے اور کرناٹک کی نگہداشت کے لیے بہت اچھا ہے۔ اس میں ابوالحسن کے بنائے ہوئے آثار موجود ہیں۔

دیہات ویران ہو گئے تھے ان کو از سر نو بسایا گیا۔ اجارہ داروں کی جگہ مستقل تنخواہ یاب حکام مامور کیے گئے۔ چونکہ ملک میں اوقاف یعنی اگرہار بہت تھے اور ان سے سرکاری مالگزاری میں خسارہ ہوتا تھا اس لیے ان پر بھی محصول عائد کیا گیا جن اوقاف کا انتظام اچھا نہیں تھا وہ شریک خالصہ کر لیے گئے۔ اس عہد سے پہلے کان کنی کی صنعت جس کی وجہ سے گولکنڈہ تمام ایشیا میں مشہور تھا خراب ہو گئی تھی اس کو پھر زندہ کیا گیا، اور معدنوں میں کام کرنے والوں کی اجرت بڑھائی گئی۔ اس انتظام نے ملک کی خوش حالی میں بہت اضافہ ہوا۔[1]

خارجی مسلک

اندرونی نظم و نسق کے بہ نسبت دکن کی خارجی سیاست زیادہ پیچیدہ اور جاذب توجہ تھی، کیونکہ اس ملک کو بالآخر ہندوستان کی بہت بڑی طاقت مغل شہنشاہت کا مقابلہ کرنا تھا جو اس زمانے میں بڑی شدت کے ساتھ اثر انداز تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں مرزا جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے شکستیں ہو رہی تھیں سیواجی شمال سے بھاگ کر پھر اپنے کوہستانی مسکنوں میں جاگزیں ہو گیا، اور لڑائی کی تیاریاں کرنے لگا۔ خود جے سنگھ کی شکستیں مغل سلطنت کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھیں اور شہنشاہت اس کا انتقام لینا چاہتی تھی کہ مرہٹوں کا پھر خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس طریقے سے شہنشاہت کو دکن کی طرف دُہری توجہ کرنی تھی۔ ادھر دکن کی نئی اور پرانی طاقتوں کو بھی اپنی مدافعت کا ضروری سامان کرنا پڑا کیونکہ یہ مغلوں کی پیشقدمی کا سدباب کر کے اپنی ہستی قایم رکھنا چاہتی تھیں۔ جے سنگھ کے مرنے کے بعد شہنشاہ نے ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء میں شہزادہ معظم کو دکن کا گورنر بنایا، اور جسونت سنگھ کو فوج کی کمان دی۔ اس جدید انتظام سے کوئی فوری خطرہ تو نہیں تھا لیکن دکن کے لیے مشکل یہ تھی کہ ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء سے بیجاپور کی سیاست ایسی اُلجھ گئی کہ اس کی وجہ سے تمام دکن کے معاملات سقیم ہو گئے۔ اس اچانک کمزوری سے مغلوں کو جو بیجاپور میں دخل دینے کا موقعہ ملا تو دوسری طاقتیں بھی آسانی سے اس کی زد میں آگئیں اور بالآخر مغل سیلاب میں بہہ گئیں۔

---

[1] یہ معلومات مدراس کے مشرقی کتب خانے سے حاصل کیے گئے ہیں، "یعنی کیفیت" ص ۶۱ مجھے بھوپال راؤ صاحب ایم، اے کے توسط سے ملے۔



سلطان علی عادل شاہ ثانی

جب تک علی عادل شاہ ثانی زندہ تھا دکن پر کوئی آنچ نہ آئی۔ دکن کے اس آخری سورما نے ایک طرف مرہٹوں کو روکا تو دوسری طرف مغلوں کا راستہ بند کیا لیکن جب ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء میں اس کا انتقال ہوگیا تو بیجاپور کی کایا پلٹ ہوگئی۔ اب اس سلطنت کی زندگی محال ہوگئی مرحوم کا بیٹا سکندر عادل شاہ جس کی عمر صرف پانچ سال کی تھی، تخت نشین کیا گیا۔ اس کی کمسنی کی وجہ سے بیجاپور میں طبقہ واری کش مکش کا بازار گرم ہوگیا، اور غیر دکنی فریق اور ان کے رہنما آپس میں لڑنے لگے۔ دکنی فریق کے رہنما خواص خاں و میاں عبدالمحمد تھے اور غیر دکنی فریق کا رہنما عبدالکریم بہلول خاں تھا۔ ان کی باہمی کش مکش سے سلطنت کو ایسا نقصان پہنچا کہ اس کی تلافی نہ ہوسکی۔ بہلول خاں پٹھانوں کا (جو باہر سے آکر بیجاپور میں آباد ہوئے تھے) سرگروہ تھا یہ دن دھاڑے لوٹنے اور قتل و غارت کرنے لگا۔ حکومت اس کا سد باب نہیں کرسکتی تھی۔ میاں عبدالمحمد جس نے علی عادل شاہ کے عہد میں بارہ سال ملک کی وفادارانہ خدمت کی تھی،[1] بالآخر مایوس ہوکر حکومت سے کنارہ کش ہوگیا، اور چند روز کے بعد خواص خاں، بہلول خاں کے حربے کا شکار ہوگیا۔ اب پٹھان، بیجاپور کے ہر شریف اور امیر کو ذلیل کرنے لگے۔ باہر سے دلیر خاں جو مغل افواج کا سپہ سالار تھا، بہلول خاں کی تائید کرتا تھا، کیونکہ یہ بھی پٹھان تھا، اس لیے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے، اور بیجاپور کو سخت نقصان پہنچنے لگا۔ لیکن ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء میں شہنشاہ نے شہزادہ معظم کو ہٹاکر بہادر خاں کوکلتاش کو دکن کا گورنر بنادیا اگرچہ بہادر خاں، پٹھانوں کا ہمدرد نہ تھا، اور ایک طرح سے دکنی فریق کی تائید کرتا تھا، مگر اس کے تقرر کی غایت یہ تھی کہ بیجاپور پر پیشقدمی کرے چنانچہ بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے شہنشاہ کے بار بار احکام آتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ اس زمانے میں سیواجی سے بھی مقابلے ٹھیر گئے جس نے بیجاپور سے مل کر ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی، چنانچہ ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۶ء میں سیواجی نے بیجاپور سے اتحاد کرلیا جس کے بدلے عادل شاہی سلطنت نے اس کو ایک لاکھ ہون سالانہ اور تین لاکھ ہون یکمشت ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہادر خاں اور بیجاپور میں پُر زور جنگ شروع ہوگئی، لیکن بہادر خاں کو اکثر شکست ہوتی۔ اس دارو گیر میں قطب شاہی سلطنت خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی، اگرچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حکومت کا

---

[1] بساتین السلاطین ص ۴۴۵۔

خارجی مسلک ایسا کمزور تھا کہ اس سے دکن کو بہت نقصان پہنچا لیکن ابوالحسن قطب شاہ اور مادنا نے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی، ان دونوں نے خارجی معاملات میں وہی مسلک اختیار کیا جو پیشرو قطب شاہوں کا تھا چونکہ سکندر عادل شاہ کی کم سنی کے باعث بیجاپور کی حالت بہت سقیم ہوگئی تھی اور اس کی کمزوری سے گولکنڈے کو بھی خطرہ تھا، اس لیے اس سلطنت کو بچانا ضروری سمجھا چنانچہ جب بہادر خاں کی بیجاپور پر یورش شروع ہوئی تو گولکنڈے سے فوجی مدد کی گئی۔ ۱۰۸۸ھ ۱۶۷۷ء میں بہادر خاں کے مقابلے کے لیے مادنا خود ایک بڑی فوج لے کر آیا تھا۔[1] لیکن مشکل یہ ہوئی کہ بہلول خاں کے بے ڈھنگے اصول کی وجہ سے قطب شاہی اور عادل شاہی فوجوں میں ہم آہنگی پیدا نہ ہوسکی۔ اس سے بہادر خاں نے بہت فائدہ اٹھایا، اور مادنا کو غلط ترغیب دے کر اس کو بیجاپور کے اتحاد سے علحدہ کردیا! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مادنا بیجاپور کو نہتا چھوڑ کر گولکنڈہ واپس چلا آیا جس سے عادل شاہی حکومت کو سخت پریشانی ہوئی اور بہادر خاں نہایت آسانی کے ساتھ نل درگ۔ اکل کوٹ اور گلبرگے پر قابض ہوگیا۔ مادنا کا یہ طرز عمل قطب شاہی مسلک کے بالکل منافی تھا۔[2]

لیکن شہنشاہ بہادر خاں کی پچھلی ہزیمتوں سے ناراض تھے اور اس پر طرّہ یہ ہوا کہ دلیر خاں نے جو بہادر خاں کا مخالف تھا، اپنے حریف کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنے شروع کیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰۸۸ھ ۱۶۷۷ء میں بہادر خاں کو دکن کی گورنری سے معزول کردیا گیا، اور اس کی جگہ خود دلیر خاں مامور ہوا اس نے اپنی فوجوں کو ایسا پھیلایا کہ یہ گلبرگے سے ملکھیڑ تک پہنچ گئیں، جو قطب شاہی سرحد تھی، اور اس پیشقدمی سے اس کے حوصلے ایسے بڑھ گئے کہ اس نے گولکنڈے پر حملہ کرنے کی ٹھان لی چنانچہ شہنشاہ سے درخواست کی کہ "اگر ایک بڑی فوج سے میری مدد کی جائے تو میں گولکنڈہ فتح کرلیتا ہوں"! شہنشاہ نے یہ درخواست منظور کرلی، اس درخواست میں بہلول خاں بھی شریک تھا۔ اب قطب شاہی سلطنت کو مدافعت کا انتظام کرنا تھا۔ ابوالحسن قطب شاہ نے سرحد کو مضبوط کرکے محمد ابراہیم سرلشکر کو ملکھیڑ روانہ کیا، اور ضروری بندوبست کردیے۔

---

[1] مادنا نے پندرہ بیس ہزار کی ایک جرّار فوج تیار کی تھی اور اس کو اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔

[2] بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مادنا نے رشوت لی تھی جادو ناتھ سرکار جلد ۴ ص ۴۴۱۔

اس زمانے میں مغل فوجیں گلبرگے کا محاصرہ کر رہی تھیں قطب شاہی فوجوں کو پہلے شہنشاہ کا فرمان ملا کہ وہ کافروں کی مدد نہ کرے، اس کے بعد دلیر خاں نے ابوالحسن کو دھمکی دی کہ "سیواجی سے اتحاد اور شیخ منہاج کو پناہ دینے کی پاداش میں ایک کروڑ روپیے اور دس ہزار گھوڑے تاوان ادا کرے ورنہ حملہ کیا جائیگا"[1] اور اس کے ساتھ ملکھیڑ کے قریب بہلول خاں و دلیر خاں کی فوجیں جمع ہوگئیں۔ ابوالحسن جنگ کو ٹالنے کے لیے پانچ لاکھ روپیے تاوان دینے کے لیے تیار ہوگیا، لیکن بہلول خاں اور دلیر خاں جنگ پر تلے ہوئے تھے، انھوں نے ملکھیڑ پر حملہ ہی کردیا، ان کے مقابلے کے لیے قطب شاہی فوج بھی تیار تھی چنانچہ ایک گھمسان کا معرکہ ہوگیا جو مغلوں کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا۔ اس معرکے میں مغلوں کے سات سو سپاہی اور سات ہاتھی ہلاک ہوئے اور چھ سات افسر مارے گئے اور بے شمار سپاہی مجروح ہوئے۔ گولکنڈے سے شیخ منہاج۔ رستم راؤ، اور سنجر خاں کے تحت ایک بڑی کمک آگئی، دو مہینے تک سخت کش مکش ہوتی رہی، اور ہر موقعہ پر مغلوں کا بہت نقصان ہوا ذرائع رسل و رسائل منقطع ہوگئے اور غلّہ و پانی بھی نہیں ملا۔ یہ اس مصیبت سے گلبرگہ واپس ہوئے کہ بیس میل کی مسافت بارہ دن میں طے کی اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔

اس گری ہوئی حالت میں بھی بیجاپور کے ابھی بہت سے ہمدرد باقی تھے۔ سدی جوہر صلابت خاں کا داماد مسعود خاں، اس سلطنت کا پرانا خدمتگذار تھا بہلول خاں کی زیادتی اور بیجاپور کی گری ہوئی حالت سے متاثر ہوکر مسعود خاں نے ابوالحسن قطب شاہ سے درخواست کی کہ وہ بیجاپور کے معاملات میں دخل دے کر اس سلطنت کی دستگیری کرے۔ ابوالحسن نے اس درد بھری آواز پر لبیک کہا۔ اب چارۂ کار یہ تھا کہ بہلول خاں کو جو تمام فتنہ و فساد کا منبع تھا بیجاپور سے ہٹا کر مسعود خاں جیسے وفادار آدمی کو پیشوا بنائے یعنی یہ طے ہوا کہ "ما وام کہ زمام این دولت خانہ در قبضۂ نمک پروردۂ قدیم و دولت خواہ دیرین مسعود خان است سپردہ نشود اصلاح این دولت خانہ صورت پذیر

---

[1] ۔ ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء میں گولکنڈے نے سیواجی سے اتحاد کرلیا تھا جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ شیخ منہاج بیجاپور کا نوکر تھا، جو حکومت سے بے وفائی کرکے مغلوں سے مل گیا تھا، اور وہاں سے گولکنڈے کا ملازم ہوگیا۔

نہ خواہد گردید[1] اس لیے ابوالحسن نے بہلول خاں کو اپنے پاس بلایا تاکہ اس کو نمک کا پاس دلا کر نصیحت کرے۔ لیکن بہلول خاں ملکھیڑ کی لڑائی کے بعد ایسا بیمار ہوگیا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ گولکنڈہ نہیں جا سکا، مگر اپنی طرف سے جمشید خاں کو بھیج دیا۔ ابوالحسن قطب شاہ نے اس کو بیجاپور کی حالت زار کا نقشہ کھینچ کر شرم دلائی اور متنبہ کیا کہ اگر یہی حالت رہی تو کل کو مغل بیجاپور پر قابض ہو جائیں گے۔ ابوالحسن کی اس تقریر[2] سے جمشید بہت متاثر ہوا اور جب وہ بیجاپور واپس آیا تو

---

[1] بساتین السلاطین ص ۵۱۴۔

[2] ابوالحسن قطب شاہ نے بہلول خاں کے نمایندے جمشید خاں کو ان الفاظ میں نصیحت کی تھی جن سے اس کی بیدار مغزی اور وسعت نظر معلوم ہوتی ہے:—

"فرمودہ کہ فدویان دولت خواہ و نمک پروردگان فدویت انتباہ را لازم است کہ نیکنامی دنیا و سرخ روئی عقبیٰ را در ادائے لوازم جان سپاری و تقدیم مراسم جاں نثاری منحصر دانستہ ہمگی ہمت مصروف آن دارند کہ دولت خانہ ولی نعمت خود با رونق و بجائے خویش بحال و قرار ماند تعصب و تشدد برادری و نفاق و اختلاف خانگی کہ باہم داشتہ باشند یکسو و برطرف ساختہ جہد کل الجہد در آن مبذول دارند کہ غنیم بدخواہان بیرونی دست تسلط بر آن نیافتہ خائب و خاسر مانند و الا اگر سود و بہبود خود را منظور داشتہ از عناد و نفاق خانگی در نگذرند و تعصب برادری و تباغض ہم چشمی بر قرار داشتہ در ستیز و جدال یکدیگر کوشند ظاہر است کہ اعدائے خصوم کہ در کمین فرصت نشستہ اند بہ یکبارگی از طرف ہجوم آوردہ متصرف ملک و سلطنت شوند۔ آنگاہ جز حسرت و ندامت بدست ہیچ نخواہد ماند و زبان طعن و تشنیع خاص و عام بہر کدام از نمک خواران دولت عادل شاہی تا ابد الدہر دراز خواہد گردید غرض این

"حُسن ارشاد و رہنمائی ابوالحسن قطب شاہ" بہلول خاں پیشوائی سے دست بردار ہوگیا، اور سدی مسعود پیشوا ہوگیا۔ بہلول خاں اور مسعود خاں میں یہ شرطیں طے ہوئیں کہ افغانوں کی چڑھی ہوئی تنخواہیں ادا کی جائیں، اور چونکہ اس کے لیے بیجاپور میں روپیہ نہ تھا، اسکی ادائی کے لیے قطب شاہ نے چھ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ افغان سپاہی فوج سے برخاست کردیے جائیں، اور تنخواہ اسی شرط سے دی جائے کہ وہ بیجاپور سے باہر چلے جائیں۔ تیسرے بہلول خاں بیجاپور سے کنارہ کش ہوکر اپنی جاگیر میں حکومت اختیار کرے۔ چوتھے حکومت کی رہنمائی کے لیے گولکنڈے کا ایک حاجب بیجاپور میں مقرر کیا جائیگا جو ہر انتظامی امور کی نگرانی کرے گا، اور خارجی مسلک ایسا اختیار کیا جائیگا جو دونوں سلطنتوں کے مفاد کے عین مطابق ہو۔ پانچویں شرط یہ تھی کہ مغلوں سے ایسا عہد نامہ نہ کیا جائے جس سے اس عہد نامے کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ گولکنڈے نے بیجاپور کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے سرلی۔ فریقین کے اس پر دستخط ہوگئے اور بادشاہ نے چھ لاکھ روپیے کا تمسک لکھ دیا۔

تمہید و مقصود ازین تطویل آن است کہ از وقوع نزاع و خلاف شما دولت خواہان عادل شاہی تزلزل در ارکان سلطنت واقع گشتہ بلکہ آن کاخ از بنیاد مشرف براہنہدام گردیدہ۔ اینچنانکہ بیک صدمہ از پا درآید۔ اکنون صواب و اصوب آن است کہ شما فوج خود را رخصت دادہ خود معزول و از چندے درگوشہ کشیدہ دست از تصرف و اختیار برداشتہ کار ملکی و مالی و مہامی بلدہ بیجاپور بہ سدی مسعود خاں واگزارانند و در تائید و بیعت او کوشیدہ بہ اتفاق صبا و قیام سلطنت نمانہ مخدوم حفظ بہ ظہور آرند۔ این معنی ہر آئینہ موجب استحسان و محمدت عند الخلائق و سبب بہبودی و وقار شما و دولت خواہان کافہ ناس خواہد گردید۔" بساتین السلاطین۔

ص ۴۵۳-۴۵۴

جب معاہدے کی تکمیل ہو چکی تو محمد ابراہیم سرلشکر چار ہزار سوار کے ساتھ سدی مسعود کو بیجاپور لایا، اور پیشوا بنا دیا اس کے بعد مسعود اور سکندر نے اس عہدنامے کی توثیق کر دی، اور حاجب کی خدمت انجام دینے کے لیے گولکنڈے سے اکنا بھیجا گیا تھا یہ عہدنامہ اور قطب شاہی تائید بالکل مناسب حال تھی اور مفید ہوتی لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ابھی اس معاہدے کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی کہ خلاف ورزی ہونے لگی جب مسعود خاں بیجاپور آ رہا تھا راستے میں گلبرگے کے پاس دلیرخاں سے ایک اور معاہدہ کر لیا جو اس قطب شاہی معاہدے کے منافی تھا۔ بات یہ تھی کہ جب قطب شاہی اتحاد کا حال معلوم ہوا تو دلیرخاں بہت پریشان ہو گیا کیونکہ اس طریقے سے مغلوں کا منصوبہ خطرے میں پڑ گیا تھا اس لیے نیا معاہدہ یہ ہوا کہ مسعود خاں سیواجی کے خلاف مغلوں کی مدد کرے اور سکندر عادل شاہ کی بہن بادشاہ بی بی کی شادی کسی مغل شہزادے سے کر دے۔ اس عہد شکنی سے دکن کے معاملے کو بہت نقصان پہنچا، اس کی وجہ سے ابوالحسن نے چھ لاکھ روپیے نہیں دیے۔ افغانوں نے پھر شور مچایا، اور بیجاپور میں شرفا کی زندگی محال ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ گھر میں مسعود خاں کا وزارتی اقتدار جم سکا نہ باہر، اور حالت روز بہ روز خراب ہونے لگی۔ ناچار ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں اکنا واپس بلا لیا گیا لیکن اس سے گولکنڈے اور بیجاپور کے تعلقات منقطع نہیں ہوئے بلکہ اس کے بعد بھی ابوالحسن نے بیجاپور کی مدد کی چنانچہ جس وقت شہنشاہ نے بیجاپور پر حملہ کر دیا، اور بہادر خاں کوکلتاش کو اکل کوٹ پر متعین کیا کہ بیجاپور اور گولکنڈے پر نگرانی رکھے تو سکندر نے ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء میں گولکنڈے سے مدد مانگی اور بیجاپور کے حاجب نے یہاں مادنا کو سمجھایا کہ اس وقت پرانے عہدنامے کی پابجائی بہت ضروری ہے تو ابوالحسن نے ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء میں سکندر کی مدد کے لیے فوج بھیجنے کا ارادہ کر لیا، حالانکہ شہنشاہ نے یہ دھمکی دی تھی کہ بیجاپور کی کوئی مدد نہ ہونی چاہیے۔ ۱۴ر اگست کو انباجی راؤ کے تحت ایک فوج روانہ کر دی گئی لیکن مشکل یہ تھی کہ شہنشاہ نے اس کی روک تھام کے لیے پہلے سے بہرہ مند خاں کو گولکنڈے کی سرحد پر متعین کر دیا تھا؛ اس لیے اس فوج کو منزل مقصود پر پہنچنا بہت دشوار ہو گیا اس کے بعد ابوالحسن قطب شاہ نے اپنے سفیروں کے نام جو شہنشاہ کے پاس تھے، ایک خط لکھا جس میں محمد ابراہیم سرلشکر کی سرکردگی میں چالیس ہزار کی ایک جرار فوج بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا یہ خط پکڑا گیا، اور شہنشاہ کے پاس پیش ہوا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہ عالم کے تحت

ملکھیڑ پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج بھیج دی گئی اور بیجاپور سے فارغ ہونے کے بعد تمام شہنشاہی طاقت گولکنڈے کی تباہی کے لیے آ گئی۔

مادنا کی سیاست میں جو تمام ملک پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا اثر دکن کے دُور دراز گوشوں میں محسوس ہوتا تھا بہت سے تاریک پہلو بھی تھے! اول تو مادنا نے اپنی ملک پرستی کے زعم میں حکومت کے بیرونی عنصر کو خارج کر دیا اور اس کے خلاف ایک ہیجان برپا ہونا ضروری تھا۔ بات یہ ہے کہ جب سے قطب شاہی سلطنت قایم ہوئی تھی ہزار ہا نو وارد تُرک مغل وایرانی ملک میں آباد ہوئے اور گولکنڈے کی سرکار سے فیض پاتے تھے۔ یوں تو یہ لوگ یہاں تجارت کی غرض سے آتے تھے کیونکہ گولکنڈہ تجارت کا مرکز تھا، تاہم ان میں اکثر اپنی قابلیت کے زور سے بلند خدمات پر بھی فائز ہوئے، لیکن اہلِ ملک ان کی ترقی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے! ور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں مخالفانہ جذبہ ہر وقت موجود تھا، اور جب کبھی ملک میں انقلاب ہوا، ان نوواردوں کو سب سے پہلے اپنی جان و مال کا ڈر ہوتا تھا، اور حکومت کو ان کی خاص طور پر حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ مادنا نے اس جذبے کی سب سے زیادہ نمایندگی کی۔ دیوان ہونے کے بعد سب سے پہلے اس نے تمام اجنبیوں کو حکومت سے خارج کر دیا، اور ان کی جگہ اہلِ ملک کو مامور کیا چنانچہ ایک مورخ کے الفاظ میں "مردم ہمدیار خود دکنیاں را بنواختہ مغل و غریب زاد ہارا برانداختند"[1] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر اس ملک پرستی کے جذبے میں کچھ فرقہ پرستی کا رنگ ضرور پیدا ہو گیا جو مادنا، اور اس کے خاندان کے لیے مہلک ثابت ہوا کیونکہ اس اصلاحی دست برد سے جبکہ پرانے لوگ یک لخت حکومت سے خارج کر دیے گئے تو ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا اب جن نئے لوگوں کو مادنا نے مامور کیا وہ اکثر تلنگے تھے، نیز مرکزی حکومت کے جتنے بڑے عہدہ دار تھے ان میں اکثر مادنا کے خاندان کے لوگ تھے۔ چنانچہ مادنا کا بڑا بھائی اکنا، اس کا پیشکار ہو گیا، اور چند سال کے بعد اس کو مجموعہ دار کا عہدہ دیا گیا، اس کا دوسرا بھائی آسنا، ورنگل کا عامل تھا، اور اس کا بھانجا ینکنا جس کو رستم راؤ کا خطاب ملا تھا مختلف خدمتوں پر فائز ہوا ر

---

[1] حدیقۃ العالم، مقالۂ اول ص ۳۶۸۔

یہ کبھی کرناٹک کا صوبہ دار رہا، اور کبھی فوج کا سرلشکر مقرر ہوا۔ اسی طریقے سے مرکزی حکومت کی باگ تمام تر انھیں لوگوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کے علاوہ کرناٹک میں جہاں لنگپا اور رینگنا کام کرتے تھے پوری طور پر ان کے زیر اثر تھا سوائے محمد ابراہیم کے کوئی مسلمان مرکزی حکومت کے بڑے عہدے پر فائز نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد ابراہیم جس کو مادنا کی مہربانی سے خلیل اللہ خاں اور پلنگ حملہ خطاب دیا گیا تھا قطب شاہی افواج کا سرلشکر مقرر ہوا تھا، اور ایک سال اس کو کرناٹک کا صوبہ داری بھی دی گئی مگر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترقی کے لیے محمد ابراہیم نے مادنا، اور اس کے خاندان کی بے حد خوشامد کی[1] اور ایک روایت صحیح سمجھی جائے تو ابراہیم نے اس کے لیے ایک لاکھ دس ہزار ہون رشوت دی تھی۔[2] غالباً مادنا نے اس کو نااہل اور غیر ملکی ہونے کے باوجود اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی چنانچہ اس ترقی کے لیے ابراہیم مادنا کا اس قدر احسان مند تھا کہ یہ شعر ؎

زالتفات بادشاہ و پنڈت روشن رواں　　گشت ابراہیم سرلشکر خلیل اللہ خاں[3]

اس نے اپنی انگوٹھی کے نگینے پر کندہ کروایا تھا جس سے اس کی نااہلی اور خوشامد معلوم ہوتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ملک کے عام مسلمانوں کے ساتھ مادنا کا اخلاق، اور سیاسی برتاؤ کیا تھا تو اس خصوص میں اس قدر مخالف مواد ہے کہ اس کے متعلق صحیح رائے قایم کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر تاریخ کہتی ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ مادنا کا برتاؤ سخت جابرانہ تھا، اور اس میں بہت تعصب پایا جاتا تھا مسلمانوں کی ذلت کی جاتی تھی اور ان کی شکایتوں کی دادخواہی نہیں ہوتی تھی۔[4] بعض ایک مورخ کے الفاظ میں کہ: "اسلام و اسلامیان را وقعے نمی گذاشت۔ مساجد بے رونق بودند

---

[1] حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۳۶۸　[2] تاریخ اورنگ زیب، جادو ناتھ سرکار جلد ۴ ص ۳۳۴

[3] مآثر عالمگیری ص ۲۶۷۔

[4] یہ واقعہ ہر مورخ نے لکھا ہے کہ ایک روز اداکسی مندر کی جاترا کے لیے گیا چونکہ وہ پیشوا تھا اس لیے اس کے ساتھ ایک فوج گئی جس میں سادات و شرفا بھی تھے۔ ان لوگوں کی مادنا نے ان الفاظ سے سخت ملامت کی کہ تمھارے بزرگوں نے

کنالس آباد۔"[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بیانات بہت کچھ مبالغہ پر مبنی ہیں، چونکہ مادنا اور اس کی حکومت کا مسلک مغل شہنشاہت کے سنگ راہ تھا اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مغل مورخوں نے ابوالحسن اور اس کے وزیر مادنا کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالا۔[2] سب سے پہلے مغل شہنشاہت کو یہ تمام مواد سید مظفر اور اس کے بیٹے سید ہاشم کی وجہ سے ملا جو گولکنڈے سے بھاگ کر

ہمارے بت توڑتے تھے اور اب میں اس پاداش میں تم کو ذلیل کرتا ہوں"۔ یہ سن کر سیدوں کے آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ (حدیقۃ العالم، مقالہ اول ص ۳۶۸۔ خافی خاں جلد دوم۔ خافی خاں نے ایک واقعہ اور یہ لکھا ہے کہ مادنا نے غبن کا الزام لگا کر ایک سید کے ہاتھ کٹوا دیے (منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۱۱۔ منوچی نے ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ "ایک روز ندی کے کنارے ایک ایرانی اپنا منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ کوئی ہندو آیا اور اس کے قریب کھڑے ہو کر اس بے پروائی سے اپنے کپڑے دھونے لگا کہ پانی کے چھینٹے مسلمان (ایرانی) پر پڑنے لگے، اپنی صفائی کی خاطر اس نے شرافت کے ساتھ اس ہندو سے کہا کہ تم دور ہٹ کر اپنے کپڑے دھو، اس پر وہ توجہ کرنے کی بجائے ایرانی کو گالی دی اور مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ آخر الذکر بہت برافروختہ ہوا، اور اس کو ایک تھپڑ رسید کی، اس پر ایک شور ہو گیا اور بہت سے ہندو جمع ہوگئے، ان سب نے بےچارے مسلمان کی مرمت کی اور اس کو گرفتار کر کے مادنا کے پاس لے گئے، اس نے فوراً یہ حکم دیا کہ اس ایرانی کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں، چنانچہ اس کی تعمیل ہوگئی۔ بالآخر اس مظلوم نے دیکھا کہ اس کی کوئی داد نہیں ہوتی کیونکہ حکومت اور عدالتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ تھیں اس لیے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو تبل میں ٹکھا کر اورنگ زیب کے دربار میں پہنچ گیا شہنشاہ نے اس کو دلاسا دیا اور روپیہ سے مدد کر کے وعدہ کیا کہ اس کا انتقام لیا جائے گا (منوچی جلد سوم ص ۱۳۱۔۱۳۲۔

[1] ماثر عالمگیری ص ۲۸۵۔

[2] منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۲۸۔

مغل سلطنت سے جا ملے تھے! ان سے کسی انصاف کی توقع رکھنا بے معنی ہے مان کہ یہ الفاظ[1] سے جو ان تاریخوں میں ظاہر کیے گئے ہیں صحیح رائے قایم کرنا بہت مشکل ہے۔ مادنا کی اصلاح کے باعث بہت سے مسلمان خدمتوں سے علحدہ ہوکر مغل ملازمت میں شریک ہوگئے اور ابو الحسن و مادنا کے خلاف مغل حکومت کو بھڑکایا کرتے تھے تاہم اس کے باوجود بعض حقیقتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ آخر باہر کے سیاحوں نے بھی جو غیر جانب دارانہ حیثیت رکھتے تھے مادنا کی کوئی تعریف نہیں کی بلکہ مذمت کی[2]۔ اس کے علاوہ مادنا اور اس کی حکومت کے خلاف ملک میں اس قدر غیظ و غضب جمع ہوگیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ کسی قطب شاہی وزیر کے خلاف کبھی اس قدر ہیجان برپا نہیں ہوا۔ مغل تو اس کے دشمن تھے ہی لیکن گولکنڈے کے رہنے والے بھی اس کے دوست نہ تھے اور منوچی کے الفاظ میں مسلمان تو اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی محل کی خواتین جن کو سیاست سے بہت دور کا واسطہ ہوتا ہے اس کی سخت دشمن تھیں اور یہ اس قدر

---

[1] ۔ چنانچہ شہنشاہ نے کافر۔ فاجر ظالم (منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۲۸) اور محمد ساقی نے "ہنود مطرود" (عالمگیر نامہ ص ۲۸۵) خافی خاں نے "ہر دو برادر کافر شدید العداوت کا بد فرجام" لکھا ہے (منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۹۲ ۔ اور جلد سوم ص ۱۷۳)۔ حدیقۃ العالم کا مولف "ہر دو برادر برہمن شوم ملوم" ص ۳۶۸ ۔ اور کرم دھاری لال مولف تاریخ ظفرہ کہتا ہے کہ:۔ "مادنا برہمن تلنگہ در رفتنہ و ابلیس خوی بے مثال بود۔" ص ۳۵۔

[2] ۔ منوچی نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس سے مادنا کی فرقہ پرستی معلوم ہوتی ہے۔ جلد سوم ص ۱۳۱۔ مدراس کے انگریز اپنے وثایق میں یہ لکھتے ہیں کہ:۔ "مادنا بالکل مقتدر ہے اور لوگوں کو مجبور کرکے روپیہ وصول کرتا ہے۔" کرناٹک کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:۔ "حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو دھوکا، فریب اور جبر ستانی سے کام لیتے ہیں۔ معاہدہ، قول وغیرہ کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔" یہ صحیح ہے کہ مادنا کی سخت گیری کی وجہ سے انگریزوں کو بہت شکایت تھی۔

زبردست ہیجان تھا کہ جب ان مخالفوں کا بس چلا تو نہ صرف ان لوگوں نے مادنّا کو بے رحمی سے قتل کیا بلکہ اس کے تمام خاندان کو تباہ کردیا۔ یہ چیزیں بہت معنی خیز ہیں۔ بات یہ ہے کہ مادنّا کا طرز حکومت ایسا نہیں تھا کہ ملک میں اس کی طرف سے خوشنودی پیدا ہوتی۔ مگر ان طبقے کو اس سے ناراض ہونے کے کئی اسباب تھے۔ غالباً اس کا اصلاحی حربہ مسلمانوں پر اُلٹا پڑا۔ جب مادنّا کے خارجی مسلک پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ملک کے لیے مفید نہ تھا، اسی وجہ سے یہ کہا جاتا تھا کہ "سختی وظلم زیادہ بر مسلمانان می گذشت"۔ سیواجی اور اس کے بیٹے سنبھاجی سے جو اتحاد کیا گیا تھا وہ سلطنت کے مفاد کے بالکل منافی ثابت ہوا۔ ان مرہٹہ حکمرانوں نے کبھی اپنے قول کا پاس نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بیجاپور کے بچاؤ کے لیے جو تجویز ہوئی تھی وہ ایسے اٹے وقت ادھوری چھوڑ دی گئی کہ غریب سلطنت کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، اور اس کا کوئی پہلو بھی حق بہ جانب نہیں تھا۔ بعض موقعوں پر مادنّا نے اپنے دوست، دشمن دونوں سے رشوت لینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس نے مغرب میں بہادر خاں کوکلتاش سے اور مشرق میں انگریز کمپنی سے روپیہ وصول کیے، اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بادشاہ نے مادنّا پر حد سے زیادہ اعتماد کر رکھا تھا۔

انیسواں باب

جنگ ملکھیڑ

شہنشاہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد آیندہ بیس [۲۰] سال تک دکن کی رفتار سیاست میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں ہوا کیونکہ آخر دکن کا سیاسی نقشہ وہی تھا۔ اس ملک کی نئی اور پرانی جو طاقتیں مغل شہنشاہت کے مقابلے میں کشاکش زیست میں مبتلا تھیں ابھی فنا نہیں ہوئی تھیں مرہٹے تو آئے دن ترقی کر گئے لیکن بیجاپور اور گولکنڈے کی رُو بہ زوال سلطنتوں نے بھی اپنی ہستی قایم رکھی۔ بیجاپور نے تمام مغل حملہ آوروں کو جن میں جے سنگھ۔ دلیر خاں اور بہادر خاں کوکلتاش تھے ہرا دیا۔ گولکنڈے نے دلیر خاں اور بہلول خاں کے متحدہ حملے کو جو ملکھیڑ پر ہوا تھا رد کر دیا لیکن ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں جب سیواجی کا انتقال ہوا تو پھر دکن کے حالات سُرعت سے بدلنے لگے، کیونکہ اس کا بیٹا سنبھاجی جو باپ کی جگہ گدی نشیں ہوا تھا سخت فتنہ انگیز ثابت ہوا۔ یوں تو سیواجی کی تاخت و تاراج بھی کچھ کم تلاطم خیز نہ تھی تاہم اس میں عزت و ناموس کا کچھ پاس و لحاظ ضرور تھا مگر سنبھاجی نے اپنی لوٹ گھسوٹ میں تہذیب کی تمام تعینات توڑ دیے اور ایسا اودھم مچایا کہ زمانہ چیخنے لگا۔ چنانچہ گدی نشیں ہوتے ہی اس نے دکن کے چاروں طرف دست درازیاں شروع کر دیں اور بالآخر ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں برہان پور پر، جو اس زمانے میں دکن کی تہذیب کا بڑا مرکز تھا، دھاوا بول دیا، اور ایسی قتل و غارت کی کہ اہل برہان پور کانپنے لگے۔ بہادر خاں کی کم زوری کے باعث جو اس زمانے میں دکن کا گورنر تھا ان علاقوں کو وقت پر امداد نہ ہو سکی۔ ناچار ان لوگوں نے عاجز آ کر جمعے کی نماز چھوڑ دی اور شہنشاہ کی خدمت میں محضر پیش کیا کہ "جب تک دکن میں امن قایم نہیں کیا جائیگا ہم جمعے کی نماز نہیں پڑھینگے، کیونکہ یہ دار الحرب ہے۔" اس دردانگیز مطالبے پر شہنشاہ نے کہا: "ماخود بہ دولت برائے فتنۂ کفار دکن متوجہ آن طرف

میں شوئیمؒ" دوسری وقت یہ تھی کہ اسی زمانے میں شہنشاہ کا چھوٹا بیٹا شہزادہ اکبر راجپوتوں کے اغوا سے بغاوت کر بیٹھا، اور راجپوتانے میں اپنے باپ کے مقابلے میں ایک مخالفانہ محاذ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن جب یہاں اس کے قدم نہ جم سکے تو راجپوتانے سے بھاگ کر دکن میں پناہ لی اور سنبھاجی سے اتحاد کر لیا۔ شہنشاہت کے لیے ایک نیا خطرہ یہ تھا کہ اس جدید بغاوت سے مرہٹوں اور دوسری دکنی طاقتوں کو غیر معمولی تقویت ہو جاتی اور دکن مغل سلطنت کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ اس لیے اورنگ زیب نے شاہجہاں کی طرح بذات خود دکن کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا اور چونکہ اس زمانے میں راجپوتانے کی بغاوت فرو ہو چکی تھی اس لیے اس کو دکن میں قیام کرنا ممکن تھا۔

۱۰۹۳ھ / ۱۶۸۲ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ ہندوستان کی تمام فوجی طاقت سمٹ کر دکن آگئی۔ اس کا اولین مقصد غالباً یہ تھا کہ شہزادہ اکبر کی سرکوبی کرے اور دکن کو مرہٹوں کی شورش سے نجات دلائے، کیونکہ مرہٹوں کے قتل و غارت کی وجہ سے دکن میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی ظاہر ہے کہ ہر ایسی بے چینی اور بدامنی کا سدباب کرنا ہر مہذب حکومت کا فرض منصبی ہے مغل حکومت بھی اس کو اپنا فرض سمجھتی تھی چنانچہ اکبر اعظم نے جہاں بھی حملے کیے ان میں ہمیشہ قیام امن کا پاکیزہ مقصد بھی مضمر تھا۔ اور یہی چیز اس وقت اورنگ زیب کے بھی پیش نظر تھی۔ لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مغل شہنشاہ تمام ہندوستان کی شیرازہ بندی کر کے اپنی ایک اجتماعی قوت پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کو دکن کی تمام طاقتوں کا راستے سے ہٹانا ضروری تھا، کیونکہ وہ دکن جیسے بڑے خطۂ ارض کو جو ہندوستان سے علٰحدہ نہیں ہے اپنی مرکزیت سے جدا نہیں رکھ سکتے تھے۔ شمالی ہند کی ہر بڑی طاقت خواہ وہ قدیم ہو یا وسطی جنوب پر ضرور اثر انداز ہوئی اور جب کبھی موقعہ ملا جنوب کو شامل کر کے ایک عظیم تر ہندوستان بنانے کی کوشش کی، گو یہ کوششیں کبھی بار آور نہ ہوئیں۔ مغلوں کے لیے دکن کا مسئلہ وسط ایشیا کے ناگوار اثرات کی وجہ سے زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا، یعنی ایران کے صفوی، اور مغل سلاطین میں غایت درجے کی رقابت تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو کمزور دیکھنا چاہتے تھے، اس کے لیے

لہ۔ خافی خاں جلد دوم ص ۲۷۵۔

صفویوں نے ادھر شمال میں قندھار پر بارہا زدکی اور جنوب میں بیجاپور و گولکنڈے کی شیعہ سلطنتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ یہ سلطنتیں بھی اپنے بچاؤ کیلئے صفویوں کا دامن پکڑے ہوئے تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مغل اقتدار پر ایک کھلی زد پڑتی تھی۔ ان حالات کے تحت مغلوں کو دکن کے لیے ایک مستقل مسلک قرار دینا تھا جو اکبر کے عہد میں کیا گیا۔ اکبر اعظم نے دکن سے متعلق ایک بڑا منصوبہ بنا دیا جس کی اس کے جانشینوں نے پابندی و پیروی کی۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے اس دیرینہ منصوبہ کی تکمیل کی یعنی تمام دکن کو مسخر کرکے ایک ہمہ گیر وسیع شہنشاہیت قایم کردی لیکن آیندہ واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے جانشینوں نے اس کے مسلک کی شاید اندھا دھند پیروی کی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی شیرازہ بندی اکبر کا بہت بڑا منصوبہ تھا لیکن اس کی تکمیل ایک ایسے طریقے سے بھی ہو سکتی تھی جو شہنشاہیت کے لیے زیادہ مفید ہوتا۔

شہنشاہ رمضان شریف کے بعد ۱۰۹۲ھ میں برہان پور آئے اور تین چار مہینے یہاں قیام کرکے اورنگ آباد پہنچ گئے اس کی وضاحت مشکل ہے کہ آیا شہنشاہ نے پہلے ہی وہلے میں مرہٹوں کے استیصال کے ساتھ گولکنڈہ اور بیجاپور کا خاتمہ بھی ضروری سمجھا تھا، اور اس کا تہیہ کر لیا تھا۔ قرائن یہ ہیں کہ غالباً شروع ہی سے شہنشاہ کے ذہن میں یہ منصوبہ تھا کہ دکن کی رہی سہی مسلمان سلطنتوں کا خاتمہ کر دینا چاہیئے کیونکہ دکن کے ناظم کی حیثیت میں جب اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور پر حملہ کیا تھا تو اس وقت اس کا ارادہ یہی تھا، اور اگر اس زمانے کے مدبر وہ واقعات مانع نہ ہوتے تو آج سے چالیس سال پہلے ہی ان سلطنتوں کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اس وقت واقعات کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ آباد آتے ہی شہنشاہ نے سب سے پہلے شہزادہ اکبر کے خلاف فوج کشیاں کیں اور جب یہ ناکام ہوگئیں اور شہزادہ اکبر ہاتھ سے نکل گیا تو اس کے بعد ۱۰۹۳ھ میں مرہٹوں کے حلقوں پر وار کئے گئے چنانچہ شہزادہ اعظم کو قلعہ سالہیر اور شمالی کونکن پر حملہ کرنے کے لئے اور شہزادہ معظم کو رام درہ پر حملہ کرنے کیلئے روانہ کیا۔ لیکن یہ بے سود ہوا یہ دونوں مہمیں ناکام ہوئیں اور مغل فوجوں کا بہت نقصان ہوا مجبوراً ان فوجوں کو واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد چھوٹی موٹی لڑائیوں کے سوا ایک سال تک مرہٹوں کے ساتھ ہوتی رہیں کوئی بڑا معرکہ نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں شہنشاہ نے پچھلی ناکامیوں پر

غور کر کے آیندہ کے لیے ایک پر زور لائحہ عمل مرتب کرنے کی کوشش کی اب تک اس کے لائحہ عمل میں دکنی سلطنتوں کا کوئی عنصر نہ تھا بلکہ دکن آنے کے بعد شہنشاہ نے مرہٹوں کے استیصال میں دکن کی اسلامی سلطنتوں کو بھی دعوت دی تھی کہ وہ مرہٹوں کے خلاف مغل سلطنت کا ساتھ دیں[1] چنانچہ بیجاپور کو اس مطلب کا شاہی فرمان وصول ہوا تھا مگر دو سال کے وقفے کے بعد شہنشاہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سلطنتیں اپنے بچاؤ کے لیے مرہٹوں سے اتحاد کرتی ہیں اور ان کی ایسی مدد کرتی ہیں جیسے نظام شاہی سلطنت کی مدد کرتی تھیں ظاہر ہے کہ اس طریقے سے مرہٹوں کا قلع قمع ناممکن تھا کیونکہ بیجاپور و گولکنڈے سے سنبھاجی کو روپیہ اور فوج سے مدد دی جاتی تھی اس لیے شہنشاہ نے سب سے پہلے بیجاپور او گولکنڈے کی سلطنتوں کا خاتمہ کرنا ضروری سمجھا چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مرہٹوں کا تعاقب یک لخت بند کر دیا اور جو فوجیں مرہٹوں کے خلاف مصروف تھیں ان کو سمیٹ کر اسلامی سلطنتوں کی بیخ کنی میں لگا دیں۔ ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۴ء میں ایک فوج شہزادہ اعظم کے تحت بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دی۔

ان محرکات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا مغل سلطنت کو قطب شاہی حکومت کے ساتھ معاشی اغراض بھی وابستہ تھے اور شکایتیں بھی تھیں۔ گولکنڈہ ایک مالدار سلطنت تھی جس سے مغل شہنشاہوں کو مقررہ پیش کش کے علاوہ بے حساب سونا چاندی اور جواہر ملتے تھے۔ محمد سعید میر جملہ نے تمام راز سربستہ فاش کر کے مغل شہنشاہوں کو بہت حریص و لالچی بنایا تھا۔ شاہجہان نے یہاں سے کھلم کھلا جواہر اور ہاتھی مانگے جن کی مجبوراً سربراہی کرنی پڑی۔ پرانے دکھڑے کو چھوڑ کر نئی شکایتیں یہ پیدا ہو گئی تھیں کہ ابوالحسن نے ایک طرف "ہر دو کافر شدہ مید العداوت" اکنا و مادنا کو ملک میں مقتدر بنا رکھا تھا جن کی وجہ سے "سختی و ظلم زیادہ بر مسلمانان می گذشت"۔ دوسرے "سنبھائے جہنمی دارالحربی" کو امداد دی جاتی تھی[2] چنانچہ جب ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۴ء میں بیجاپور کا محاصرہ ہو گیا تو ابوالحسن قطب شاہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ سکندر عادل شاہ کی کوئی مدد نہ کرے[3]

---

[1] چنانچہ بیجاپور کے جنرل سید مخدوم شرزہ خاں کے نام اس مضمون کا ایک فرمان آیا تھا (بساتین السلاطین ۵۲۰)۔

[2] خافی خاں جلد دوم ص ۲۹۲-۲۹۳۔ [3] بساتین السلاطین ص ۵۳۳۔

جب ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۵ء میں شہنشاہ خود بیجاپور کے محاصرے کو موثر بنانے کے لیے شولاپور گئے تو بہرہ مند خاں حیدر آباد کی نگرانی کے لیے مقرر ہوا تاکہ گولکنڈے سے کوئی فوج بیجاپور کی امداد کے لیے نہ آنے پائے۔ لیکن قطب شاہی حکومت اپنے خارجی مسلک سے مجبور تھی اس کو یہ معلوم تھا کہ جب تک بیجاپور قایم ہے گولکنڈے پر آنچ نہ آئیگی[1]۔ اسی لیے شہنشاہ نے گولکنڈے سے پہلے بیجاپور پر وار کرنا ضروری سمجھا، اس لیے ابوالحسن نے پہلے مراری راؤ کے تحت بیجاپور کی امداد کے لیے ایک فوج بھیجی جو سرحد کی ناکہ بندی کی وجہ سے منزل مقصود پر نہ پہنچ سکی، کیونکہ بہادر خاں اور بہرہ مند خاں حائل تھے۔ سکندر عادل شاہ نے بھی مدد مانگی تھی۔ اس آخری زمانے میں جبکہ بیجاپور کا محاصرہ سخت ہوگیا تو ابوالحسن نے پھر چالیس ہزار کی ایک فوج محمد ابراہیم خلیل اللہ کے تحت روانہ کرنے کی ہمت کی اگرچہ یہ منصوبہ پورا نہیں ہوا لیکن جس خط میں ابوالحسن نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا وہ مغلوں کے ہاتھ پکڑا گیا، اور شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا[2]۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ "اب تک

---

[1] فرائر لکھتا ہے کہ: "جب تک بیجاپور قایم ہے گولکنڈہ محفوظ ہے" (فرائر جلد دوم ص ۵۱، از تاریخ اورنگ زیب سرجادو ناتھ سرکار)۔

[2] حیدر آباد کے دو حاجب محمد معصوم اور محمد جعفر جن کو ابوالحسن نے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا تھا وہ کوتوال کی نگرانی میں نظربند تھے اور یہ حکم تھا کہ "ان کے ہاں گولکنڈے سے جو خطوط آئیں وہ اہتمام خاں کوتوال دیکھا کرے" اسی طرح یہ خط پکڑا گیا۔ اس کے الفاظ یہ تھے :-

"ایشان بزرگ اند۔ تاحال پاس مراسم بزرگ داشت نمودیم۔ حالانکہ ایشان سکندر را یتیم و ناتوان دانستہ بیجاپور را محاصرہ نمودہ کار او تنگ آوردہ اند۔ واجب آمد کہ سوائے جمعیت موفورہ بیجاپور راجہ سنبھا از طرفے با قشون از شمار افزوں جہت کومک آن بیکس کمر سعی بہ بندند۔ و ما بہ سرداری خلیل اللہ خان پلنگ حملہ چہل ہزار سوار مستعد پیکار تعین نمایم و ببینیم کہ ایشان کدام کدام طرف را مقابلت و مقاومت خواہند

ہم شہنشاہ کو بزرگ سمجھ کر ان کا پاس و لحاظ کرتے تھے لیکن اب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سکندر جیسے یتیم بچے کے سر پر مغل لشکر پہنچ گیا ہے اس لیے ہم خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ ادھر سے خلیل اللہ خاں کے تحت چالیس ہزار کی فوج امداد کے لیے جائیگی اور دوسری طرف سے سنبھاجی اپنی فوج لائیگا، پھر دیکھیں گے اورنگ زیب کس کس طرف سے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں"

اس خط کو دیکھ کر شہنشاہ بہت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ " ماگوش مال این یک چینی فروش میمون باز پلنگ نواز را موقوف داشتہ بودیم حالانکہ مادہ خروس بہ بانگ آمد جائے توقف نماند"[1] باوجود اس کے کہ بیجاپور کے محاصرے میں تمام توجہ منعطف تھی اور گولکنڈے کے لیے فوج بھیجنا بہت مشکل تھا تاہم اس کو اپنے حال پر چھوڑنا خلاف مصلحت سمجھا گیا، اس لیے شہزادہ معظم کو ایک بڑی فوج کے ساتھ فوراً حیدرآباد پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا، اور بہادر خاں کو حکم ہوا کہ اپنے مستقر اندی کو چھوڑ کر شہزادے کی مہم میں شامل ہو جائے! اس فوج میں صفدر خاں۔ اعتقاد خاں۔ ملتفت خاں۔ سید عبد اللہ خاں بارہہ۔ جاں نثار خاں وغیرہ جیسے نامور جنرل شامل تھے۔[2] ملکھیڑ پر جو گولکنڈے کی سرحد ہے مغل فوج کا پڑاؤ ڈالا گیا۔

اگرچہ قطب شاہی حکومت نے ہمیشہ مغلوں سے پہلو بچانے کی کوشش کی تاکہ ان کو کوئی شکایت نہ ہو

کرد۔ و آنہارا کہ پیش چبوترہ کوتوالی فرود آوردہ اند ازین معنی خستہ خاطر نشوند نزدیک است کہ تدارک بہ ظہور آید۔" (مآثر عالمگیری ص ۲۶۰)۔

زبیری نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ:۔ نوشتہ جات نہانی کہ در ایام محاصرہ بیجاپور با سکندر عادل شاہ داشت۔" (بساتین السلاطین ص ۵۴۸)۔

[1] "ہم نے چینی بیچنے والے بندر نچانے والے کی گوشمالی ملتوی کر دی تھی، چونکہ اب مرغی کڑکڑا رہی ہے اس لیے تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔" (حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۳۶۹)۔

[2] مآثر عالمگیری ص ۲۶۰۔ خافی خاں جلد دوم ص ۲۹۲۔

اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ جب شہنشاہ دکن آئے تو ابوالحسن نے اس کی خدمت میں ہاتھی اور جواہر ارسال کیے تھے اور بیجاپور کے محاصرے کے زمانے میں جبکہ شہنشاہ شولاپور میں تھے قطب شاہی حاجب بھی گئے تھے لیکن حکومت اپنے دفاعی انتظام سے غافل نہیں رہی بلکہ مغل حملوں کے خوف سے اپنے ہاتھ پیر مضبوط کرتی رہی اور بیجاپور کی متعدد بار مدد کی۔ مرہٹوں سے اتحاد کرلیا۔ سیواجی کے مرنے کے بعد سنبھاجی کو بھی مقررہ امداد دی۔ شمال اور شمالی مغربی سرحد کو محفوظ کیا گیا۔ محمد ابراہیم کو ایک جرار فوج کے ساتھ ملکھیڑ پر متعین کیا گیا جس نے بہلول خاں اور دلیر خاں کے متحدہ حملے کو رد کردیا اور شکست فاش دی۔ ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں ابوالحسن قطب شاہ اور مادنا بجواڑے اور کونڈپلی میں بہت دنوں تک مقیم رہے۔ کونڈپلی کے قلعے کو مستحکم کیا تاکہ اگر مغل حملہ آور ہوں تو مرکزی حکومت اور خزانہ یہاں منتقل کیا جاسکے۔ اسی زمانے میں کوندبیر کے قلعے کی بھی مرمت کروائی گئی[1] اور یہاں دو ہزار سپاہی متعین کیے گئے، حالانکہ پرانے انتظام میں صرف بارہ سو سپاہی رکھے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی کو لکھا گیا کہ بارہ ہزار ہون کی بارود پچیس کھنڈی سیسہ بہم پہنچائیں۔ اس کے علاوہ صوبۂ کرناٹک کی بھی خاطر خواہ نگہداشت کی گئی۔ جہاں حملوں کی ضرورت تھی حملے بھی کیے گئے چنانچہ لنگپا نے ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء میں چک نائکن پلی ایک قصبہ اور اس کے نواح پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔[2] اس کے علاوہ وہ علاقے جو محمد ابراہیم کی غفلت کے باعث ہاتھ سے نکل گئے تھے دوبارہ حاصل کیے گئے۔ زمانے کی ضرورت کا لحاظ کرکے مرکزی آلات حکومت میں بھی ضروری تغیر کیا گیا۔ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء میں بادشاہ دیوان کے گھر گئے۔ محمد ابراہیم کو جو اس زمانے میں مجموعہ دار کی خدمت پر فائز تھا علٰحدہ کرکے اکنا کو مقرر کیا۔[3] محمد ابراہیم صرف

---

[1] قرینہ یہ ہے کہ ورنگل کے قلعے کی بھی مرمت کروائی گئی ہوگی۔

[2] کرناٹک کے یہ معلومات مجھے بھوپال راؤ صاحب ام' اے سے دستیاب ہوئے ہیں۔

[3] ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵ء میں محمد ابراہیم سرلشکر کی خدمت پر فائز تھا لیکن مجموعہ داری سے علٰحدگی سے وہ بہت ناراض ہوا اور اسی وجہ سے ملکھیڑ کی لڑائی کے بعد مغلوں سے مل گیا۔

سرخیل کی خدمت پر بحال رکھا گیا۔ اکنّا نے کرناٹک کا جائزہ لنگپا کو دے کر مجموعہ دار کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔
اس طریقے سے اکنّا تمام داخلی امور کی نگرانی کرتا تھا، یہ سرلشکر اور وزیر داخلہ اور مادنا صرف خارجی امور کی نگہداشت
کرتا تھا۔ کیونکہ اس آخری زمانے میں مغلوں کے غلبے کی وجہ سے خارجی امور بہت پیچیدہ ہوگئے تھے اور ان کے لیے خاص
اہتمام کی ضرورت تھی۔ اور جب ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۵ء میں حیدرآباد پر حملہ کرنے کے لیے مغل فوجیں آنے لگیں تو ان کی مدافعت کا بھی
خاطر خواہ اہتمام کیا گیا۔ محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں۔ شیخ منہاج اور رستم راؤ کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج
جس کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ تھی ملکھیڑ پر متعین کردی گئی جو قطب شاہی سلطنت کی سرحد تھی۔

پہلے خان جہاں کوکلتاش اپنی فوج کے ساتھ ملکھیڑ پہنچا، برخلاف اس کے شاہ عالم دو یا تین میل پیچھے تھا
جب مغل فوج کا مقدمہ جس کا ہراول جاں نثار خاں تھا آگے بڑھا تو ملکھیڑ کے مشرق میں آٹھ میل کے فاصلے پر قطب شاہی
فوج نے جو پہلے سے ملکھیڑ پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی اس کا راستہ روکا چونکہ دکنی فوج تعداد میں زیادہ تھی اس لیے مغل فوج
قریب کے ایک قلعے میں محصور ہوگئی اور اپنی مدافعت کرنے لگی یہ پہلی جھڑپ میں جو ملکھیڑ اور سیڑم کے قریب ہوئی مغل فوج کو
شکست ہوگئی اس اثنا میں شہزادہ معظم آگیا اور اس نے جنگ سے بچنے کے لیے پہلے چند شرائط پر صلح کرنے کی کوشش کی۔
شرطیں پیش کی گئیں کہ اکنّا، اور مادنا کو حکومت سے خارج کردیا جائے اور سیڑم و رام گیر کے پرگنے مغلوں کے حوالے کیے جائیں۔
نیز بقایہ پیشکش ادا کردیا جائے[1]۔ لیکن دکنی فوج کے سرداروں نے ایک نہیں سنی بلکہ یلغار کردیا۔ خان جہاں ہمت خاں
اور سید عبداللہ بارہہ چاروں طرف سے گھر گئے اور ان کا باہر نکلنا مشکل ہوگیا، اور قرائن یہ تھے کہ خان جہاں
کوکلتاش کو شکست ہو جاتی لیکن مغل فوج کے ایک ہاتھی نے جس کے منہ میں چار من کی زنجیر دی گئی تھی ایک تہلکہ

---

[1] خافی خاں جلد دوم دکنی فوج کا ایک مشہور سپاہی باری خاں (جو پتھر پھینکنے میں بہت مشہور تھا) جس کا
ہاٹ بہنہ لقب تھا اپنے بھالے کے ساتھ خان جہاں کے ہاتھی کے سامنے آگیا اور پوچھا کہ مغل فوج کا خاص سردار
کون ہے، یہ حملہ کرنا چاہتا تھا کہ خان جہاں نے تیر سے اس کا کام تمام کردیا۔

ڈال دیا، اس کی یورش سے دکنی فوج منتشر ہوکر پیچھے ہٹ گئی۔ بہت سے ہاتھی و گھوڑے مغلوں کے ہاتھ آگئے مغل فوج نے فتح کے شادیانے بجائے، اس کے ساتھ ہی جاں نثار خاں نے گڈی سیڈم پر حملہ کرکے فتح کر لیا، اور اس کے بعد گولکنڈے سے ایک بڑی کمک آگئی[1] اور جاں نثار خاں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ طرفین کے بہت سے آدمی مرے اور اس کے چوتھے روز اس قدر سخت مقابلہ ہوا کہ ہمت خاں۔ سید عبداللہ خاں۔ راجہ مان سنگھ وغیرہ بُری طرح زخمی ہوگئے لیکن آخر میں قطب شاہی فوج کو شکست ہوگئی اور یہ میدان سے بھاگنے لگی۔ سید عبداللہ نے یہ رائے دی تھی کہ منہزم فوج کا تعاقب ہو تو مناسب ہے، لیکن شہزادہ معظم اور خانِ جہاں نے اس سے اختلاف کیا اور خیمہ لگا کر چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ویسے بھی بارش کی وجہ سے جنگ موقوف کرنی پڑی کیونکہ یہ بارش کا موسم تھا جب شہنشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے[2] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں بہت ملول و بددل ہوگئے اور چار پانچ مہینے مغلوں کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ حالانکہ دکنی فوج چپکے چپکے حملہ کرتی جاتی تھی، اس واقعے سے شہنشاہ اور زیادہ خفا ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے ایک فرمان لکھا جس میں خانِ جہاں کی سخت سرزنش کی گئی تھی اور یہ ہدایت تھی کہ فوراً حملہ ہونا چاہیئے۔

اگرچہ شہزادہ دل سے حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن شہنشاہی فرمان کی وجہ سے مجبور ہوکر اس کو اپنے سپہ سالاروں سے جن میں خانِ جہاں بھی تھا مشورہ کرنا پڑا چونکہ خانِ جہاں شہنشاہ کی طرف سے بر داشتہ خاطر تھا اس لیے اس نے حملے کی مخالفت کی، لیکن دوسرے سرداروں نے یہ رائے دی کہ اب شہنشاہی احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ سید عبداللہ نے خانِ جہاں کی جگہ اپنے آپ کو ہراول کی خدمت کے لیے پیش کر دیا جب یہ طے ہوگیا کہ لڑائی ہونی چاہیئے تو شہزادے نے سب سے پہلے حیدرآباد کے سرلشکر خلیل اللہ خاں کو صُلح کا پیغام بھیجا کہ

---

[1] یہ مادنا کی خاص فوج تھی جس کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے (خافی خاں جلد دوم ص ۲۹۸۔

[2] خافی خاں لکھتا ہے کہ شہنشاہ کو کچھ پہلے سے شہزادہ معظم اور خانِ جہاں سے شکایت تھی، اس تساہل سے اور زیادہ ناراض ہوگئے (خافی خاں جلد دوم ص ۲۹۹)۔

اگر ابوالحسن، سیڑم، کوہیر، اڑگی اور ملکھیڑ جو مابہ النزاع پرگنے ہیں ہمارے حوالے کردے تو جنگ ملتوی ہوسکتی ہے اور شہنشاہ سے "عفو تقصیرات" کی سفارش کی جائیگی۔" یہ پیغام ناظر محل مرکی معرفت بھیجا گیا تھا۔ محمد ابراہیم تو سیڑم اور دوسرے پرگنے دے کر صلح کرنا چاہتا تھا مگر شیخ منہاج اور رستم راؤ نے اس کو منظور نہ کیا بلکہ کہا کہ:۔

"قلعۂ سرحد سیڑم بر سر نوک شمشیر و سنان نیزہ ہائے ما وابستہ است"[1]

اور دکنی سپاہی فوراً بان پھینکنے لگے چنانچہ بعض بان تو خود شہزادہ معظم کے خیمے میں آپڑے اور کھانے کا خوان گر گیا، شہزادے نے بگڑ کر فوراً جنگ کی تیاری کی، چنانچہ بہادر خاں کے ساتھ شہزادہ معزالدین کو فوج کا ہراول بنایا گیا اور جعفر خاں و ہمت خاں اس کے ہمراہ رکھے گئے، مرکزی رسالہ خود شہزادہ معظم کے تحت تھا جس میں مان سنگھ، ابوالکلام سمند بیگ وغیرہ شامل تھے۔ اِدھر گولکنڈے سے بھی نئی کمک آگئی اور قطب شاہی افسروں نے اس وقت موقعے کی نزاکت کو ملحوظ رکھ کر جنگ کا ایک نیا نقشہ مرتب کرلیا، یعنی پہلے تو ان لوگوں نے یہ کام کیا کہ اپنی بھیڑ دائیں جانب تین چار میل ہٹادی اور پھر توپیں گڑھے میں اور بعض توپیں مٹی میں دبادیں تاکہ دشمن کو نظر نہ آئیں، اس کے بعد فوج کا ایک حصہ مغل ہراول کے سامنے اور دوسرا حصہ جس میں شیخ منہاج، رستم راؤ وغیرہ کھڑے تھے سید عبداللہ اور شہزادہ معظم کے مقابلے کے لیے مقرر کیا، اور بڑے زور سے یلغار کیا[2]۔ لیکن مغل فوج کی یورش کے سامنے پسپا ہوگئے اور گلڈی سیڑم کی طرف ہٹ گئے، دشمن سے تھوڑی مہلت مانگی پھر دوسرے روز شام تک لڑائی ہوتی رہی لیکن اس کا انجام بھی یہی ہوا جب شکست ہونے لگی تو قطب شاہی فوج نے شہزادہ معظم کو یہ پیغام بھیجا کہ بجائے گھمسان کی لڑائی کے دو بدو مقابلہ کیا جائے تو مناسب ہے، یعنی چند آدمی فریقین میں سے میدان میں آئیں اور شمشیر زنی کریں۔ اس بڑی خونریزی سے کیا فایدہ ہے، چونکہ شمشیر آزمائی دکن کا خاص فن تھا اس لیے قطب شاہی سپاہیوں کو تو اپنے فن پر

---

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۲۔

[2] خافی خاں جلد دوم ص ۲۰۲ ـ ۲۰۳۔

اطمینان تھا، لیکن مغل اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ شہزادے نے جواب دیا کہ ہم صرف ہاتھی پر مقابلہ کر سکتے ہیں اس طرح یہ مطالبہ رد ہو گیا۔[1] صبح کو یہ معلوم ہوا کہ قطب شاہی فوج حیدر آباد کی طرف فرار ہو گئی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فوج کے دکنی اور غیر دکنی عناصر میں بے حد اختلاف ہو گیا، اور بعض لوگ مغلوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر مغل فوج نے فتح کے نقارے بجائے اور قطب شاہی فوج کا تعاقب شروع کر دیا۔ جب دکنی فوج حیدر آباد پہنچ گئی[2] تو یہاں یہ حادثہ ہوا کہ گولکنڈے کا سرلشکر محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں مغلوں سے مل گیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب قطب شاہی فوج ملکھیڑ سے منہزم ہو کر آئی تو اس نے صرف محمد ابراہیم کو شکست کا ذمہ دار قرار دیا، اور بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ وہ مغلوں سے لڑنا نہیں چاہتا، مادنا نے بھی اس کی تائید کی۔ بادشاہ اس سے بہت ناراض ہوئے اور اس کو قید کرنا چاہا۔ اس سے خائف ہو کر محمد ابراہیم ۸ راکتوبر ۱۶۸۵ء (۱۰۹۷ھ) کو شہزادہ معظم کے پاس پہنچ گیا[3] چونکہ مغل ایسے مواقع کو غنیمت سمجھتے تھے اس پر عنایات کی بوچھار کر دی اور ملازمت میں داخل کر لیا۔ اس کو مہابت خان خطاب ششش ہزاری منصب اور چار ہزار سوار ملے۔

گولکنڈے کی فوجوں کی شکست اور محمد ابراہیم کی بے وفائی سے قطب شاہی حکومت بہت پریشان ہوئی۔ ابو الحسن پر اس قدر پریشانی طاری ہوئی کہ وہ اب دوسروں سے بھی بے اعتمادی ظاہر کرنے لگا۔ شیخ منہاج نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ "مادنا بھی ناقابلِ اعتماد ہے، اغلب یہ ہے کہ خلیل اللہ خاں کی غداری میں یہ بھی شریک ہو کیونکہ خلیل اللہ خاں آخر اسی کا آفریدہ ہے، ممکن ہے کہ یہ بھی کل کو مغلوں سے مل جائے"۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ فوراً حیدر آباد سے اٹھ کھڑا ہوا

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۳۰۵۔

[2] شہزادہ معظم پہلے دھوبی پیٹ کے راستے گگن پہاڑ آیا اور اس کے چند روز بعد گوشہ محل میں آکر ٹھیرا۔

[3] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۵۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد ابراہیم پہلے سے ناراض تھا کیونکہ اس کو دیوانی سے علیحدہ کر کے اکنا کو ترقی دی گئی تھی۔

اور جہاں تک ممکن تھا اپنے متعلقین اور ضروری زر و جواہر ہمراہ لے کر قلعے میں محصور ہو گیا۔ حالانکہ مادنا نے یہ مشورہ دیا تھا کہ گولکنڈے کی بجائے ورنگل کے قلعے میں پناہ لینا مناسب ہے۔ مگر اس کا کوئی لحاظ نہیں ہوا اول تو مادنا سے بے اعتمادی پیدا ہو گئی، دوسرے مغلوں کی آمد اور خلیل اللہ خاں کی بے وفائی سے ایسی بدحواسی طاری ہوئی کہ اس کو مشورہ لینے کی بھی مہلت نہیں ملی،[1] بلکہ وہ راتوں رات قلعے میں بھاگ گیا۔ بادشاہ کا اس طریقے سے شہر کو چھوڑ کر قلعے میں محصور ہونا اچھا نہیں تھا، اس سے شہر کی حفاظت کا تمام انتظام ٹوٹ گیا، اور لٹیروں کو جن میں مغل سپاہی بھی شامل ہو گئے تھے دن دھاڑے تاخت و تاراج کرنے کا موقع مل گیا۔ ان لٹیروں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ نہ صرف اہلِ شہر کے زر و جواہر لٹ گئے بلکہ خود شاہی محلات تاراج ہو گئے۔ ہر طرف آتش زدگی ہونے لگی، یہ عجیب دل خراش منظر تھا کہ ہزارہا شرفاء اپنے بیوی بچوں کو لے کر انتہائی وحشت میں بھاگ رہے تھے تاکہ اپنی عزت و ناموس کی حفاظت ہو سکے، عورتوں کو چادر اور برقعے اوڑھنے کی بھی مہلت نہیں ملی لیکن اس عزت و ناموس کی حفاظت میں ہزاروں کی جانیں تلف ہوئیں اور بہت سے گرفتار ہو گئے[2] اور ہزارہا شریف گھرانے آگ کی نذر ہو گئے۔ شرفاء کا تمام سامانِ تمدن راستوں پر بکھرا پڑا تھا، اور اس میں زر و جواہر اور قیمتی کپڑے ہر قسم کی چیزیں تھیں تقریباً پانچ کروڑ روپیے کی لوٹ ہوئی۔ بڑے قالینوں کا اٹھانا مشکل تھا اس لیے ان کے ٹکڑے کیے گئے۔ غرض مورخ خافی خاں کے الفاظ میں "عجیب ہنگامۂ قیامت و رستخیز غریب برپا گردید"[3] غالباً شہر حیدرآباد پر ایسی مصیبت کبھی نازل

---

[1] ۔ اس معاملے میں ابوالحسن نے اپنے اربابِ سیاست سے کوئی مشورہ نہیں کیا، اس بدحواسی میں اس نے اپنی عزت و ناموس کا پاس و لحاظ کیا، نہ اہلِ شہر کی عزت، جان و مال کی حفاظت کی پروا کی بلکہ شہر کو بالکل لٹیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا (خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۷)۔

[2] ۔ چونکہ ان لوگوں کو اپنا سامان اٹھانے کے لیے وقت پر کوئی گاڑی نہیں ملتی تھی اس لیے سب سامان چھوڑ دیا، اور اپنے بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑ کر قلعے کی طرف آ رہے تھے۔ [3] ۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۶۔

نہیں ہوئی تھی، اس شہر کو آراستہ کرنے میں قطب شاہوں نے جس قدر محنت کی تھی وہ سب رائیگاں گئی جب شہزادہ معظم کو اطلاع ہوئی تو اس نے تاخت و تاراج کا سدباب کرنے کی کوشش کی اور سپاہی متعین کیے، لیکن اس وقت تک سب کچھ ہو چکا تھا۔ یہ کوشش وقت پر ہونی چاہیئے تھی جو مغل سپاہی آتش فتنہ فرو کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے وہ بھی لوٹ میں شریک ہو گئے۔ بالآخر خانِ جہاں شہر کی حفاظت کے لیے مقرر ہوا تھا لیکن اس کے باوجود کچھ نہ کچھ لوٹ ہوتی رہی۔

اس ہمت شکن ماحول میں جبکہ شہر حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی اور ملک کے غدار ہر روز اپنی سلطنت سے منہ موڑ کر مغلوں سے مل رہے تھے[1] ابوالحسن کے لیے عاجزانہ درخواست صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ اس نے قلعے سے نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ صلح و رحم کی درخواست کی اور ہر شرط کے لیے رضامندی ظاہر کی شہزادہ معظم پہلے سے صلح و آشتی کی طرف مائل تھا، اور اس وقت وہ حیدرآباد کی تباہی سے ایسا متاثر ہوا کہ فوراً صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی اور شہنشاہ کے ہاں سفارش کرنے کا وعدہ کیا صلح کے لیے چار شرطیں طے ہوئیں:۔ (۱) پچھلے بقائے کی ادائی میں قطب شاہی سلطنت ایک کروڑ بیس لاکھ روپیے (۲) اور ہر سال دو لاکھ ہون خراج ادا کرے، (۳) نیز اکنا و مادنا جن سے مغلوں کو سخت شکایت تھی حکومت سے بے دخل کیے جائیں (۴) اور ملکھیڑ و سیرم جن کی مغل سلطنت پہلے سے دعویدار تھی فاتحوں کے حوالے کر دیئے جائیں شہزادہ معظم نے ان شرائط کے ساتھ صلح منظور کر لی اور میر ہاشم کی معرفت شہنشاہ کو اس کی اطلاع کر دی اور منظوری کی درخواست کی شہنشاہ اس صلح سے بظاہر خوش ہوئے اور شہزادے اور

---

[1] محمد ابراہیم کے علاوہ محمد تقی، محمد داؤد نے سلطنت سے بے وفائی کی اور مغلوں سے مل گئے۔ ان بے وفاؤں میں خود بادشاہ کا بہنوئی شریف الملک بھی تھا مغل سلطنت نے آخر الذکر کو سہ ہزاری منصب و دو سی صد سوار، اور دوسروں کو دو ہزاری منصبیں اور سی صد سوار عطا کیے (مآثر عالمگیری ۲۶۹)۔ جب محمد ابراہیم شہنشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا تو اس کو اکتالیس گھوڑے چند ہاتھی اور پانچ ہزار ہون انعام ملے۔ چند روز کے بعد زین العابدین بھی جو ابوالحسن کا ایک عزیز تھا مغل ملازمت میں داخل ہو گیا (مآثر عالمگیری ۲۰۲)۔

اس کے رفقائے کار کے منصب میں اضافہ کر دیا۔[1] شہزادہ معظم چند مہینے حیدر آباد میں ٹھیرا رہا کیونکہ شرائط کی تکمیل ابھی باقی تھی، چونکہ حیدر آباد کی وحشتناک حالت کی وجہ سے روپیہ جمع کرنا اور شرائط کے مطابق بقایا، اور خراج ادا کرنا بہت مشکل تھا، اور مغل فوج کے ہوتے ہوئے یہ کام اور بھی دشوار تھا، اس لیے ابوالحسن قطب شاہ نے شہزادے سے یہ درخواست کی کہ وہ حیدر آباد سے باہر چلا جائے، چنانچہ اس درخواست پر شہزادہ کوہیر چلا گیا جو حیدر آباد کے شمال مغرب میں واقع ہے اور وہاں تکمیل شرائط کا انتظار کرنے لگا۔ روپیوں کی فراہمی تو اس طریقے سے ممکن ہو گئی، لیکن مادنا، اور اکنا کی معزولی کا سوال ابھی باقی تھا۔ بادشاہ ان کی برطرفی کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ مغلوں کی مخالفت کے علاوہ خود گولکنڈے کے مسلمان اور محل کی خواتین ان وزراء کی سخت دشمن تھیں، کیونکہ یہ لوگ ان وزراء کو حیدر آباد کی تمام تباہی اور مسلمانوں کی خونریزی کا باعث سمجھتے تھے اور بیزار تھے۔[2] چنانچہ ان وزراء کی معزولی کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا، لیکن جب بادشاہ ان کو معزول کرنے میں پس و پیش کرنے لگے تو یہ لوگ بے قابو ہو گئے اور ان کو خود مارنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ ان کے قتل کی خفیہ سازش ہو گئی اس سازش میں بہت سے امراء اور ذی اثر لوگ تھے اور محل کے اندر سرِ دما، اور جانی صاحبہ جو عبداللہ قطب شاہ کی

---

[1] نعمت خاں مرزا محمد نے اس فتح کی مسرت میں ذیل کا قطعہ لکھ کر جس سے تاریخ بھی اخذ ہوتی ہے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

از نصرتِ بادشاہ غازی گردید دلِ جہانیاں شاد

آمد بقلم حساب تاریخ شد فتح بہ جنگ حیدر آباد (اس تاریخ میں ایک سال زیادہ ہے)
۱۰۹۷ھ

شہزادہ معظم کے منصب میں دہ ہزاری کا اضافہ کیا گیا تھا۔

[2] "قطع بریں تمام خرابی حیدر آباد و لشکر کشی و مسلمان کشی از نحوست ہر دو برادر دجال سیرت بد سرشت است تنگ آمدہ بودند" (خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۸)۔ لیکن سازش کرنے والوں میں غالباً ایسے لوگ زیادہ تھے جن کو مادنا نے برطرف کیا تھا۔

ذی الحرم تھیں ساتھ ہوگئیں لیکن شیخ منہاج جو اِن ہندو وزرا پر پہلے سے ادھار کھایا ہوا تھا سب کا سرغنہ بنا جب مادنّا او اکنّا رات کو بادشاہ کے پاس سے گھر واپس آرہے تھے، گولکنڈے کی ایک شاہراہ میں جمشید اور دوسرے غلاموں نے دونوں وزرا، پر حملہ کرکے انکو قتل کردیا[1] اِن کے ساتھ جو محافظ دستہ تھا وہ رشوت کے ذریعے پہلے سے فراہم کرلیا گیا تھا۔ اس وقت اتفاق رُستم راؤ گھر میں تھا سازشیوں نے گھر میں گھس کر اس کا کام تمام کردیا اِن لوگوں کے تمام گھر لوٹ لیے گئے اور اس اشتعال میں دوسرے مندر اور برہمنوں کو بھی نقصان پہنچا۔ اگر حکومت اس وقت روک تھام نہیں کرتی تو شاید بہت سے ہندوؤں کا خاتمہ ہوجاتا۔ محل کی بیگموں اور دوسرے اُمرا نے اِن مقتول وزرا کے سر شاہ عالم شہزادہ معظم کے پاس بھیج دیے اور شہزادے نے یہ سر بہادر علی خاں کے ہمراہ شہنشاہ کے پاس بھیجنے کا انتظام کیا، اور خود ابوالحسن کو آخر وقت تک اس کی اطلاع نہیں ہوئی۔[2] گو شہنشاہ دل سے خوش تو نہیں تھے لیکن اتنا اطمینان تو تھا کہ اب گولکنڈے میں مغل مفاد کی کوئی مخالفت نہ ہوگی۔

---

[1] ۔ مادنّا، اور اکنّا کے قتل کی صحیح تاریخ غرہ جمادی الاول ۱۰۹۷ھ م اوائل مارچ ۱۶۸۶ء ہے۔ ولندیزی سیاح ہیورٹ کا بیان ہے کہ یہ دونوں وزرا سڑک پر گھسیٹے گئے، مادنّا کا سر کاٹ کر شہنشاہ اورنگ زیب کے پاس بھیجا گیا، برخلاف اس کے اکنّا کا سر ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلا گیا (تاریخ اورنگ زیب جادو ناتھ سرکار)۔ فرائر کہتا ہے کہ ان کے قتل سے ملک میں کوئی شورش نہیں ہوئی اور کسی نے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے ان کی غیر ہر دلعزیزی معلوم ہوتی ہے۔

[2] ۔ محمد ساقی کہتا ہے کہ:-

"سر مادنا برہمن فتنہ زا ابوالحسن لوائے اطاعت وانقیاد بریدہ نزد شاہ عالم فرستاد" (مآثر عالمگیری ص ۲۶۵)۔

منوچی کہتا ہے کہ جب شاہ عالم نے حیدرآباد پر قبضہ کرلیا تو ابوالحسن نے صلح کی درخواست کی، شاہ عالم نے اپنے باپ کے پاس سفارش کی کہ صلح کرلینی چاہیئے، کیونکہ پہلے تو قلعے کی تسخیر میں بہت دیر لگے گی اور پھر جو کچھ قصور ہیں وہ ہندو وزراء کے ہیں، ابوالحسن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ ابوالحسن، شہنشاہ کے حسب خواہش شرائط کی تکمیل کردیگا۔ اس کے جواب میں شہنشاہ نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ ایک بڑی رقم، جواہر، ہاتھی اور آلات حرب

غالباً اسی وجہ سے شاہ عالم کو اپنے پاس شولاپور بلا لیا، اور قطب شاہی علاقوں سے تمام فوجیں ہٹا لیں۔ شہزادہ مع فوج کے ۷ رجون ۱۶۸۶ء کو شولاپور پہنچ گیا! اس کے پانچ روز کے بعد قطب شاہی حاجب شہنشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا، اور سو ہاتھی نذرانے کے طور پر پیش کیے۔

چاہتا ہوں اور یہ وعدہ لیا جائے کہ بیجاپور کی کوئی مدد نہیں کی جائیگی جواب وصول ہونے پر شاہ عالم نے ابوالحسن سے جواب تک قلعے میں محصور تھا گفت و شنید کی۔ وہ ان شرایط کے لیے تیار ہو گیا، اور پہلا کام یہ کیا کہ اکنّا، اور مادنّا کے سر کاٹ کر قلعے کی فصیل کے نیچے پھینک دیے (منوچی جلد دوم ص ۲۹۳ - ۲۹۴) لیکن محمد ساقی اور منوچی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے، ان کو قتل کرنا تو کجا ابوالحسن ان کو حکومت سے بے دخل کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ خافی خاں کے بیان کے مطابق بادشاہ کو اس کی مطلق اطلاع نہ تھی (خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۸)۔ اکنّا، اور مادنّا کے سر یکم جمادی الاول ۱۰۹۷ھ مطابق ۲۶ رمارچ ۱۶۸۶ء کو شہنشاہ کے پاس بھیجے گئے۔

بیسواں باب

گولکنڈے کا محاصرہ اور اس کا خاتمہ

یہ بے بنیاد صلح نامہ جو شہزادہ معظم سے طے ہوا تھا مغلوں کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ اس کی بنیاد اخلاقی نہ تھی بلکہ اس سے قطب شاہی سلطنت کو صریح دھوکا دینا مقصود تھا۔ مغل سلطنت نے اس سے بے حد فائدے حاصل کر لیے یعنی اپنی من مانی شرطیں منوالیں اور مطالبات پورے کروالیے۔ بقایا پیش کش اور تاوانِ جنگ وصول کیا۔ ملکھیڑا اور سیرم کے شاداب پرگنے جن کی مغل سلطنت زمانے سے دعویدار تھی چھین لیے۔ اور اس کے علاوہ سلطنت کے ہندو وزرا اکنا و مادنا کا جن سے مغلوں کو بہت ڈر تھا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ اور ظاہر ہے کہ ان ہندو وزرا کے مرنے سے اب قطب شاہی سلطنت میں کوئی چیز مغل مفاد کے سد راہ نہ تھی۔ ان واقعات سے شہنشاہ کو اس قدر اطمینان تھا کہ اس نے تمام مغل فوجیں جو گولکنڈے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی گئی تھیں واپس بلالیں۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ گولکنڈے سے اطمینان حاصل کر کے مغل حکومت نے بیجاپور کے خلاف اپنی تمام طاقت لگا دی ورنہ گولکنڈے کی وجہ سے فوجی طاقت اس قدر منتشر تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے بیجاپور کی تسخیر بہت مشکل ہو رہی تھی لیکن ان فائدوں کے باوجود مغل سلطنت نے اس معاہدے کا کوئی پاس نہیں کیا بلکہ چند روز کے بعد ہی جبکہ وہ بیجاپور کی مہم سے فارغ ہو گئی تو اس معاہدے کے پرخچے اڑا دیے۔ برخلاف اس کے قطب شاہی سلطنت کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ وہ مغلوں کے دلی ارادے سے بالکل ناواقف تھی اور آخر وقت تک یہ سمجھتی تھی کہ معاہدہ ایک اخلاقی بنیاد پر مبنی ہے جس طرح گولکنڈے سے اس کی پابندی ہو رہی تھی اسی طرح مغلوں سے پابندی کی جائز توقع تھی۔ اور غالباً اس معاہدے کو

زیادہ خوشگوار و مستقل بنانے کے لیے محل کی بیگموں نے جو اکنا و مادنا کے قتل کی ذمہ دار تھیں ان ہندو وزراء کے سر شہنشاہ کے پاس بھیجے تھے تاکہ یہ خوش ہوں اور پھر گولکنڈے پر حملہ نہ کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہ اس معاہدے کے لیے دل سے تیار نہ تھے، اس کو رسمی طور پر منظور تو کرلیا جو نظم ونسق کا اقتضا تھا لیکن دل سے خوش نہیں ہوئے بلکہ درپردہ شہزادہ معظم اور بہادر خاں کی ملامت کی کہ انھوں نے کیوں یہ معاہدہ منظور کرلیا[1]۔ کیونکہ اس مہم سے شہنشاہ کی اصل غایت گولکنڈے کی تسخیر تھی جو پوری نہیں ہوئی لیکن اس معاہدے سے شہنشاہ کو بیجاپور کی فتح تک سانس لینے کا موقع مل گیا، اور اس وجہ سے اس نے چند روز جبکہ بیجاپور کا محاصرہ جاری تھا سکوت اختیار کیا، اور قطب شاہی سلطنت کو دھوکے میں رکھا۔ پہلے تو سعادت خاں کو حاجب کی خدمت پر مامور کرکے گولکنڈہ بھیج دیا تاکہ معاہدے کے مطابق تاوان اور پیش کش وصول کرے اور اس کے بعد سعادت خاں کے بھائی مرزا محمد کو جو نعمت خان عالی کے خطاب سے مشہور ہے اس غرض کے لیے علٰحدہ بھیجا کہ وہ بظاہر ابوالحسن سے "دو الماس مربع خوش قطع شفاف" بطور پیش کش وصول کرلے لیکن اس کو درپردہ یہ ہدایت کی گئی کہ ابوالحسن کے ساتھ سخت کلامی کرکے اس کو گستاخی اور لڑائی پر آمادہ کرے تاکہ "برائے ماجھتے و دست آویزی بر جہت تنبیہ و استیصال او باشد"[1]

۱۲ ستمبر ۱۶۸۶ء (۱۰۹۷ھ) میں بیجاپور فتح ہوا اس فتح کے بعد مغل فوج گولکنڈے کی تسخیر کے لیے فارغ ہوگئی چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب ۲۹ محرم، ۱۰۹۸ھ، ۳ اکتوبر کو حیدرآباد کے ارادے سے روانہ ہوئے اور آہستہ سفر کرتے ہوئے

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۳۱۳۔

[2] شہنشاہ کا یہ حربہ بے کار ثابت ہوا کیونکہ ابوالحسن، نعمت خاں سے کم لائق نہ تھا۔ اس نے ہر اعتراض کا ایسا جواب دیا کہ نعمت خاں کو ہار ماننی پڑی اور وہ ابوالحسن کا قائل ہوگیا۔ (منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۹۴، ۲۹۵)۔

پہلے گلبرگہ پہنچے اور وہاں درگاہ حضرت بندہ نواز صاحبؒ کی زیارت کی اور اس کے کئی روز کے بعد بیدر آئے، اور حیدرآباد آنے سے پہلے سعادت خاں حاجب گولکنڈہ کو حکم ہوا کہ ابوالحسن سے زر پیش کش وصول کرے۔ فرمان میں تخویف کے ساتھ تسلی کے الفاظ بھی تھے[1]۔ ظاہر ہے کہ پچھلے معاہدے کے مطابق بقایا وصول طلب تھا لیکن اس وقت اس فرمان سے بقایا پیش کش وصول کرنے سے زیادہ ابوالحسن کو صریح دھوکا دینا مقصود تھا کہ گویا گولکنڈے سے کوئی پرخاش نہیں ہے اور وہ مقابلے کی تیاری نہ کرے۔ اور اس کا اندازہ اس فرمان سے بھی ہوتا ہے جو سعادت خاں کے نام در پردہ آیا تھا، اور اس کو راز میں شہنشاہ کی نقل و حرکت کی اطلاع کر دی گئی اور گولکنڈے کی حکومت صریح دھوکے میں تھی۔ اس نے صلح کی امید میں پیش کش بھیجنے کا انتظام کر لیا چونکہ ابوالحسن کے پاس نقد روپیہ نہیں تھا، اس لیے اس نے زر و جواہر سے اس کی فوری پابجائی کی یعنی اس نے زر و جواہر سے بھرے ہوئے نو خوانچے سعادت خاں کے پاس بھیجے تاکہ یہ نقد روپیہ وصول ہونے تک بطور امانت رکھے جائیں۔ گو ان کی قیمت کا تعین بھی نہیں ہوا تھا لیکن تخمینہ یہ ہے کہ یہ زر و جواہر وصول طلب نقد سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ ابوالحسن کو اس انتظام سے اس قدر اطمینان تھا کہ وہ مدافعت کی باضابطہ تیاری بھی نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ ہزار ہا روپیے کے زر و جواہر جھپکے سے دشمن کے ہاتھ چلے گئے جو آڑے وقت خود گولکنڈے میں کام آتے۔ ظاہر ہے کہ اس ارسال پیش کش سے شہنشاہ کی نقل و حرکت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ شہنشاہی جلوس گلبرگے کی طرف برابر بڑھ رہا تھا۔ یہ ایسی متوحش خبر تھی کہ اس سے قطب شاہی حکومت بہت پریشان ہوئی[2]۔ کیونکہ خوانچے شہنشاہ کے پاس جا چکے تھے یا سعادت خاں نے

---

[1] ۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۲۳۔

[2] ۔ محمد ساقی لکھتا ہے کہ ابوالحسن اس قدر پریشان ہوا کہ:۔

"چوں تصویر رو بہ دیوار ماند۔ لب از خندہ نومید۔ چشم از گریاں سرشار۔ سر از ہوش خالی۔ زباں از گفتگو بے کار۔" (مآثر عالمگیری ص ۲۸۷)۔

یہ الفاظ بہت مبالغے پر مبنی ہیں۔ ابوالحسن ایسا مستقل مزاج بادشاہ تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر متزلزل نہیں ہوا۔

اپنے پاس چھپا رکھے تھے اور جب خود ابوالحسن نے واپس طلب کیے تو سعادت خاں نے کہا کہ یہ خوانچے شہنشاہ کے پاس بھیجدیے گئے ہیں۔ لڑائی کی لڑائی ٹھیری اور زر و جواہر بھی واپس نہیں ملے۔

۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۷ھ (۲۸ جنوری ۱۶۸۶ء) میں شہنشاہ گولکنڈہ سے دو منزل پر پہنچ گئے[1] ور ابوالحسن قطب شاہ نے نہایت انکسار کے ساتھ صُلح کرنی چاہی لیکن شہنشاہ کی نظر میں اس کی اتنی بُرائیاں تھیں کہ اب صُلح ممکن نہیں تھی[2] جب صُلح کی کوئی صورت نہ تھی تو ابوالحسن نے مدافعت کی تیاری کی۔ شرزہ خاں شیخ منہاج اور مصطفیٰ خاں لاری کو جس کا اصل نام عبدالرزاق لاری تھا مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہدایت کی لیکن ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ اگر مغلوں کو شکست ہو جائے اور شہنشاہ گرفتار ہوں تو ان کو مارنا نہیں بلکہ نہایت احترام کے ساتھ لانا۔ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں لڑائی شروع ہو گئی اور مغلوں نے ۲۴ ربیع الاول کو قلعے کا محاصرہ کر لیا جس میں بہت تیاری تھی۔ ۱۹۰۰ برقنداز ۴۰۰۰ احشام ۱۰۶ توپیں جمع کی گئی تھیں۔ منجملہ ان کے ۱۷ بڑی توپیں تھیں جو چار[4] سیر سے لیکر چالیس[4] سیر وزنی گولے پھینکتی تھیں۔ ۸۰۹۵ من بارود ۲۴۴۲ گولے اور خندق بھرنے کے لیے پونے چار لاکھ تھیلے موجود تھے صف شکن خاں ایک ایرانی میر آتش۔ فیروز جنگ سپہ سالار۔ شاہ عالم کمان دار مقرر ہوئے۔ فیروز جنگ کے باپ خواجہ عابد بھی فوجوں کی رہنمائی میں شریک تھے۔

---

[1] ۔ مآثر عالمگیری ص ۲۸۸۔

[2] ۔ ابوالحسن کی درخواست صُلح پر حسب ذیل فرمان نافذ ہوا تھا:۔

اگرچہ افعال قبیح آن بدعاقبت از احاطۂ تحریر بیرون است امّا از صدیکے و از بسیار اندکے بشمار می آید اولاً اختیار ملک و سلطنت بہ کف اقتدار کافر فاجر ظالم دادن و سادات و مشائخ و فضلا را منکوب و مغلوب او ساختن و در رواج فسق و فجور بہ افراط علانیہ کوشیدن و خود از بادہ پرستی بہ ریاست و بدمستی و دولت در انواع کبائر شب و روز مستغرق بودن بلکہ کفر از اسلام و ظلم از عدل و فسق از عبادت فرق نہ نمودن و دلالت کفار

۲۷ دسمبر کو سخت خونریز لڑائی ہوئی اور مغلوں کے نامور سردار ابوالمکارم سید عبداللہ بارھہ زخمی ہوئے کشور سنگھ اور کرشنا سنگھ جیسے راجپوت سردار کام آئے قلعے سے شدید آتش باری ہوتی تھی۔ قلیچ خاں خواجہ عابد کا توپ کے گولے سے انتقال ہو گیا، اور شاہ عالم نے پھر کوشش کی کہ ابوالحسن سے صلح ہو جائے اور اس سلسلے میں قلعے سے کچھ مراسلت بھی ہوئی۔ چونکہ شہنشاہ شاہ عالم سے ناراض تھے اور جب ان کو ابوالحسن کی مراسلت کا حال معلوم ہوا تو اور برافروختہ ہوئے اور شاہ عالم اور ان کی بیوی کو نظر بند کر دیا[1] اس کے بعد تیر و زجنگ پر ہی محاصرے کی پوری ذمہ داری تھی کیونکہ ان پر شہنشاہ کو پورا اعتماد تھا، اس کے برخلاف صف شکن خاں میر آتش اور روح اللہ خاں بخشی قابل اعتماد نہیں سمجھے جاتے تھے۔ جب محاصرہ شروع ہوا تو قلعے کے باہر بھی بہت بڑی فوج مغلوں کی مزاحمت کے لیے متعین تھی اور یہ کوئی چالیس ہزار بتائی جاتی ہے یہ شیخ نظام اور مصطفیٰ خاں کی سرکردگی میں اس پھرتی سے حملہ کرتی تھی کہ

حربی اصرار و رزیدن وخود را در عدم اطاعت اوامر و مناہی الٰہی خصوص در بارہ منع معاونت دار الحربی کہ نص کلام مجید بہ تاکید واقع شدہ نزد خلق و خلایق مطعون ساختن چنانچہ مکرر دریں باب فرامین نصیحت آمیز مصحوب مردم آداب دانی مزاج گرفتہ حضور صادر شد۔ و پنبۂ غفلت از گوش نکشید بلکہ دریں تازگی فرستادن لک ہون برائے سنبھائے بدکردار بہ عرض رسید۔ بہ این ہمہ غرور و مستی نادہ ناکامی نظر بر افعال وزشتی اعمال خود نہ نمودن و امید رستگاری در ہر دو جہان داشتن۔ زہے تصور باطل زہے خیال محال۔" (خافی خاں جلد دوم ص ۳۲۸)۔

[1] شاہ عالم اور ان کی بیوی شروع سے قطب شاہی سلطنت کے بہت ہمدرد تھے اس لیے شہنشاہ کو ہموار کرنے کے لیے ابوالحسن نے بھی ان سے کام لیا، اور شاہ عالم نے ابوالحسن سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن اس طرز عمل سے شہنشاہ ناراض ہو گئے۔

ان کی مدافعت بہت مشکل ہو جاتی تھی اور پاس دار و گیر میں اکثر مغل فوجیں کام آئیں اور خافی خاں کے الفاظ ہیں کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ "بند ہائے کار طلب بادشاہی تلف نہ شدند"۔[1] اس دوران میں فیروز جنگ نے قلعے پر ایک شبخون مارنے کی کوشش کی اور ۱۶ مئی کو فصیل پر زینے لگا دیے اور اوپر رسّے پھینک کر چڑھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ پہرے والے تمام مست خواب تھے لیکن ان کی آہٹ سے ایک کتا بھونکنے لگا اور اس کی آواز سے تمام چوکیدار جاگ گئے اور ان لوگوں نے رسّے کاٹ دیے اور زینے پھینک دیے اور حملہ آوروں کو ایسا دھکیل دیا کہ دو مغل تو فوراً مر گئے اور بعد کو بندوقوں کی زد سے بہت سے مغل سپاہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ فیروز جنگ کا یہ حملہ بڑی طرح ناکام ہوا۔ ابوالحسن نے اس کتے کی جس کے بھونکنے سے مغلوں کو شکست ہوئی تھی بڑی عزت کی، اس کے گلے میں سونے کی زنجیر باندھی اور اس کو "سہ طبقہ" خطاب دیا۔[1] مغلوں کی شکست سے فائدہ اٹھا کر قلعے والوں نے ان کے توپخانے پر حملہ کیا اور بہت سے توپچیوں کا خاتمہ کر دیا۔

شعبان کے وسط تک محاصرے کے چار مہینے ہو چکے تھے اور مغل فوج کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، کیونکہ دو سال سے دکن میں بارش نہیں ہوئی تھی، دوسرے سنبھاجی نے گولکنڈے کی تائید میں ہر طرف کھیت جلا کر خاک کر دیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مغلوں کو غلّہ ملنا بہت دشوار ہو گیا، اور جب رجب کے مہینے میں بارش شروع ہو گئی تو آمد و رفت اور غلّے کی فراہمی بہت دشوار ہو گئی اس کے علاوہ مسلسل بارش کی وجہ سے توپوں کے دمدمے اور اور مورچے سب تباہ ہو گئے اور محاصرین کا بہت نقصان ہوا، اس سے قلعے والوں کو بہت موقع ملا، انھوں نے ۱۵ جون کو مغلوں کے مورچوں اور توپخانوں پر اس قدر زور سے حملہ کیا کہ مغل پریشان ہو گئے، توپوں کے سوراخوں میں کیلے ٹھونس دیے، تمام بارود چرا لی اور پھر مغل افسروں پر دھاوا بول دیا۔ سلیم خاں اور صف شکن خاں نے گڑھوں میں

---

[1] چونکہ فیروز جنگ کو "سہ طبقہ" خطاب یعنے خان۔ بہادر۔ جنگ حاصل تھا، اس نے اس کے مقابلے میں کتے کو بھی یہ خطاب دیا تھا۔ دخافی خاں جلد دوم ص ۳۴۳۔

منہ چھپایا۔ جمشید خاں پہلے سے بھاگ گیا تھا۔ عزیز خاں نے اپنے کو چھپانے کے لیے منہ پر کیچڑ لگا کر ایک گلی میں روپوش ہوگیا تھا کہ یہ اور سربراہ خاں دونوں گرفتار ہوگئے اور قلعے میں پہنچا دیے گئے، گو قلعے میں قطب شاہ نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا اس کے باوجود شہنشاہ گولکنڈے کی تسخیر پر تُلے ہوئے تھے۔ حالانکہ اکثر صداقت پسندوں کی رائے اس کے خلاف تھی۔ چنانچہ جب قاضی شیخ الاسلام سے مہم بیجاپور اور گولکنڈے کے متعلق استفسار کیا گیا تو اس نے نہایت جراُت کے ساتھ یہ رائے دی تھی کہ "شہنشاہ کے لیے ان اسلامی سلطنتوں پر حملہ کرنا جائز نہیں ہے" اس پر شہنشاہ بہت خفا ہوئے اور وہ اپنی خدمت سے مستعفی ہو کر حجاز چلا گیا۔ قاضی عبداللہ جو اس کی جگہ مامور ہوا تھا اس نے بھی یہی رائے دی کہ "ابوالحسن مسلمان ہے اس کے خلاف یہ دار و گیر جائز نہیں ہے۔" یہ قاضی بھی بہت معتوب ہوا، اور اس پر دربار کی آمد و رفت موقوف ہوگئی۔[1]

محاصرے میں جبکہ چار مہینے سے زیادہ ہوگئے تھے ابوالحسن نے پھر ایک مرتبہ معافی کی درخواست کی وہ یہ تھی کہ:۔

"جب قلعہ آپ کے تصرف میں آ جائے تو اس ملک کا انتظام کسی اور امیر کو سپرد کرنے کی بجائے مجھے سپرد کیا جائے کیونکہ یہ ملک بہت پامال ہوگیا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ محنت درکار ہے اور اس کام سے مجھے جو ہمدردی ہوسکتی ہے دوسرے کو نہیں ہوسکتی اور اس کے معاوضے میں کثیر رقم ادا کردوں گا، یعنی جب آپ اس سرزمین میں تشریف لائیں گے تو ہر منزل پر ایک کروڑ روپیہ ادا کروں گا، اور اس وقت قلعے پر جتنی یورشیں ہوئی ہیں ان کے مطابق ایک کروڑ روپیہ بطریق نثار ادا کروںگا اور یہ سب کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کا ناحق خون ہو رہا ہے اور یہ مال و عیال سے

---

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۳۴۴۔

محروم ہو رہے ہیں۔[1]

یہ درخواست منظور ہونا تو کجا بہ قول خافی خاں :۔

"درجواب کلمات ناصواب لغو فرمودند کہ اگر ابوالحسن از فرمودہ و حکم ما بیرون نیست،
بعدہٗ کہ دست بستہ حاضر شود یا سر و گردن او بستہ حاضر سازند۔"[2]

کیونکہ اب شہنشاہ کو یہ فکر آپڑی تھی کہ مغل سلطنت کا وقار غایب نہ ہو جائے، وہ کسی طرح گولکنڈے کو مسخر کر ہی لینا چاہتے تھے۔

اس کے بعد محاصرہ سخت کر دیا گیا اور قلعے کے اردگرد مورچے باندھ کر توپوں کے ذریعے یورش ہونے لگی اور فصیل میں کئی مرتبہ نقب لگا کر بارود کے ذریعے اُڑانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اہل قلعہ کی باخبری اور عبدالرزاق لاری کی رہنمائی سے مغلوں کو سخت پسپائی ہوتی تھی، چنانچہ ۲۰ رجون کو سُرنگیں اُڑانے کا جو اہتمام کیا گیا تو اس کا یہ حشر ہوا کہ جن فصیلوں میں نقب لگا کر بارود بھر دی گئی تھی قلعے والوں نے بہت سی بارود خارج کر دی اور کچھ بارود کا رُخ مغل فوج کی طرف پھیر دیا، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب سُرنگ اُڑی تو قلعے کی فصیل کو تو کوئی دھکا نہیں لگا، بلکہ بارود کے دھماکے اور پتھروں کے اُڑنے سے اُلٹے مغلوں کے کوئی گیارہ سو آدمی ہلاک ہو گئے اور جو باقی بچ گئے تھے ان میں "وا ویلائے کشتہ شدن و زخمی گردیدن و دست و پا باختن" بلند ہونے لگا۔ اس سے دشمن کو اور موقع ملا، چنانچہ اس نے قلعے میں سے یورش کی اور بہت سے مغل تہ تیغ ہوئے جن خندقوں پر مغل قابض ہو گئے تھے ان کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسری مرتبہ سُرنگ اُڑائی تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے ہوا تھا۔ پہلے ایک ہزار مغل مرے اور اس سے مغل کیمپ میں اس قدر مایوسی چھا گئی کہ تمام مغل سپاہی گولکنڈے سے بھاگنا

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۳۴۹ - ۳۵۰۔

[2] خافی خاں جلد دوم ص ۳۵۰۔

چاہتے تھے اور یہ آرزومند تھے کہ محاصرہ اُٹھا لیا جائے[1] تا اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لیے خود شہنشاہ فصیل کے قریب آتے اور محاصرے میں حصہ لیتے تھے اس کے باوجود قلعہ کشائی ناممکن تھی، کئی مغل افسر مر گئے اور غازی الدین خاں فیروز جنگ جو اس تمام محاصرے کی روح رواں تھے اور ان کے ساتھ رستم خاں ودلپت راؤ بندیلہ بُری طرح زخمی ہوئے اور اہلِ قلعہ کا یہ حال تھا کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ نہ صرف حملہ کرتے بلکہ مغلوں کی توپوں کو اس پھرتی سے قلعے کے اندر لیجاتے تھے کہ مغل حیران رہ جاتے تھے اور قلعے سے بان و بندوقوں کی اس قدر بارش ہوتی تھی کہ ایک انچ آگے بڑھنا ناممکن تھا۔[2] غالباً محصورین کی مستعدی کا اصل باعث خود ابوالحسن قطب شاہ تھا جس نے آخری دم تک ہمت نہیں ہاری، اور خافی خاں کے الفاظ میں:" ابوالحسن سنگ دل دل از حصار گولکنڈہ برنمی کند"[3]

یہ ابوالحسن کی مستعدی تھی کہ بعض بے وفاؤں کے سوا عام اہلِ قلعہ آخری دم تک لڑتے رہے۔ اسی دوران جنگ میں گھٹا ٹوپ بادل چھاگئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گولکنڈے کی فوجیں تو محفوظ تھیں، برخلاف اس کے مغل فوج کے لیے کوئی سایہ نہ تھا اور ان کو راستہ ملنا مشکل ہوگیا، اور ہر طرف اتنا پانی بھر گیا کہ توپخانے بہہ گئے۔ نالے اس قدر بھرپور چل رہے تھے کہ عبور و مرور دشوار تھا۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر قطب شاہی فوجیں حملہ کرتی تھیں اور توپیں قلعے میں لیجاتی تھیں، مغلوں کی مزاحمت بہت ناکام ہوتی تھی۔ اسد خاں وزیر اعظم اور شہزادہ کام بخش نے بہتیری کوشش کی لیکن ان کی ایک بھی نہیں چلی۔ ۲۱ رجون کو ایک اور سُرنگ اُڑانے کی بے سود کوشش کی گئی، وہ اس وجہ سے نہیں اُڑی کہ اہلِ قلعہ نے تمام بارود نکال لی تھی۔ مغل سپاہی ناکام واپس آگئے۔ اور شہنشاہ بھی جو اس دوران میں محاصرے کو پُرزور بنانے کے لیے فیروز جنگ کے مچیے میں آگئے تھے، چُپ چاپ اپنے خیمے میں واپس

---

[1] ۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۵۲۔

[2] ۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۵۴۔

[3] ۔ مآثر عالمگیری ص ۲۹۵۔

ہو گئے ۔اگرچہ ۱۰ جولائی کو شہزادہ اعظم اور روح اللہ خاں کی سرکردگی میں نئی فوجیں آگئیں اور گولکنڈے کا مشہور جنرل شیخ منہاج مغلوں سے مل گیا۔[1] لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ قحط اور وبا سے علیحدہ جان عذاب میں تھی۔ جنگ کے علاوہ ان آسمانی مصیبتوں سے لوگ علیحدہ مر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ندی نالے مکانات سب مردوں سے پٹے ہوئے تھے، چو طرف لاشوں کے پشتے نظر آتے تھے اور ان کو ندی، نالوں میں بہا دیا جاتا تھا اور یہ جنگ ہر روز دکھائی دیتا تھا۔ اکثر مغل سپاہی جو ان مصیبتوں سے بیزار ہو گئے تھے قطب شاہی حکومت سے مل گئے۔[2]

شہنشاہ نے آخری کوشش یہ کی کہ قلعے کے اردگرد لکڑی اور مٹی کی ایک دیوار بنائی اور نئے مورچے کھڑے کیے اور شہزادہ اعظم آیا تو اس کو سپہ سالار بنا دیا کیونکہ فیروز جنگ بہت زخمی ہو گئے تھے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس مایوسی میں بالآخر اس بات پر غور ہوا کہ قلعے کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ ابوالحسن چند روز اور "پردہ نشیں" رہے، باقی تمام سلطنت پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ حیدر آباد کا نام "دارالجہاد" رکھا گیا، اور تمام سلطنت میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھایا گیا۔[3]

اگر یہی صورت حال رہتی تو ظاہر ہے کہ قلعے کی تسخیر ہمیشہ کے لیے ناممکن ہو جاتی کیونکہ اب مغلوں کے پاس یہی ایک صورت باقی تھی کہ یہ چپ چاپ مہینوں تک محاصرہ کیے ہوئے پڑے رہتے اور اہل قلعہ کو رسد کی قلت کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتے، مگر مغلوں کے لئے اول تو مہینوں تک محاصرہ کیے ہوئے پڑے رہنا ناممکن تھا، دوسرے اہل قلعہ بھی خاموش نہیں تھے، بلکہ دشمن کو تھکانے اور بیزار کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرتے تھے اور ان کامیاب یورشوں کے مقابلے میں بالآخر مغلوں کو محاصرہ اٹھا دینا ضروری ہوتا لیکن اہل قلعہ کی بے وفائی کی وجہ سے

[1] شیخ منہاج کو ہفت ہزاری منصب اور تقرب خاں خطاب ملا۔

[2] مآثر عالمگیری ص ۲۹۵۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۴۷۔

[3] خافی خاں جلد دوم ص ۳۵۸۔

بالآخر مغلوں کی مرادیں بر آئیں۔ شروع سے ہی جبکہ ابراہیم سپہ سالار مغلوں سے مل گیا، اکثر بے وفا قلعہ چھوڑ کر مغل ملازمت اختیار کر رہے تھے، چنانچہ اس منزل پر متعدد اہلِ قلعہ روگرداں ہو گئے اور مغل ملازمت اختیار کر لی۔ اب قلعے میں مصطفیٰ خاں لاری، اور عبداللہ خاں پنی دو جنرل باقی رہ گئے تھے جن پر قلعے کی مدافعت کا دار و مدار تھا اور آخر تک جبکہ محاصرے کو آٹھ مہینے پہنچنے والے تھے یہ لوگ مخلصانہ قلعے کی مدافعت کر رہے تھے، لیکن اس عین وقت پر جبکہ مغل مایوس ہو گئے تھے عبداللہ خاں پنی بھی باغی ہو گیا، اور مغلوں سے ساز باز کر لی یعنی مغل فوج کے داخلے کے لیے قلعے کا دروازہ کھولنے تیار ہو گیا۔ یہ بے وفائی کی آخری کڑی تھی اگر یہ غداری سرزد نہ ہوتی تو قلعہ فتح نہیں ہوتا، کیونکہ قلعے میں مصطفیٰ خاں جیسے وفادار لوگ ابھی موجود تھے اور مدافعت کا خاطر خواہ سامان تھا۔ اگر عبداللہ خاں قلعہ چھوڑ کر مغلوں سے مل جاتا تو اس سے قلعے کو نقصان نہیں پہنچتا۔ مشکل یہ ہوئی کہ اس شخص نے قلعے کے اندر رہ کر دشمن کے روبرو دروازہ کھول دیا چنانچہ ۲۴ ذیقعدہ کو مغل فوج کھڑکی سے رات کو قلعے کے اندر داخل ہو گئی اس کے بعد مدافعت کی تمام تدبیریں لاحاصل ثابت ہوئیں۔

عبداللہ خاں کے اشارے پر ۲۴ ذیقعدہ ۱۰۹۷ھ م ۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء کو شب کے تین۳ بجے مغل فوج دروازے میں داخل ہو گئی جو کھلا رکھا گیا تھا۔ اورنگ زیب کے مشہور سپہ سالار روح اللہ خاں۔ مختار خاں۔ رستم خاں۔ صف شکن خاں اور جاں نثار خاں اندر آ گئے اور محل کی طرف بڑھنے لگے۔ شہزادہ اعظم ہاتھی پر سوار باہر کھڑا ہوا تھا، ان لوگوں کے اندر آتے ہی قلعہ فتح ہونے کا شور ہوا، اور باہر فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ یہ خبر پاتے ہی عبدالرزاق لاری جس کا مصطفیٰ خاں خطاب تھا فوراً مدافعت کے لیے کھڑا ہو گیا[ے]۔ اگرچہ

ے۔ عبدالرزاق لاری جس کا مصطفیٰ خاں خطاب تھا، ہندوستان میں شہرتِ دوام کا مالک ہے۔ اس شخص کی وفاداری ضرب المثل ہے، گو بہت سے باغی قطب شاہی حکومت سے روگرداں ہو کر مغل حکومت سے مل گئے لیکن یہ آخر دم تک اپنی وفاداری پر اڑا رہا، اس کی حمیت اور جذبۂ وفاداری اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ

اس بدحواسی میں مسلح ہونے کا کہاں موقع تھا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں جس قدر اس سے ہو سکا ہاتھ میں تلوار اور سپر لیے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا، اور بارہ آدمیوں کے ساتھ مدافعت کے لیے آ گیا۔ اگرچہ اس سیلاب کو ڈھکیلنا عبدالرزاق اور اس کے بارہ ساتھیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ نیز اس کے بارہ ساتھی بھی اس دار و گیر میں ایسے منتشر ہو گئے کہ ان کا پتا نہیں چلا لیکن اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ مردانہ وار دشمن پر جا گرا، حالانکہ خافی خاں کے الفاظ میں اس کی حالت:۔ "مانند قطرہ بہ دریا افتد یا ذرہ کہ با خورشید ہمسری نماید" کی سی تھی۔ ایک دیوانے کی طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ:۔ "تا جان دارم نثار راہ ابوالحسن خواہم نمود"[1] ہزارہا آدمیوں سے تنہا مقابلہ کرتا رہا، چنانچہ اس دار و گیر میں اس کے بدن پر اتنے زخم لگے تھے کہ ان کی گنتی نہ تھی، صرف چہرے پر بارہ زخم آئے تھے اور غشی کی حالت طاری ہونے لگی تھی، بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ گھوڑے کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی

اپنی سلطنت سے پھر جائے۔ قلعے کی گرتی ہوئی حالت اور مغلوں کی ترغیبوں کے باوجود اس کے پائے استقامت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ جس وقت عبداللہ خاں سے مغلوں کی سازش ہو رہی تھی شہنشاہ کے جاسوس شش ہزاری منصب و شش ہزار سوار اور دیگر عنایات کے وعدے لیکر اس کے پاس بھی آئے لیکن نہایت غصے میں اس نے شہنشاہ کا ترغیبی فرمان شہنشاہ کے آدمیوں کے سامنے چاک کر دیا، اور:۔

"جواب داد کہ این جنگ بلاتشبیہ بجنگ کربلا میماند عبدالرزاق امیدوار است کہ تا نفس باقی است درجرگہ بست و دو ہزار سوار کہ با امام بیعت نمودہ آخر تیغ بر روئے آن شہید کربلا کشیدند درنیاید بلکہ منجملہ ہفتاد و دو تن سرخروی دنیا و آخرت حاصل نماید۔" (خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۰۔

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۲۔

اور اگرچہ اس نے بہ مشکل اپنے کو گھوڑے پر سنبھالے رکھا لیکن گھوڑے کے اختیار میں تھا، اور خود گھوڑا جو زخموں سے کانپ رہا تھا سوار کو آہستہ آہستہ نگینہ باغ میں لایا، اور ایک پرانے ناریل کے درخت کے قریب کھڑا ہو گیا چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالرزاق اسی درخت کا ٹیکہ لیکر زمین پر گر پڑا تاکہ کچھ آرام لے دوسری صبح کو حسینی بیگ کے آدمی اتفاق سے وہاں پہنچ گئے۔ عبدالرزاق اور گھوڑے کی بعض علامتوں سے اس کو پہچان گئے اور اس کو اپنے گھر پہنچا دیا چنانچہ اس کے عزیز و اقارب نے اس کی مرہم پٹی کی[1]۔

مغلوں کا قلعے میں اچانک داخل ہونا بالکل خلاف توقع تھا، اس خبر سے تمام قلعے میں ایک ہلڑ مچ گئی اور ہر شخص ایک اضطراب میں نظر آ رہا تھا کیونکہ قطب شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ تھا۔ اس پرانی سلطنت کے ہمدرد یہ سمجھتے تھے کہ قطب شاہی سلطنت کے دن پھر نہیں پلٹ سکتے لیکن اس عالم اضطراب میں ابوالحسن قطب شاہ سے جو غیر معمولی خاطر جمعی اور استقلال کے جذبات ظاہر ہوئے وہ قطب شاہی تاریخ کے بہت دلچسپ اور سبق آموز واقعے تھے کسی اور تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ چونکہ تین بجے شب کو مغل فوج قلعے میں داخل ہو گئی تھی تو ظاہر ہے کہ اس وقت بادشاہ سو رہے تھے، جب ان کو قلعہ فتح ہونے کی خبر ملی تو یہ اٹھے اور پہلے اندر جاکر محل والوں کو دلاسا دیا کہ وہ پریشان نہ ہوں اور سب سے رخصت چاہی اور پھر پورے اطمینان قلب کے ساتھ وہ اپنے شاہانہ لباس میں دیوان خاص میں آئے اور حسب عادت اپنی مسند پر بیٹھ گئے اور ان ناخواندہ مہمانوں کا انتظار کرنے لگے جو ان کو گرفتار کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ اور آخر وقت تک اپنی بادشاہی کے پورے فرائض ادا کیے گویا حکومت کا جائزہ دینے تک وہ سلطنت کے بادشاہ تھے[2]۔ اس پر طرہ یہ کہ ملازمین سے کہا گیا تھا کہ جب ناشتے کا

---

[1] ۔ خافی خاں جلد سوم ص ۳۶۳۔

[2] ماہ نامہ کا مولف بیان کرتا ہے کہ جب مغل فوج قلعے میں داخل ہوئی تو ابوالحسن گانا سن رہا تھا (ماہ نامہ ص ۱۴۶) اور ایشور داس کہتا ہے کہ ابوالحسن گانا سن رہا تھا، اور جب قلعے میں شور ہوا تو گائین خاموش ہو گئے تو ابوالحسن نے

وقت ہو تو حسب معمول کھانا لائیں، چنانچہ بادشاہ کے حکم کے مطابق شاہی دسترخوان چُن دیا گیا۔ اسی دوران میں مختار خاں اور روح اللہ خاں اور دیگر مغل افسر ابوالحسن کو لینے کے لیے آ گئے، جب یہ لوگ سامنے آئے تو بادشاہ نے سبقت کر کے پہلے سلام علیک کہا، لیکن اپنی مسند پر بیٹھے رہے اور شاہانہ وقار میں کوئی فرق آنے نہیں دیا، اور جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے بیٹھ گئے تو ان کے ساتھ نہایت گرم جوشی سے گفتگو ہونے لگی جس میں کافی فصاحت بھی تھی، ابوالحسن کے خدوخال اور بیان سے ذرّہ برابر انتشار نہیں ظاہر ہوا، جب صبح ہوئی تو ملازمین نے دسترخوان کے تیار ہونے کی اطلاع دی تو بادشاہ کھانے کے لیے اُٹھے اور ان مغل اُمراء کو بھی دعوت دی کہ وہ کھانے میں شریک ہوں۔ بعضوں نے پس و پیش کیا، لیکن مختار خاں اور اس کے ساتھی دو ایک اور آدمی کھانے میں شریک ہو گئے، چنانچہ مہمانوں کے ساتھ میزبان نے پورے اطمینان کے ساتھ کھایا۔ روح اللہ خاں کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی حیرت چھپا نہیں سکا، چنانچہ اس نے بادشاہ سے پوچھا کہ یہ کھانا کھانے کا وقت کونسا ہے؟ ابوالحسن نے اس حیرت کو نہیں سمجھا، یا جان بوجھ کر یہ جواب دیا کہ میرے کھانے کا وقت یہی ہے؛ روح اللہ خاں نے کہا یہ صحیح ہے کہ آپ ہمیشہ اسی وقت کھانا کھاتے ہیں لیکن اس پریشانی میں آپ کی طبیعت کھانے کی طرف کیونکر مائل ہوئی؟ ابوالحسن نے نہایت ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ آپ کا کہنا اس طرح درست ہے کہ اس پریشانی میں کوئی کھانا نہیں کھاتا لیکن میرا حال بالکل دوسرا ہے میں راضی بہ رضا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قدرت کا فیصلہ حسب مصلحت ہوتا ہے خدائے تعالیٰ اپنی مصلحت سے ایک شخص کو بادشاہ اور دوسرے کو فقیر بنا دیتا ہے۔ جس خدا نے مجھے اور میرے بزرگوں کو بادشاہ بنایا، اور عزت دی تھی وہ مجھ سے اب سلب کر لینا چاہتا ہے۔ بادشاہ ہونے سے پہلے میرے پندرہ[۱۵] سولہ[۱۶] سال فقیری میں گزرے اور اب بھی خدا کا منشا یہ ہے کہ میں فقیر بن جاؤں،

کہا گیا ہے جا، جو لحظہ مسرت میں صرف ہو اچھا ہے (تاریخ اورنگ زیب، جادو ناتھ سرکار جلد چہارم ص ۲۸۶)۔ لیکن تین بجے شب کے کھانا ہونا خلاف قیاس ہے۔

اس کے لیے میں بالکل تیار ہوں اور میرے دل میں کوئی ہوس باقی نہیں اور میں خوش ہوں کہ اس سلطنت کی باگ جو اب تک میرے ہاتھ میں تھی عالمگیر جیسے دین دار بادشاہ کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے ؎

سر ارادت ما و آستان حضرت دوست — کہ ہر چہ بر سر ما می رود ارادت اوست

اس کے بعد بادشاہ نے گھوڑا منگوایا، اور اپنے شاہانہ لباس کے ساتھ سوار ہو گئے[1] اور مغل افسروں کے ساتھ دروازے کے باہر آ گئے جہاں محمد اعظم انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت قلعے میں واویلا مچی ہوئی تھی اور عورتیں و مرد بادشاہ کو جاتا ہوا دیکھ کر دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ جب مغل افسر بادشاہ کو محمد اعظم شاہ کے پاس لے گئے تو ابوالحسن نے موتیوں کا ہار اپنے گلے سے نکال کر محمد اعظم کے گلے میں ڈال دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمد اعظم نے ابوالحسن کی خاص مدارات کی اور ان کو شہنشاہ اورنگ زیب کے سامنے پیش کر دیا[2]، شہنشاہ نے اس کی

---

[1] ماہ نامہ کا مولف کہتا ہے کہ ابوالحسن، مہابت خاں کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھ کر گیا تھا جب یہ فتح دروازے کے باہر نکلا تو حضرت شاہ راجُو کی درگاہ کی طرف سجدے کرنے لگا، اس پر مہابت خاں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ ابوالحسن نے جواب دیا کہ حضرت راجُو نے ہی میرے سر پر تاج شاہی رکھا تھا، اور وہ اب دوسرے کے سر پر رکھنا چاہتے ہیں اس لیے شکریہ ادا کر رہا ہوں (ماہ نامہ ص ۳۱۹)۔

[2] شہنشاہ کا درباری مورخ محمد ساقی کہتا ہے کہ شہنشاہ نے ابوالحسن کے تمام قصور معاف کر دیے اور بہت مہربانی کی اور ایک خیمے میں ٹھیرانے کا حکم دیا۔ یہی مورخ لکھتا ہے کہ جب ابوالحسن شہنشاہ کے سامنے آیا تو یہ شعر پڑھا تھا ؎

آخر مرا بہ خاکِ درت روشناس کرد — منت گذار سجدۂ پیشانی خودم (مآثر عالمگیری ص ۳۰۰)

لیکن ایلیشورداس کہتا ہے کہ ابوالحسن کو فیروز جنگ نے تخت سے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا، اور شہنشاہ کے سامنے لے گیا، اور ابوالحسن شہنشاہ کے سامنے سیدھا آیا، کوئی کورنش یا سلام نہیں کیا۔ شہنشاہ نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟

عزت کی اور دلاسا دیا، اور اس کی تمام ضروریات مہیا کر دیں اور شاہی کیمپ میں ٹھیرنے کا حکم دیا[1]۔ روح اللہ خاں اور دوسرے متصدیوں نے قلعے کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا، اور اس کی فہرست تیار کی۔ اس کی جملہ مالیت جواہر و آلات مرصع، ظروف طلا کے علاوہ چھ کروڑ اسی لاکھ دس ہزار روپیے تھی۔ یہ سب چیزیں شاہی خزانے میں داخل کر لی گئیں[2]۔ اس سلطنت کے بے شمار لوگ ملازم اور عہدہ دار و پیشہ ور مغل ملازمت میں داخل ہو گئے، ان سب کو خطابات اور مناصب ملے۔ ابوالحسن کے بیٹوں کو مناصب دیے گئے اور بیٹیوں کی شادی کا انتظام کیا گیا[3]۔ عبدالرزاق لاری مصطفےٰ خاں کی وفاداری سے شہنشاہ بہت متاثر ہوئے اور اس کے علاج کے لیے

اس پر اس نے جواب دیا کہ مجھے خوشی ہے نہ رنج۔ بلکہ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ جو چیز یہاں پردۂ غیب میں چھپی ہوئی تھی وہ آنکھوں کے سامنے آگئی۔ (تاریخ اورنگ زیب جلد چہارم ص ۳۸۶)۔

[1] منوچی کہتا ہے کہ ابوالحسن قید کر دیا گیا تھا، اس کو ہاتھی پر بٹھا کر پہلے اعظم کے خیمے پر لے گئے، شہزادہ اعظم سو رہا تھا، اس کے بیدار ہونے تک اس کو دھوپ میں کھڑا رکھا گیا، اور بڑی منت سماجت کے بعد پینے کے لیے پانی دیا گیا۔ اعظم نے مہربانی کر کے اس کو اپنے سامنے بٹھایا، اور شہنشاہ کے پاس لے گیا۔ اعظم تو خود اندر گیا لیکن اس کو بہت دیر تک دھوپ میں کھڑا کر دیا، اس کے بعد اورنگ زیب نے اس کو قید خانے میں رکھنے کا حکم دیا، اور اس سے دریافت کیا کہ اس کے خزانے کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے سب خرچ کر دیے ہیں اور مجھے اس کا حق تھا! اس گستاخی پر شہنشاہ نے اس کو مارنے کا حکم دیا، چنانچہ مغل عہدہ داروں نے اس کو بے رحمی سے پیٹا اور پھر اس کو دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا (منوچی جلد دوم ص ۳۰۷-۳۰۸)۔

[2] خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۷۔

[3] محمد ساقی نے ایک بیٹے کا نام عبداللہ پسر خواندہ ابوالحسن بیان کیا ہے، اس کو چار ہزاری منصب و چار ہزار سوار دیے گئے تھے (مآثر عالمگیری ص ۳۰۳) غالباً یہ کوئی دوسرا شخص تھا لیکن ابوالحسن کا ایک صلبی بیٹا بھی تھا

ہندوستانی اور یوروپی جرّاح مقرر کیے[1] اور یہ کہا کہ "اگر قلعے میں اس کے جیسا ایک اور شخص وفادار ہوتا تو قلعہ فتح کا ناممکن تھا۔" پندرہ روز کے علاج کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور لکنت سے گفتگو کرنے لگا جب شہنشاہ کو اس کی صحت کا اطلاع ہوئی تو اس کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم تمھارے قصور معاف کرتے ہیں، تم کو اور تمھارے بیٹوں کو منصب اور اعزاز دیے جائیں گے، لیکن جب عبدالرزاق کو یہ پیغام پہنچایا گیا تو اس نے مغل سلطنت کی نوکری سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کے بیٹے عبدالقادر۔ عبدالکریم۔ رزاق علی اور خلیل محمد مختلف مناصب سے سرفراز ہوئے اور اورنگ آباد میں ان کو جاگیریں دی گئی تھیں[2]۔

جس کا نام خدا بندہ یا بندہ سلطان بتایا جاتا ہے یہ دولت آباد کی نظربندی کے زمانے میں پیدا ہوا تھا، جب یہ سنِ شعور کو پہنچا تو شہنشاہ کے دربار میں اس کی آمد و رفت ہونے لگی چونکہ یہ قطب شاہی تاجدار کا بیٹا تھا اس لیے پرانے قطب شاہی ملازم دربار میں اس کی تعظیم کرتے تھے اور جب یہ دربار میں آتا اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس نظارے سے شہنشاہ بہت خائف ہوئے اور اس کو ایک نامعلوم جگہ نظربند کر دیا، اس کا پھر پتا نہیں چلا۔ (حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۱۴۴) اس بیٹے کے علاوہ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں جو قلعۂ گولکنڈہ کی فتح سے پہلے سنِ شعور کو پہنچ گئی تھیں، شہنشاہ نے ان تینوں کی شادیاں کر دیں۔ بڑی بیٹی سکندر عادل شاہ کے ساتھ بیاہی گئی جو غالباً اچھا سنجوگ تھا۔ دوسری بیٹی محمد عمر کے ساتھ جو شیخ محمد نقشبندی سہرندی کا بیٹا تھا، اور تیسری بیٹی عنایت خاں ولد جملۃ الملک اسد خاں کے ساتھ بیاہی گئی (مآثر عالمگیری ص ۳۱۲)۔

[1] جرّاحوں نے رپورٹ دی تھی کہ اس کے سر پر زخموں کی گنتی کرنا بہت مشکل ہے ویسے ستّر زخم معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایک آنکھ زخم سے محفوظ ہے لیکن شاید بعد کو دونوں آنکھ بیکار ہو جائیں (خافی خاں جلد دوم ص ۳۱۶)۔

[2] جب شہنشاہ کا پیغام پہنچا تو عبدالرزاق لاری نے اپنے بستر علالت پر یہ الفاظ کہے تھے:۔

"ہر چند این سخت جاں تا حال بر نیامدہ اما امید حیات بدیں حال معلوم۔ اگر حیات

۲۴ ذیقعدہ ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۷ء کو مغل فوج قلعے میں داخل ہوئی تھی لیکن تمام تسخیر مکمل ہونے تک محرم کا مہینہ شروع ہو گیا، اس لیے گولکنڈے کا خاتمہ ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۶ء کا واقعہ سمجھنا چاہیئے چنانچہ میر عبدالکریم نے جس کا ملتفت خاں خطاب تھا "فتح گولکنڈہ مبارک باد" سے اس واقعے کی تاریخ اخذ کی تھی اس سے یہی سنہ مستخرج ہوتا ہے. نعمت خان عالی نے ذیل کے قطعے سے اس واقعے کی تاریخ نکالی تھی:-

قطعہ

ابو الحسن داشت جامہ چار محل	کرد بیرون ازان مکان تقدیر
چون برون رفت او بجاش نشست	شاہ اورنگ زیب عالمگیر

قلعۂ گولکنڈہ سے فارغ ہونے کے بعد شہنشاہ، محرم ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں شہر حیدر آباد آئے، تمام شہر اور شاہی عمارتوں کا

ہم شد بدست و پائے مجروح تقدیم مراسم نوکری ہم نہ توانم کسے کہ گوشت و پوست او
بہ نمک ابوالحسن پرورش یافتہ باشد نوکری عالمگیر بادشاہ نتواند نمود "

اس سے شہنشاہ خفا ہوئے، لیکن حکم دیا کہ جب پوری صحت ہو جائے تو مجھے اطلاع کرنا. جب صحت کے بعد قبول منصب کی بابت کہا گیا تو پھر اس نے یہی جواب دیا، اور حجاز جانے کی خواہش کی، اس بات سے شہنشاہ بہت خفا ہوئے اور حکم دیا کہ اس کو مقید کر کے میرے ہاں پہنچایا جائے، فیروز جنگ نے بیچ بچاؤ کر کے ادھر عبدالرزاق لاری کو سمجھایا کہ وہ مان جائے اور اُدھر شہنشاہ کے پاس سفارش کی. چنانچہ ایک سال بعد وہ قبول منصب کے لیے بڑی مشکل سے راضی ہوا، اور چار ہزاری منصب، تین ہزار سوار، خان کا خطاب، گھوڑا، اور ہاتھی عطا ہوئے. پہلے راہیری کی اور بعد کوکن کی فوجداری دی گئی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دل سے نوکری نہیں کی، چند سال کے بعد اصرار کر کے حج بیت اللہ کی رخصت لے لی اور وہاں سے واپس نہیں آیا. انگریزی شاعروں نے اس کی وفاداری کی تعریف میں نظمیں لکھی ہیں (ماثر الامرا جلد دوم ص ۸۲۰ - ۸۲۱. خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۶ - ۳۶۷)-

معاینہ کیا[۱]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ قطب شاہی تمدن اور معاشرت کے نظارے سے بہت متاثر ہوئے[۲]۔ گو بظاہر اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ کہیں غیظ و غضب کا اظہار کر دیا تاکہ شاہی تمکنت ہاتھ سے نہ جائے، اور یہاں کی آب و ہوا اس قدر خوشگوار و طبیعت کے موافق ثابت ہوئی کہ اس شہر میں دو۲ مہینے سے زیادہ رہ گئے اور یکم ربیع الاول ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء کو بادل ناخواستہ بیجاپور کے ارادے سے کوچ کیا[۳]۔ کیونکہ مرہٹوں کی سرکوبی ناگزیر تھی۔ لیکن جانے سے پہلے حیدرآباد کے تمام ضروری بندوبست کیے اور اس کا نام "دارالجہاد" رکھا۔ پہلے عارضی طور پر روح اللہ خاں اس کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، لیکن چند روز کے بعد جاں سپار خاں کو جس کا اصل نام سید بہادر دل خاں تھا، اس خدمت کا مستقل جائزہ دے دیا گیا۔ شہنشاہ کے اس سفر میں جو حیدرآباد سے شروع ہوا تھا، ابوالحسن بھی ہمراہ رکاب تھا، لیکن جب شہنشاہ بیدر پہنچے تو اس نے مجبوراً درخواست کی کہ مجھے کسی جگہ گوشہ نشینی کی اجازت دی جائے[۴]، چنانچہ اس درخواست پر اس کے لیے قلعۂ دولت آباد تجویز ہوا،

---

[۱]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چار مینار کے مشرقی گوشے میں جہاں جامع مسجد کا حمام واقع ہے شہنشاہی خیمہ نصب ہوا تھا، یہیں شہنشاہ نے سکونت اختیار کی۔

[۲]۔ درباری مورخ نے شہر حیدرآباد کی بہت بلند الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً شہنشاہ کے بھی یہی تاثرات تھے، کیونکہ محمد ساقی جو درباری مورخ ہے کوئی چیز شہنشاہ کے نقطۂ خیال کے خلاف نہیں بیان کرتا۔

[۳]۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۷ - ۳۰۸۔ خافی خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ نے ربیع الثانی کے اوائل میں حیدرآباد سے کوچ کیا تھا۔ اس طرح ان کا قیام حیدرآباد میں تین۳ ماہ کے قریب ہوتا ہے (خافی خاں جلد دوم ص ۳۷۱)۔

[۴]۔ محمد ساقی کہتا ہے کہ ابوالحسن اس قدر تن آسان آدمی تھا کہ "در پانزدہ سالہ حکومت سفر گزین نشدہ و سواری ہر روزہ بر دو دشوار بود" (مآثر عالمگیری ص ۳۰۹)۔ یہ صحیح نہیں ہے، غالباً اس کی خودداری اس

اور جاں سپار خاں کو حکم ہوا کہ وہ ابوالحسن کو دولت آباد میں پہنچا دے۔ غالباً ایک محافظ دستے کے ساتھ اس مظلوم بادشاہ کو قلعے میں نظر بند کر دیا گیا تاکہ وہ یہاں اپنے باقی ایام حیات گذارے۔ گو اس کی تمام ضروریات کا انتظام ہوا، اور بہ قول خافی خاں تاکیدی احکام نافذ ہوئے[1] کہ ابوالحسن کی تمام ضروریات خور و نوش وغیرہ کا خاطر خواہ بند و بست کیا جائے لیکن اس کی ضروریات کے لیے صرف پچاس ہزار روپیے سالانہ مقرر ہوئے تھے۔[2]

ان حالات میں آخر قطب شاہوں کی دو سو سالہ سلطنت ختم ہو گئی اور آثارِ قدیمہ کے سوا ان کا کوئی تسمہ لگا نہیں رہا۔ آج پچاس سال سے مغل شہنشاہت اس کی بیخ کنی کے درپے تھی، غالباً پہلے اس کا خاتمہ آسان معلوم ہوتا ہوگا، لیکن آخری محاصرے میں معلوم ہوا کہ اس سلطنت کا استیصال مغلوں کے لیے بہت دشوار گزار ہے اور دُنیا کے مشہور محاصروں میں اس کا شمار ہونا چاہیئے۔ مغلوں کی تاریخ میں قلعۂ اسیر گڈھ کے بعد گولکنڈے کا درجہ ہے جو بہت صبر آزما ثابت ہوا۔ کیونکہ اس قلعے کی تسخیر میں بھی آٹھ مہینے لگ گئے جس طرح اکبر کو اسیر گڈھ کی

بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہمیشہ شہنشاہ کے جلوس کے ساتھ منسلک رہے، اسی لیے گوشہ نشینی کی اجازت چاہی تھی۔

[1] ۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۷۱۔

[2] ۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۹۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ابوالحسن کے ساتھ اس قدر تنگ نظری سے کیوں کام لیا گیا۔ کیونکہ جب کچھ مہینے پہلے بیجاپور کی سلطنت فتح ہوئی تھی تو سکندر عادل شاہ کو خلعت خاصہ خنجر مرصع با علاقہ مروارید۔ پھول کٹارہ قیمت ہفت ہزار روپیہ۔ مالائے مروارید بہ آویزہ زمرد قیمت سیزدہ ہزار روپیہ۔ کلغی و عصائے مرصع۔ سکندر خاں خطاب و ایک لاکھ روپیے سالانہ عطا ہوئے دوسری مرتبہ سرپیچ الماس مرحمت ہوئے تھے اور اس کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت ملی تھی، اس کے خاص ملازم اور عزیز و اقارب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی۔ (مآثر عالمگیری ص ۲۸۰)۔

مگر وامن گیر تھی اور وہ اس کی ناکامی کو اپنے لیے ایک بدنما داغ سمجھتا تھا کچھ اسی طرح گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے اورنگ زیب کا حال تھا کیونکہ محاصرے کی پیہم ناکامیوں میں جو مغل محاصرین کو برداشت کرنی پڑیں مغل سلطنت کے وقار اور نیک نامی کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ قطب شاہی قوت مدافعت مغلوں سے کم نہیں تھی، بادشاہ کی حوصلہ مندی ہر وقت محصورین کا دل بڑھاتی رہی۔ خود شہنشاہ کے الفاظ میں اگر عبدالرزاق لاری کی طرح دو ایک آدمی قلعے میں اور ہوتے تو قلعہ فتح کرنا ناممکن تھا اور قلعہ کشائی بھی کچھ مغلوں کے زور بازو سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی باعث عبداللہ خاں اپنی کی بے وفائی تھی جس نے اپنے ولی نعمت کے خلاف غداری کر کے دشمن کے سامنے دروازے کھول دیے ورنہ آٹھ مہینوں کے دوران میں بار بار ایسے مواقع آئے تھے جبکہ مغل فوجوں نے ہار مان لی اور ان مصیبتوں سے تنگ آکر خود مغل سپاہی قطب شاہی حکومت کی پناہ میں جا رہے تھے۔ شہنشاہ نے بھی اس بات پر غور کیا تھا کہ قلعے کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

قلعۂ گولکنڈے کی تسخیر میں کوئی عافیت اندیشی نہ تھی کیونکہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی فتح سے مغل سلطنت کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اُلٹے اس کا نقصان ہی ہوا کیونکہ جیسے بیان کیا جاتا ہے اگر ان سلطنتوں کے خاتمے سے مغل شہنشاہ کا یہ مقصد تھا کہ مرہٹوں کا استیصال کرے تو وہ پورا نہیں ہوا کیونکہ باوجود اورنگ زیب کی تمام کشش کوشش کے گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کا خاتمہ تو ہو گیا مگر مرہٹوں کی طاقت جوں کی توں رہی، بلکہ غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اورنگ زیب کے بعد مرہٹہ طاقت اس قدر اُبھری کہ جنوب سے نکل کر شمال پر بھی چھا گئی اور مغل سلطنت کے اسباب زوال میں بھی یہ شریک تھی، کیونکہ ان سلطنتوں کے بے روزگار سپاہی یا تو پنڈاروں میں شریک ہو گئے یا مرہٹوں کی فوج میں داخل ہو گئے اس سے زیادہ مغل سلطنت کی اور کیا ناکامی ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر مغل شہنشاہیت ان سلطنتوں کو قایم رکھتی اور مرہٹوں کے استیصال کے لیے ان سلطنتوں سے اتحاد عمل کرتی تو قرائن یہ ہیں کہ یہ طریقۂ عمل زیادہ مفید مطلب ہوتا، بلکہ اس طریقے سے دکن کی یہ سلطنتیں مغلوں کے ساتھ متحد رہتیں اور ظاہر ہے کہ مرہٹوں کو ان سے کوئی امداد نہیں

ملتی اور شمال وجنوب کی متحدہ طاقت آسانی سے مرہٹوں کا خاتمہ کر سکتی تھی چنانچہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد حکومت میں یہ اتحاد عمل ہوا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ جے سنگھ کے دکن آنے سے پہلے اورنگ زیب نے مرہٹوں کے خلاف بیجاپور سے مدد طلب کی تھی اور علی عادل شاہ نے اِس صدا پر لبیک کہا تھا، کیونکہ سیواجی جس طرح مغلوں کا دشمن تھا اسی طرح دکن کی اسلامی سلطنتوں کا بھی حریف تھا اور انھیں کو تباہ کر کے اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ مغل شہنشاہیت نے وقت پر بیجاپور کے تعاون سے فائدہ تو اُٹھایا، اور اس کی مدد سے شکست دی لیکن اُلٹے سیواجی سے اتحاد کر کے اسی سلطنت کے سر ہوگئی اس بداخلاقی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سلطنتوں کو اب آیندہ مغلوں کی سرپرستی پر کوئی اعتماد نہیں رہا، اور اس کی جگہ وہ باوجود نقصانات کے مرہٹوں کو اپنا ہمدرد سمجھنے کے لیے مجبور تھیں کیونکہ مرہٹے آخر دکن کی طاقت تھی، اور ان سے دکن کی ایک برادری بن جاتی مغل سلطنت نے ان عواقب پر قطعاً غور نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر اورنگ زیب کا ایک جذباتی مسلک بن گیا تھا اور یہ آج سے نہیں بلکہ اپنی شہزادگی کے زمانے سے جبکہ یہ دکن کے ناظم تھے ان سلطنتوں کو ہضم کرنا چاہتے تھے۔ گولکنڈے سے تو ہمیشہ شہنشاہ کو زیادہ نفرت رہی۔ بیجاپور کے ساتھ ہمیشہ رعایت کی گئی، برخلاف اس کے گولکنڈے کے ساتھ بہت غیظ وغضب کا اظہار کیا گیا۔ اس کا نام "دارالجہاد" رکھا، حالانکہ یہ ایک اسلامی سلطنت تھی دارالکفر نہ تھا جو قاضی شیخ الاسلام اور قاضی عبداللہ کے فتوے سے ظاہر ہے۔ خود ابوالحسن کے ساتھ بھی جو برتاؤ کیا گیا تھا وہ قابل غور ہے۔

گولکنڈے اور بیجاپور کی تسخیر سے مغل سلطنت کو نقصان پہنچا ہی تھا لیکن دکن کو بھی ناقابلِ تلافی ضرب لگی، اس کے تمدن کی رفتار ترقی بہت دنوں تک رُکی رہی بلکہ دکن کے بعض اقطاع تو ہمیشہ کے لیے بے چراغ ہوگئے۔ قطب شاہوں نے تلنگانے میں جو تمدن پیدا کیا تھا، اس کا بُری طرح شیرازہ بکھر گیا شاہ عالم کے حملے میں شہر حیدرآباد کی اس قدر افسوسناک تاخت وتاراج ہوئی کہ تمام قطب شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔ مغل قبضے کے بعد بھی شاہی محلات کی خاطرخواہ نگہداشت نہیں کی گئی، چنانچہ یہ سب بربادی کے نذر ہوگئے۔

مغل فاتح یہاں سے لاکھوں روپیے، زر و جواہر تو لے گئے لیکن قطب شاہی عمارتوں کو برباد ہونے دیا۔ اس وقت حیدرآباد اور اس کے گرد و نواح میں قطب شاہی مساجد کے سوا کسی محل کا پتا نہیں چلتا حالانکہ مختلف بادشاہوں کے بنائے ہوئے بے شمار محل تھے۔ داد محل گگن محل اور چار محل کے نام تو اہل حیدرآباد کو یاد ہیں لیکن ان کا کہیں نام و نشان نہیں۔ داد محل کو جس کی تمام ایشیا میں شہرت تھی، دانستہ توڑا گیا معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے قبضے کے بعد جو مغل گورنر یہاں مامور ہوئے تھے انھوں نے ان کی نگہداشت کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے علاوہ گولکنڈے کی آبادی بھی جس میں امیر و غریب دونوں شامل تھے بہت گھٹ گئی۔ شاہی محل کی صدہا عورتوں نے اپنے کو باولیوں میں گرا کر خودکشی کر لی۔ قلعے کے بے شمار حبشی پہرہ دار تہ تیغ ہوگئے[1]۔ شہر حیدرآباد کے صدہا شرفا، اور اہل علم جن میں زیادہ تر مسلمان تھے اور گولکنڈے کی سرکار سے فیض پاتے تھے اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا، اور کرناٹک کے جنوبی قصبات میں جا کر آباد ہوگئے، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی محلات کے علاوہ سینکڑوں گھر ویران ہوگئے اور آفات سماوی سے منہدم ہوگئے۔ چنانچہ یہ شہر ایسا بے چراغ ہوگیا کہ حضرت غفراں مآب نواب نظام علی خاں کے عہد تک جنھوں نے بالآخر اورنگ کو چھوڑ کر حیدرآباد کو اپنا پائے تخت بنا لیا، آباد نہیں ہوا لیکن بہ قول لچھمی نارائن شفیق آصف جاہی سرپرستی کے باوجود اس کی ویرانی کے آثار باقی تھے[2]۔ ویران مکانوں میں آبادی نہیں ہوئی کیونکہ بہت سے خاندان

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ قلعے کے مشرقی دروازے پر تقریباً پانچسو حبشیوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ جب قلعہ فتح ہوگیا اور مغل فوج مشرقی دروازے سے آنے لگی تو ان حبشیوں نے مزاحمت کی، ان وفاداروں نے کہا کہ جب تک ان کو قتل نہیں کیا جائے گا وہ اپنی جگہ سے قدم نہیں اٹھائیں گے، چنانچہ یہ سب اپنی وفاداری میں تہ تیغ ہوگئے۔

[2] لچھمی نارائن شفیق نے آصف جاہی دور میں دکن کا اس طرح نقشہ کھینچا تھا:—

"بیجاپور۔ برہان پور و بیدر ہر پنج بلدہ نامی کہ سابق تخت گاہ سلاطین دکن بودند الحال کمال خستگی دارند ...... مگر حیدرآباد درین ایام بنا بر چھاونی متواترہ

واپس نہیں آئے۔ نعمت خان عالی کے پُر درد مرثیے سے جس میں حیدر آباد کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مرثیہ اس وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ایک فاتح کے قلم سے نکلا ہے۔ نعمت خاں نے اس میں اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ اس کی اہمیت غالباً وہی ہے جو شیخ سعدیؒ کے مرثیے کی ہے جو زوال بغداد پر لکھا گیا تھا۔ جہاں فتح گولکنڈے کی مبارک بادیں قصیدۂ تہنیت لکھے جا رہے تھے نعمت خاں نے اپنے سچے جذبات کا اظہار کیا ہے گو وہ فاتح فوج کے ساتھ قلعے کی تسخیر کے لیے آیا تھا:-

قصیدہ شہر آشوب

درین مُلکِ خراب امروز کس را نیست سامانے — چو گنج افتادہ اند اہلِ ہنر در کنجِ ویرانے

بہ آن حد رسیدہ خلق را افلاس و ناداری — کہ معنی ہم ندارد این زمان حرفِ سخندانے

سپاہی ہم بہ میدانِ قناعت می کند جولاں — ز شمشیر و سپر دارد دمِ آبے لبِ نانے

رسیدہ پان سپاری کار بے برگی و تنبولی — برائے سُرخ روی چون ندارد بیڑۂ پانے

تنور آسا بہ خاکستر نشستہ نانبا این غم — کہ از افتادن نان بر سرش افتاد تاوانے

"رئیس از سی سال رونقے تازہ دارد و گذرگاہ مردم امصار دور دست است ....

با وصف گذرگاہ عالم مردم از آفاق اکثر جا ویران است۔ پیش ازین چند سال سہ لک و چہار ہزار منزل از پختہ و سفال پوش عمرہ بودند ... الحال ازآن آبادی پدید نیست۔ مگر جا با سنگہائے آن افتادہ اند۔ ہرگاہ وادمحل راشکستند۔ در عرصہ سی سال بہ شکست رسید ... اکثر عمارات عمدہ شہر تباہ شد ہنوز تہ خانہ ہائے آن بعضے قائم"۔ (حوالہ حیدرآباد جیمی از ابن شفیق)

دریں لشکر بمانم یار وم با خویش می سنجد نماندہ در دکان بقال را جز سنگ میزانے

یکے گفتہ خداوندا الحق نوح پیغمبر
برائے قلعۂ گولکنڈہ کن ایجاد طوفانے[1]

اس کے علاوہ ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ قطب شاہی سلطنت کی تباہی سے مشرقی ساحلوں پر مغربی کمپنیوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقعہ مل گیا کیونکہ مغل شہنشاہت کارومنڈل پر اپنا اثر ڈالنے سے قاصر تھی اور قطب شاہی حکومت پورے طور پر اثر انداز تھی اور اس کے ہوتے ہوئے انگریز و فرانسیسی، ولندیزی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

نظر بندی کے بعد ابوالحسن کا پھر نام نہیں سنائی دیا، اپنی زندگی کے آخری چودہ سال اس نے قلعۂ دولت آباد کی چار دیواری میں گزارے[2]۔ ایک بادشاہ کے لیے جس نے تلنگانہ جیسی وسیع سلطنت پر پندرہ سال فرماں روائی کی ہو، نظر بندی میں گزارنا کتنا مشکل تھا۔ ۱۱۱۱ھ میں دولت آباد کے قلعے میں

[1] وقائع گولکنڈہ نعمت خان عالی۔

[2] منوچی لکھتا ہے کہ مرہٹوں نے ابوالحسن کو قلعے سے رہا کر کے پھر بادشاہ بنانے کی سازش کی تھی، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ جب اورنگ زیب کو اس کا پتا چلا تو اس نے ابوالحسن کو قلعۂ دولت آباد سے نکال کر قلعۂ گوالیار میں نظر بند کر دیا، اور وہیں اس کا انتقال ہوا (منوچی جلد دوم ص ۱۹۳)۔ لیکن مقامی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ غالباً وہ دولت آباد سے منتقل نہیں کیا گیا، اسی قید میں اس کے ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کا نام خدا بندہ یا بندہ سلطان بتایا جاتا ہے۔



مقابر سلاطین قطب شاهی



مقبره تاناشاه

ان کا انتقال ہوا، اور خلد آباد کی پُرسکون فضا میں یہ پیوند خاک کر دیے گئے[1]۔ ابوالحسن کے متعلق صحیح رائے قایم کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ اس کی خانگی اور سیاسی زندگی بے سروپا الزامات کی وجہ سے جس میں مغلوں کی اشتہار بازی کو بہت بڑا دخل ہے، ایک رازِ سربستہ ہو کر رہ گئی ہے، کیونکہ شہنشاہ کی نظر میں اس کی اتنی برائیاں تھیں جو احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی تھیں۔ درباری مورخ محمد ساقی جو شہنشاہ کا عین ہمخیال ہے اس کو "ابوالحسن سفیہ بوالہوس" کے قبیح الفاظ سے یاد کرتا ہے اور شہنشاہ سے زیادہ اس کی برائیاں گناتا ہے[2]۔ خافی خاں نے اس کو "ابوالحسن قبیح کردار" لکھا ہے[3]۔ ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن میں کوئی انسانی خوبی نہ تھی بلکہ وہ از سرتاپا برائیوں میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ وہ بہ ظاہر کسی ہمدردانہ ذکرِ خیر کا مستحق نہیں ہے[4]۔ ان برائیوں کے علاوہ کہ اس نے مادنا کو وزیر بنا کر اسلام کو ذلیل کر رکھا تھا، اور سنبھاجی کی مدد کرتا تھا "فسق و فجور" کو علانیہ ملک میں رائج کر دیا تھا اور خود "در انواع کبائر روز و شب مستغرق" تھا، اور تمام اہلِ ملک بھی انھیں برائیوں میں مبتلا تھے۔

اگرچہ اس زمانے کی کوئی مقامی تاریخ دستیاب نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے صحیح حقیقت کا پتا چلانا بہت مشکل ہے، لیکن اس کے برخلاف مغل مورخوں کے بیانات بھی صداقت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے چونکہ مغل گولکنڈے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتے تھے اس لیے اپنی دست درازی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے قطب شاہی سلطنت اور اس کے والی کو بدنام کرنا ضروری سمجھتے تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ابوالحسن اس قدر بے مایہ آدمی

---

[1] ابوالحسن کے انتقال کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ حدیقۃ العالم کا مولف ۱۱۱۱ھ / ۱۶۹۹ء یا ۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۰ء کہتا ہے (حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۴۱۴)، بعض لوگ ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۲ء یا ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء بتاتے ہیں (منوچی جلد سوم ص ۱۹۳)۔

[2] عالمگیرنامہ ص ۲۸۵ - ۲۸۶۔ [3] خافی خاں جلد دوم ص ۳۴۲۔

[4] جو تاریخیں آصف جاہی دور میں لکھی گئی ہیں وہ بھی براہ راست مغل تاریخوں سے متاثر ہیں، ان میں بھی کوئی تحقیق نہیں کی گئی بلکہ اندھی تقلید ہوئی ہے۔

نہیں تھا جس طرح اس کو مغل تاریخیں پیش کرتی ہیں۔ سوائے اس بات کے کہ اس نے سنبھاجی سے اتحاد کر رکھا تھا[1]،
مغلوں کا کوئی الزام اس پر صحیح نہیں ثابت ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی سیاست کسی قدر کمزور تھی، اور
جن وزراء کو اس نے عنانِ حکومت سپرد کی تھی وہ بڑی حد تک اس کے مستحق نہ تھے، تاہم یہ عیاش آدمی نہیں تھا[2]
بلکہ اگر ایک مقامی تاریخ پر اعتماد کیا جائے تو یہ ایک ذی علم اور متقی آدمی تھا، اور اس نے کبھی مسکرات کا استعمال
نہیں کیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ابو الحسن، حضرت شاہ راجوؒ جیسے پیر طریقت کا مرید تھا تو اس کے متعلق قبیح افعال کا
اتہام لگانا صحیح نہیں ہے[3]۔ حضرت شاہ راجوؒ کا اخلاقی اور مذہبی اثر جس طرح اس کے بادشاہ ہونے سے پہلے تھا
بادشاہ ہونے کے بعد بھی رہا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بادشاہ ہونے کے بعد اس کی عقیدت مندی بہت بڑھ
گئی تھی اور اکثر وہ اپنے مرشد کے گھر پیدل جایا کرتا تھا جو اس شعر سے ظاہر ہے ؎

چل آیا ہے شاہ تیرے گھر شاہ راجوؒ

---

[1] اس اتحاد کے بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں ذمہ دار تھے۔ چونکہ خود مغلوں نے اتحاد کا کوئی موقعہ نہیں دیا تھا اس لیے
یہ سلطنتیں بالآخر مرہٹوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوگئیں کیونکہ یہ ایک دکنی طاقت تھی۔

[2] باہر کے سیاحوں نے بھی ابو الحسن کی خانگی زندگی سے متعلق اچھے خیالات ظاہر نہیں کیے۔ فرایر کہتا ہے کہ
"ابو الحسن مسلسل عیاشیوں میں غرق رہتا تھا، اور اس طریقے سے اس نے اپنے کو غفلت میں رکھنے کی کوشش کی"
فرایر جلد اول ص ۱۵۸۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اوائل حکومت میں سید مظفر کو دھوکا دینے کے لیے دانستہ
عیاش بننے کی کوشش کی تھی، دراصل وہ عیاش نہیں تھا۔

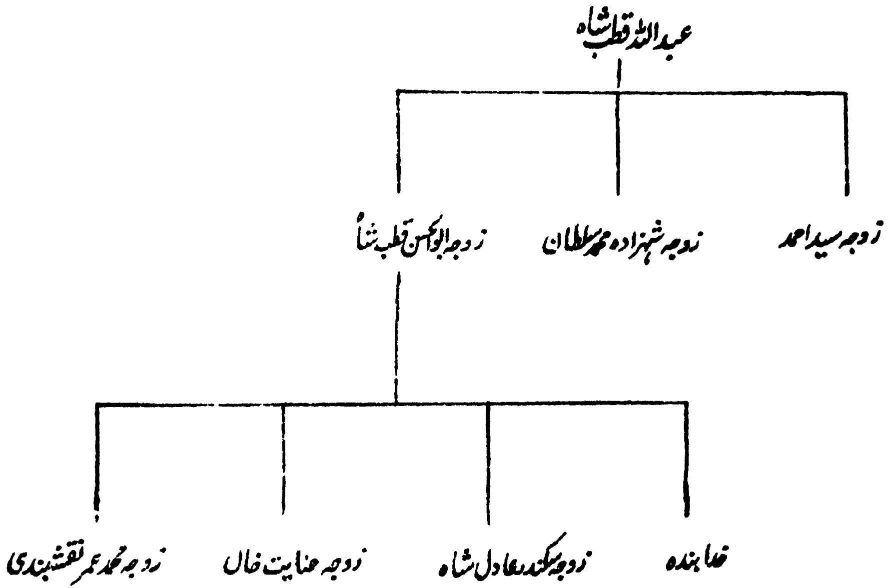
[3] "ماہ نامہ" کا مولف کہتا ہے کہ "ابو الحسن شب و روز بہ وظایف و خدمت گذاری فقرا می گذرانید"۔ اور
اگرچہ فقرا گانجہ وغیرہ پینے کے عادی ہوتے ہیں لیکن ابو الحسن نے کبھی اس کا شوق نہیں کیا، گو اس نے فقرا کے لیے
یہ چیزیں ضرور فراہم کی تھیں۔ (ماہ نامہ ص ۲۱۴)۔

اس کے علاوہ اپنے چودہ سالہ عہدِ حکومت میں اس نے خارجی اور داخلی مسلک میں جس بیدار مغزی اور انہماک سے کام کیا تھا، اس کی ایک عیاش آدمی سے کبھی توقع نہیں کی جا سکتی، نیز اس کی غیر متزلزل خودداری اور استقلال کے سبق آموز مظاہرے جو فتح گولکنڈے کے وقت ظاہر ہوئے تھے ان الزامات کی صریح تردید کر دیتے ہیں۔ یہ ایک عیاش آدمی کا کردار نہیں ہو سکتا، برخلاف اس کے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن ایک بڑا آدمی تھا، اور اگر اس کو موقعہ ملتا تو وہ ایک مدت تک دکن کی صحیح رہنمائی کرتا، اس میں ایک اچھا ذوق سلیم تھا۔ اس نے علم و فن اور فنونِ لطیفہ کی بھی خدمت کی ہے، اس کے دربار میں کئی شاعر و عالم تھے، اس انتشار کے زمانے میں بھی جبکہ اس کو ہمیشہ مغل سیلاب کا خدشہ لگا ہوا تھا لطیف عمارتیں بھی بنائی تھیں۔ منجملہ ان کے بعض عمارتیں اب تک موجود ہیں، اس کے لطیف ذوق کے تو حیدرآباد میں عجیب قصے مشہور ہیں، اگرچہ اس نے چودہ سال سے زیادہ حکومت نہیں کی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابوالحسن اپنے بلند کردار اور اوصاف کی وجہ سے تمام قطب شاہوں میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھا، اور کچھ اسی وجہ سے اس زمانے کے اہل الرائے اس قطب شاہی سلطنت کو بہت امید افزا سمجھتے تھے اور اس کی بقا کے آرزومند تھے۔ چنانچہ ایک ہمعصر مورخ نے ان الفاظ میں اپنی دلی تمنا کا اظہار کیا تھا:—

"بہ یمن تائیدات ایزد داد گر و حُسنِ اعتقاد بہ آئمہ اثنا عشرہ علیہم الصلوٰۃ من الملک الاکبر این دولت ابد قرین تا حالت تحریر این صفحات فردوس آئین کہ سنہ ہزار نود و دو (۱۰۹۲ھ) است یک صد و ہشتاد سال می شود کہ در آن سلسلۂ علیہ متداول است۔ امید از حضرت مالک الملک اللذی تجری بہ امرہ الفلک آن است کہ انتہائے این سلطنت ابد نشان بہ ابتدائے دولت حضرت صاحب العصر والزمان علیہ وعلی آباہ الصلوٰۃ من الملک المنان اتصال پذیرد۔"

اور اسی مورخ نے ذیل کے اشعار میں ابوالحسن قطب شاہ کو دعا دی ہے:—

به تخصیص شاه جهان بوالحسن | که در سایهٔ اوست ما را وطن
خدایا به اعزاز خیرالورائے | بحقِ نجوم سپہر ہدائے
که آن خسرو عادل پاک دین | ہمیشه به اقبال بادا قرین
به دنیا بماناد بسیار سال | نگہبان او حضرتِ ذو الجلال[1]



نوٹ۔ یہ شجرہ کلام الملوک مولفۂ سعادت علی صاحب رضوی سے ماخوذ ہے۔

۱۔ حدایق السلاطین مولفۂ علی بن طیفور بسطامی۔ آخری ورق۔ یہ تاریخ جس میں گولکنڈے کے سلاطین اور امراء کا حال درج ہے ۱۰۹۲ھ میں لکھی گئی ہے۔ ابوالحسن کے عہد کا یہ ایک ہی ماخذ ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مولف علی بن طیفور کئی مرتبہ گولکنڈہ آیا، اور گیا، لیکن اپنی تاریخ اس نے گولکنڈے میں لکھی ہے اور بادشاہ نے اس کو بہت کچھ انعامات دیے۔

حصہ پنجم

گولکنڈے کا تمدن

اکیسواں باب

سیاست و معاشرت

قطب شاہ تمدن کے بہت بڑے شمع بردار تھے۔ تلنگانے کی سرزمین میں جہاں ان لوگوں نے راج کیا ایک ایسا پاکیزہ تمدن پیدا کیا تھا جس کے نقوش اب تک موجود ہیں۔ اس تمدن میں جس کو قطب شاہی تمدن کہنا چاہیے مختلف عناصر کا امتزاج تھا۔ پہلے تو یہ لوگ ایران و ترکستان سے بھی جو ان کا جنم بھوم تھا کچھ تمدنی عناصر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان سے آیا تھا ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان کی یادگار تھا۔ یہ سمجھنا کچھ خلافِ قیاس نہیں ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ترکستانی سیاست اور معاشرت کے کچھ نہ کچھ تاثرات ضرور ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطب شاہوں کا تمدنی سرمایہ زیادہ تر گلبرگہ اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے ماخوذ تھا، کیونکہ قطب شاہ اس سلطنت بہمنی کے براہ راست حلقہ بگوش اور خوشہ چیں تھے جس نے چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں دکن کی پُر زور سیاسی اور معاشرتی رہنمائی کی تھی۔ دکنی ملت کا صحیح تخیل اور اس کی انوکھی سیاست و معاشرت جسے دکن کے مخصوص جغرافیہ اور قومیتوں کا عکس سمجھنا چاہیے" اسی سلطنت کی پیداوار تھی"، اسی سلطنت نے دکن کے لیے بہترین نظام حکومت بنایا۔ معاشرت کے زرین اصول سکھائے اور نئی وضع قطع پیدا کی۔ اہلِ دکن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا اچھا سامان جمع کیا جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دکن کے تمام طول و عرض میں جہاں اس سلطنت کا پرچم لہراتا تھا، بہمنیوں کے گہرے نقوش موجود تھے اور یہ آج بھی ہیں۔ کوئی ذہن ان تاثرات سے خالی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں جو جدید نظام حکومت اور معاشرت قایم ہوتا وہ

کبھی ان تاثرات سے خالی نہیں ہوتا سلطان قلی نے برسوں بہمنی نظم معاشرت اور سیاست میں سانس لی تھی اور جب وہ تلنگانے کا صوبہ دار ہوا تو اس کے سامنے سوائے بہمنی آئین کے اور کیا ہو سکتا ہے، اسی آئین کی اس نے پابندی کی، یہ اور اس کے تمام جانشین بہمنی معاشرت میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکے۔ اس طریقے سے تلنگانے میں جو قطب شاہی تمدن تیار کیا گیا اس کی بنیاد اور سراپا سب بہمنی تھا۔ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت پر کچھ حصر نہیں ہے بلکہ اس کی تمام ہمعصر سلطنتیں جو بہمنی سلطنت کے کھنڈروں پر قایم ہوئی تھیں، وہ سب بہمنی معاشرت اور سیاست کی خوشہ چیں تھیں، ان کا نظام حکومت بہمنی تھا، اور جس قدر معاشرت تھی اس پر بہمنی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس سے اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں نے جو اپنی راجدھانیاں قایم کی تھیں ان میں بھی بہمنی عناصر تھے، اور آج بھی دکن اسی تمدن کا رہین منت ہے۔

لیکن یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ قطب شاہوں نے اپنے تمدن کو تلنگانے کے نئے ماحول میں مقامی عناصر کے ساتھ کچھ اس طرح مرکب کیا تھا کہ ایک مقامی چیز معلوم ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے اس بات کو بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ ان کی سلطنت تلنگانے میں ٹھیٹ ترکستانی اور بہمنی نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی اس طرح شامل ہونے چاہئیں کہ یہ اس سرزمین کی خصوصیات کا پورا جواب دے سکے۔ یہ قطب شاہی سلطنت کا سرمایۂ افتخار ہے کہ اس نے اپنے آپ کو تلنگانے کی قومی اور جغرافی خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد یہ ایک آندھرا راجدھانی معلوم ہونے لگی اور شاہان قطبیہ آندھرا راجگان معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ تلنگانے کو ان لوگوں نے اپنا گھر بنا لیا۔ تلنگی عورتوں سے شادیاں کیں اور ترکستانی وضع قطع چھوڑ کر مقامی لباس اور طور و طریق اختیار کیے اور تلنگی زبان سیکھی اور اس میں شاعری کی۔ ملک کے ہر طبقے کو مذہب کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اس ہم آہنگی کا نتیجہ یہ تھا کہ قطب شاہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ تلنگانے کی قومی اور جغرافی خصوصیات کی صحیح پیمائش کر کے بہت جلد ایک تعمیری خاکہ تیار کر لیا، اور اس ملک کی ہر طرح سے تعمیری

آندھرا قوم کو اپنی رعایا سمجھ کر آگے بڑھایا۔ تلنگی زبان کی سرپرستی کی اور تمدنی ترقی کے تمام راستے کھول دیے اور غالباً یہ تاریخ تلنگانے کا سنہری زمانہ تھا۔

بادشاہ

اگرچہ قطب شاہی دستور میں بہمنی نظام حکومت کا چربہ اُتارا گیا تھا، اور یہ قطب شاہوں کے لیے ناگزیر تھا، تاہم اس میں زمانی اور مقامی خصوصیات نظرانداز نہیں کی گئی تھیں۔ مرکزی اور مقامی حکومتوں کی ترتیب میں اس بات کا پورا لحاظ تھا کہ وہ عصری ضروریات کا جواب ہو، اس لیے گو دستور کی بنیاد تمامتر بہمنی تھی لیکن بایں ہمہ اس میں فروعی اختلافات بھی تھے۔ بہمنیوں کی طرح قطب شاہی حکومت بھی ایک "شاہی" تھی، یعنی بہمنی بادشاہوں کی طرح قطب شاہ بھی مطلق العنان تھے۔ دستور میں کوئی ایسا آلۂ حکومت نہ تھا جس کی بدولت وہ رائے عامہ کا مظہر ہوتا، اور بادشاہوں کو عام خوشنودی کا پابند کرتا۔ بادشاہوں کی ذات ظاہری و باطنی مختلف صفات کی حامل سمجھی جاتی تھی اور اس میں تقدس بھی تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے تمام اسلامی بادشاہوں کی طرح یہ بھی ظل اللہ سمجھے جاتے تھے، یہ خود بھی اپنے کو ظل اللہ کہتے تھے اور بعض تو ظل اللہ تخلص کرتے تھے[1]۔ یہ شاہی رعب داب قایم کرنے کا اچھا ہتھیار تھا جو قرونِ وسطیٰ میں ہر جگہ استعمال کیا گیا۔ تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ تمام قطب شاہ بڑے ذی علم شایستہ انسان تھے اور حکمرانی میں اپنی پوری ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ اکثر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے وزرا سے مشورہ لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے اور خاص معاملات میں علمائے عصر سے بھی مشورہ کیا کرتے تھے[2]۔ ان میں رواداری اور رعایا پروری بے حد تھی اور عدل گستری ان کا خاص شعار تھا۔ ان لوگوں نے اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔

---

[1] محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ ظل اللہ تخلص کرتے تھے۔

[2] عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء میں علماء سے مشورہ کر کے شاہجہاں کی شرطیں تسلیم کی تھیں (حدیقۃ السلاطین)

اس لیے اہل تلنگانہ قطب شاہی سلطنت کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ کو تلنگانے میں آئے ہوئے ابھی بہت روز نہیں ہوئے تھے کہ تلنگی رعایا اس کو "بڑے ملک" کے ہر دلعزیز لقب سے یاد کرنے لگی۔ اس کے جانشینوں کے ساتھ بھی یہی محبت تھی اور ملکہ اکثر "ماں صاحب" کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔

جلوس و تخت نشینی جب بادشاہ کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی تجہیز و تکفین سے پہلے ہی اس کی جانشینی کا انتظام کیا جاتا تھا تاکہ حکومت کی رفتار میں کوئی فرق نہ آئے۔ چنانچہ عبد اللہ قطب شاہ کی اسی طریقے پر محمدی محل میں تخت نشینی ہوئی، اس میں تمام اُمراء و عمائد سلطنت اور فوجی افسر جمع ہوتے تھے اور سلام کرتے تھے اور اس کے بعد عوام کو بھی موقعہ دیا جاتا تھا کہ وہ نئے بادشاہ کو دیکھ لیں اور اس کو دربار عام کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عام اطلاع کے لیے ہاتھیوں اور راونٹوں پر تمام شہر میں منادی کی جاتی تھی، یعنی جارچیاں اور منادیاں ہاتھیوں اور راونٹوں پر بیٹھ کر شہر میں گھومتے تھے اور اوپر سے نئے بادشاہ کا اعلان کرتے تھے۔ یہ ایک موقتی انتظام تھا لیکن اس کے دو چار روز کے بعد جب تجہیز و تکفین اور سوگ سے فراغت ہو جاتی تو باضابطہ تخت نشینی کا انتظام ہوتا تھا، اس کے لیے ایک مناسب اور مبارک تاریخ مقرر ہوتی تھی اور خاص اہتمام کے ساتھ تخت نشینی کا دربار ہوتا تھا۔ صبح سے اس کا اہتمام ہوتا تھا، پہلے نقارے۔ دمامے۔ کرنا و صفیر بجتے تھے تاکہ دُور دُور تک اس کی اطلاع پہنچ جائے! اس کے بعد تمام اُمراء و عمائد سلطنت اور مُلک کے تمام عُلما، و فضلاء ایوانِ شاہی میں جمع ہوتے اور بادشاہ کو قطب شاہی تخت پر بٹھاتے تھے اور پھر اپنی جگہ کھڑے ہو کر آداب سلام بجا لاتے تھے اور دعا دیتے تھے، اور بالعموم ایسے درباروں میں قصیدۂ مبارک باد بھی پڑھے جاتے تھے۔ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت میر مومنؒ نے دو[۲] زبردست قصیدۂ تہنیت پڑھے تھے جن کی تاریخی اہمیت ہے! اس دربار کے بعد اظہارِ مسرت میں نہ صرف تمام ارکانِ سلطنت کو جامدار خانے سے خلعتیں تقسیم ہوتی تھیں جو مرکزی حکومت کے عامل ہوتے تھے بلکہ دُور دراز قلعہ داروں اور نایک واڑیوں کو بھی حسب مراتب کپڑے اور انعام دیے جاتے تھے تاکہ سب اس مسرت میں برابر کے

شریک ہوں۔ اس کے علاوہ عام لوگوں کو بھی ہاتھیوں اور توپ خانوں پر شیرینی اور شکر بھر کر تقسیم کی جاتی تھی تاکہ ہر طبقہ اس مسرت سے بہرہ اندوز ہو[1]۔ اور پھر ایسے موقع پر ہمسایہ سلطنتوں کی طرف سے سفیر آتے تھے اور مرحوم بادشاہ کی تعزیت اور جدید بادشاہ کی تہنیت کرتے تھے چنانچہ قطب شاہوں کے پاس نہ صرف احمد نگر اور بیجاپور سے سفیر آئے بلکہ بعض موقعوں پر سلاطینِ مغلیہ اور سلاطین صفوی نے بھی سفیر بھیجے اور تعزیت و تہنیت کی۔

شاہی دربار بہمنی سلاطین کی طرح قطب شاہ بھی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اپنے دربار جاتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں شاہی بارگاہ اور دربار سیدھے سادھے تھے لیکن ابراہیم کے عہد میں جب دولت خانۂ عالی کی تعمیر ہوئی تو اس میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دربار ہونے لگا اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تو اس کی رونق بہت بڑھ گئی۔ دولت خانۂ عالی کا بڑا ایوان جہاں دربار ہوتا تھا کوئی ہزار گز کے قریب طویل تھا، اور اس کے چاروں طرف عالی شان ایوان اور محرابیں تعمیر ہوئی تھیں۔ اس کا دروازہ جو ہندو طرز کا تھا مشرقی جانب تھا، اور بیس گز بلند رفیع الشان ستونوں پر قایم تھا، دروازے کے بالائی حصے میں ایک نہایت بلند عمارت تھی اور اس کے سامنے نقار خانہ تھا جس میں نوبت بجتی تھی جو شاہی امتیازہے ہر روز صبح دربار ہوتا تھا، تمام امرا و عمائد کو حکم تھا کہ اپنی فوج اور ہاتھیوں کے ہمراہ سلام کے لیے دربار میں آئیں۔ یہ اپنے خدم و حشم کو باہر چھوڑ دیتے تھے اور خود تنہا آکر سلام کرتے تھے۔ شاہی رُعب داب کے لیے شاہی فیل خانے کے ہاتھی اور شاہی فوج کے ہزار پیادے دولت خانۂ عالی کے سامنے دورویہ صفیں باندھ کر کھڑے رہتے تھے اور اس کے علاوہ حبشی سرداروں کے تحت کئی سو مسلح سپاہی پہرہ دیا کرتے تھے۔ اس بارگاہ شاہی کے جنوبی جانب شاہی دفترخانہ اور مغرب میں جام دارخانہ اور شاہی کارخانوں کی

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۲۰ – ۲۶۔

عمارتیں تھیں[۱]۔ جب شہر حیدر آباد میں شاہی قصر یعنی داد محل اور محمدی محل تعمیر ہو گئے تو یہاں بھی یہ دربار ہونے لگے۔ ان درباروں میں اُمرا و عمائد سلطنت بیٹھ نہیں سکتے تھے بلکہ اپنے مراتب کے مطابق کھڑے ہوتے تھے اور جب کبھی کسی کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت دی جاتی تو وہ بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ان بڑے درباروں کے علاوہ قطب شاہوں کی چھوٹی اور خاص مجلسیں بھی ہوتی تھیں جہاں شاہی تخت کی جگہ صرف مسند بچھی ہوتی تھی اور وزرا سے گفتگو ہوتی تھی۔

وزرا

پیشوا

اگرچہ بادشاہ سلطنت کا نفس ناطقہ تھا لیکن حکومت کے عاملانہ فرائض کے لیے مرکز میں کئی وزیر مقرر تھے اور ان پر خاص سلیقے کے ساتھ فرائض اور اختیارات کی تقسیم کی گئی تھی۔ بعض وزرا تو بالکل وہی تھے جو بہمنی وزارتی ترتیب میں پائے جاتے تھے، یعنی وزیر اعظم "وکیل مطلق" یا پیشوا کہلاتا تھا جس کے سپرد امور سلطنت کی نگرانی، داخلی اور خارجی مسلک حکومت کی تشکیل تھی۔ بادشاہ بالعموم اسی وزیر سے مشورہ کرتے تھے۔ اس خدمت پر اکثر بڑے پایہ کی شخصیتیں مامور کی جاتی تھیں جن کی علمی و عملی قابلیت مسلمہ ہوتی تھی اور عطائے عہدے کے موقعے پر خلعت پیشوائی اور دوسرے اعزازی امتیازات عطا کیے جاتے تھے اور بالعموم میر جملہ کے عہدے سے پیشوائی پر ترقی دی جاتی تھی، چنانچہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں مصطفےٰ خاں اردستانی اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں میر محمد مومنؒ، اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں شیخ محمد ابن خاتون جیسی شخصیتیں فائز تھیں جعفر بن میر مومنؒ اور شیخ محمد کی تو اس قدر ہوتی تھی کہ ان لوگوں کو پالکی میں بیٹھ کر دولت خانۂ عالی میں آنے کی اجازت تھی اور یہ تخت کے بائیں جانب بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے ابتدائی عہد میں جب شاہ محمد پیشوا تھا تو

۱۔ مضمون مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد رسالہ اُردو ۱۹۲۱ء۔

اس کی امداد کے لیے شیخ محمد کو اس کا نایب بنا یا گیا۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں ایک جدت یہ ہوئی کہ پیشوا کو "دیوان" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ مادنا جو پیشوا کے فرایض انجام دیتا تھا دیوان کہلاتا تھا نہ کہ پیشوا۔

میر جملہ پیشوا کے بعد دوسرا بڑا وزیر میر جملہ تھا جس کو بہمنی اصطلاح کے مطابق امیر جملہ کہنا چاہیے۔ اس کو جملۃ الملک خطاب ہوتا تھا، اور اس عہدے کو وزارت جملۃ الملکی کہتے تھے۔ فرایض کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ زمانۂ حال کا وزیر مالیات تھا، یعنی تمام سلطنت کے مداخل اور مصارف کی جانچ پڑتال اسی کے سپرد ہوتی تھی، یہ سلطنت کی تمام مالگزاری کی گرفت اور ہر محکمے کے خرچ کی تنقیح کرتا تھا کیونکہ مادیات کے ساتھ بالعموم حسابی تنقیح شامل رہتی ہے۔ دوسرے شعبوں کے ساتھ یہ بالخصوص کوتوالی اور فوج کی بھی تنقیح کرتا تھا۔ اس طریقے سے اس عہدہ دار کے اختیارات اور اثرات بہت وسیع تھے جو خود پیشوا کو بھی حاصل نہ تھے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں سلطنت کا روپیہ اور تنقیح کا اختیار تھا۔ چنانچہ بعض موقعوں پر قطب شاہی میر جملہ پیشوا سے بھی بڑھ گئے اور بعض جلیل القدر میر جملہ خود پیشوا کے اختیارات بھی استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مرزا محمد امین اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ملا تقی اور میر محمد سعید اردستانی بڑے میر جملہ گزرے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے لوگ پیشوا کو نہیں پہچانتے تھے۔ محمد امین اور ملا تقی کو تقرر کے وقت قلمدان مرصع دیا گیا تھا[1] جو دوسروں کو نہیں دیا گیا۔

وزیر عین الملک قطب شاہی دستور میں ایک اور بڑی وزارت تھی جس کو وزارت عین الملکی کہتے تھے اور اس وزیر کو عین الملک خطاب دیا جاتا تھا۔ اس وزیر کے فرایض اور اختیارات تو واضح نہیں ہیں لیکن قرائن یہ ہیں کہ یہ محکمۂ فوج کا صدر ہوتا تھا، اگر یہ صحیح ہے تو اہل فوج کا تقرر و تنزل اور ان کی دیکھ بھال اس کے ہاتھ میں تھی اور یہ غالباً قطب شاہی افواج کا سپہ سالار بھی ہوتا تھا چونکہ

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۴۲۔

فوجوں کی رہنمائی بڑی امتیازی چیز ہوتی ہے اس لیے اس وزیر کی بہت اہمیت تھی، یعنی "سرداری عین الملکی کہ از اعاظم وزارت است"[1] اس خدمت پر ابتدا میں سیف خاں عین الملک اور آخری زمانے میں منصور خاں حبشی فائز تھے۔

مجموعہ دار یہ بھی ایک بڑا عہدہ دار تھا جو مرکزی حکومت میں تمام سلطنت کی مالگزاری جمع کرتا، اور غالباً مرکزی خزانہ اسی کی نگرانی میں رہتا تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "منصب رفیع مجموعہ داری کہ عبارت از استیفائے ممالک است"[2] لیکن ان فرایض کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعہ دار میر جملہ کے ماتحت اور اس کا شریک کار تھا، اور اس طریقے سے غالباً یہ وزیر کے رتبے سے کمتر تھا عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ناراین راؤ اس خدمت پر فائز تھا، نہ صرف اس عہدے پر بلکہ محکمۂ مال میں بھی اکثر ہندو مامور کیے جاتے تھے۔

ناظر جس کو ناظر الممالک خطاب دیا جاتا تھا آمد و خرچ کا حساب رکھتا تھا، اور غالباً یہ بھی مجموعہ دار کی طرح وزیر کے رتبے سے کم اور میر جملہ کے ماتحت متصور ہوتا تھا، مجموعہ دار جمع بندی کرتا تھا تو ناظر خرچ کی تنقیح کرتا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ابوطالب اور عبداللہ کے عہد میں میر قاسم اس عہدے پر فائز تھے اور بہت مشہور تھے۔

دبیر جس کو کبھی دبیر الممالک اور کبھی منشی الممالک خطاب ہوتا تھا بادشاہ کے خاص فرایض انجام دیتا تھا۔ یعنی یہ شاہی فرامین اور احکام شایع کرتا تھا، اور ملک کے عرایض بادشاہ کے پاس پیش کرتا تھا۔ اس کو زمانۂ حال کی اصطلاح میں پرایوٹ سکرٹری کہنا چاہیے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں خواجہ مظفر علی اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مولانا اویس وغیرہ اس خدمت پر مامور تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرامین

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۵۹۔

[2] حدیقۃ السلاطین ص ۳۱۔

فارسی اور تلنگی دونوں زبانوں میں شایع ہوتے تھے تاکہ سب رعایا ان کو سمجھیں اور فایدہ اٹھائیں۔ چنانچہ آخرالذکر فرامین کے لیے جن کو "فرامین ہندوی" کہا جاتا ہے ایک برہمن دبیر مامور ہوتا تھا، چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں تلنگی فرامین لکھنے کے لیے اعتماد راؤ برہمن مامور تھا[1]

کوتوال گو یہ وزیر نہیں تھا لیکن شہر کے قیام امن کے لیے اس کی بڑی اہمیت محسوس ہوتی تھی خصوصاً ایسے موقعوں پر جبکہ شورش کا ڈر ہوتا تھا کوتوال کے فرایض بہت اہم ہو جاتے تھے۔ چونکہ اس خدمت پر کارکردہ لوگ مامور ہوتے تھے اس لیے کوتوالی یا پولیس کا انتظام بہت اچھا تھا۔ اس کی باہر کے سیاحوں نے بڑی تعریف کی ہے اور تھیونو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی کوتوال ایسے کارکردہ ہوتے تھے جیسے زمانۂ حال کے کوتوال ہوتے ہیں۔ بغیر کوتوال کی اجازت کے کوئی اجنبی شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا[2]۔ اجنبیوں پر بڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ جب نئے لوگ باہر سے آتے تھے تو ان کو دروازوں پر روک لیا جاتا تھا، اور ان کی تحقیق کی جاتی تھی تاکہ وہ مایۂ فساد نہ ہوں، اور ان کا سامان بھی دیکھا جاتا تھا[3]۔ کوتوال کی امداد کے لیے ایک نایب کوتوال بھی مامور تھا۔

ان بڑے وزرا، اور عہدہ داروں کے علاوہ چند چھوٹے عہدہ دار بھی ہوتے تھے مثلاً فوج کے چھوٹے افسر تھے جو سرخیل کہلاتے تھے غالباً یہ عین الملک کے ماتحت ہوں گے۔ جو سرخیل خاص بادشاہ کی حفاظت کے لیے مقرر ہوتے تھے وہ "سرخیل شاہی" کہلاتے تھے۔ بعض عہدہ دار ایسے تھے جو جام دار خانے

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۳۱۔

[2] سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم ص ۹۷۔

[3] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد ص ۱۲۵۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ شہر میں نہایت اچھی پولیس ہے اور اس کی وجہ سے اچھا انتظام ہے۔

اور فیل خانے کا انتظام کرتے تھے، یہ "حوالدار" کہلاتے تھے۔ یہ تمام چھوٹے بڑے عہدہ دار آئینِ سلطنت کے پورے پابند تھے اور جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہوتی یا یہ آئین شکنی کرتے تو ان کو سزا دی جاتی، اور بلالحاظ عہدہ برطرف کر دیے جاتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم قطب شاہ نے اپنے پیشوا مصطفیٰ خاں کو اور سلطان محمد نے اپنے میر جملہ مرزا محمد امین کو ان کی خلاف ورزی کی علت میں برطرف کر دیا۔

حکومت میں کوئی قانون سازی کا شعبہ تو نہ تھا البتہ ملک کا رسم و رواج اور شاہی احکام قانون کا درجہ رکھتے تھے جو حکومتِ شاہی کا خاصہ ہے، لیکن ان اعضائے عاملہ کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا قطب شاہی سلطنت میں عدلیہ کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا جس پر قطب شاہ بہت زور دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں بالعموم فصل مقدمات کا کام قاضیوں اور پنڈتوں کے تفویض تھا، لیکن بادشاہ بھی بہ ذات خود اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اور اس کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ بڑے انصاف پسند حکمران تھے، اول الذکر نے معدلت گستری کے لیے "داد محل" کے نام سے ایک بہت بڑی عمارت بنائی تھی جس کی بہت شہرت تھی، باہر کے سیاحوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے، اسی میں بیٹھ کر بادشاہ مظلوموں کی فریاد سنتے تھے، اس کے دروازے بازار کی طرف کھلتے تھے اور یہ عام حکم تھا کہ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو وہ بلا مزاحمت بادشاہ کے سامنے آجائے۔ دربان اور چوبدار مزاحمت نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب یہ عمارت بجلی کے صدمے سے خراب ہوگئی تو سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ لیکن اس کے علاوہ سلطان محمد نے "امان محل" کے نام سے ایک اور عمارت بنائی تھی جس کا مقصد بھی یہی تھا یعنی وہ مظلوموں کی پناہ گاہ سمجھی جاتی تھی۔ یہ شاہی دادرسی ہر عہد میں برابر قایم رہی، ہر بادشاہ نے اس کا پورا لحاظ رکھا۔ جب فرانسیسی سیاح ٹیورنیر عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا تھا، اس نے اپنی آنکھوں سے شاہی عدل گستری کا انتظام دیکھا تھا، وہ کہتا ہے کہ بادشاہ خود دادرسی کرتے ہیں اور طریقۂ کار یہ ہے کہ بادشاہ محل کے برآمدے پر آتے ہیں اور سب لوگ ان کے سامنے میدان میں نیچے اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن لوگوں کے کھڑے رہنے کا انتظام یہ تھا کہ زمین میں لکڑیاں

نصب کرکے رسیوں کی تین قطاریں باندھی جاتی تھیں اور یہ قطاریں تمام میدان میں پھیلی ہوئی تھیں ان میں لوگ کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر طلب کیے کوئی رسیوں کو پھاند کر نہیں جاسکتا۔ شاہ نشین کے سامنے جہاں بادشاہ ہوتے ہیں ایک رستہ چھوڑ دیا جاتا ہے جس میں سے دادخواہ بادشاہ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، لیکن یہاں بھی سامنے ایک رسّی ہوتی ہے، جب کسی کو بلایا جاتا ہے تو دو آدمی شاہ نشین کے سامنے کی رسّی نیچے جھکا دیتے ہیں تاکہ وہ دادخواہ بادشاہ کے سامنے پہنچ جائے۔ ایک وزیر برآمدے کے نیچے کھڑا ہوتا ہے اور عرائض لیتا ہے۔ جب اس کے ہاتھ میں پانچ یا چھ عرائض جمع ہوجاتے ہیں تو وہ ان کو ایک تھیلی میں رکھ دیتا ہے جو ایک ڈوری کے سہارے اوپر سے چھوڑی جاتی ہے اور ایک خواجہ سرا جو بادشاہ کے برابر کھڑا ہوتا ہے اس کو اوپر کھینچ لیتا ہے اور بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے[1]۔ دوسرے سیاح تھیونو کا بیان ہے کہ عبداللہ قطب شاہ بہت انصاف پسند ہے، وہ بہ ذات خود عدل گستری میں دلچسپی لیتا ہے اور اُمرا بھی سزا سے نہیں بچتے۔[2]

مقامی حکومت | مرکزی حکومت کی طرح مقامی حکومتوں کا نظم و نسق بھی تھا۔ سلطنت مختلف صوبوں پر منقسم تھی

---

[1] ۔ سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اص ۱۲۵–۱۲۶۔

[2] ۔ تھیونو ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک امیر نے ایک صراف کو محل میں بند کرکے اس سے زبردستی پانچ ہزار روپیہ وصول کرلیے، اس کی اطلاع ہوتے ہی بادشاہ نے اس کو سزا دی اور رقم واپس کرادی (سیاحت نامہ تھیونو جلد سوم ص ۹۷)۔ دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عہدہ دار ایلچی بیگ نے تاجروں سے قرض لے لیا تھا اور ادا نہیں کرتا تھا۔ تاجروں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی تو عبداللہ نے تیس یا چالیس ہزار ہون اس کی آمدنی سے ادا کر دیے اور جو باقی رہ گئے تھے وہ شاہی خزانے سے ادا کیے (حدیقۃ السلاطین)

جن کو بہمنی تقلید میں طرف کہتے تھے، آخری زمانے میں سلطنت کے کوئی چھ صوبے ہو گئے تھے، منجملہ ان کے کرناٹک کا بہت بڑا صوبہ تھا جہاں ساحلوں کی بدولت تاجروں سے بہت آمدنی ہوتی تھی، ان کے انتظام کے لیے صوبہ دار ہوتے تھے جو صوبوں میں بادشاہ کی نیابت کرتے تھے اور "طرفدار" کہلاتے تھے۔ بہمنی انتظام کے مطابق یہ اپنے صوبے کے "سرلشکر" بھی تھے، یعنی صوبے کی تمام فوج انھیں کے ماتحت ہوتی تھی اور ضرورت کے وقت یہی فوج کشی بھی کرتے تھے، لیکن ان کے ماتحت "سرخیل" کے نام سے ایک چھوٹا فوجی افسر بھی ہوتا تھا جو فوجوں کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس خدمت پر لایق لوگ مامور کیے جاتے تھے۔ چنانچہ کرناٹک میں محمد سعید میر جملہ نیک نام خاں۔ اکنا۔ محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں اور لنگپا مامور ہوئے تھے، صوبے میں ان کے بڑے اعزاز تھے، دن کو ان کے سر پر چھتر پکڑی جاتی تھی اور رات کو ان کے ساتھ بارہ[1] مشعلیں ہوتی تھیں۔ صوبے کی جمع بندی کے لیے ایک اور عہدہ دار ہوتا تھا جس کو "دیوان" کہتے تھے، غالباً یہ سال میں ایک یا دو[2] مرتبہ اضلاع کے اجارہ داروں سے مالگزاری جمع کر کے خزانۂ شاہی میں داخل کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی طرح ہر صوبے میں قاضی و پنڈت بھی مقرر تھے جو عدل گستری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ صوبے کئی "سرکاروں" میں منقسم تھے جن کو زمانۂ حال کی اصطلاح میں "ضلع" کہنا چاہیے اور "سرکار" کی تقسیم "سمت" تھی جس کو "پرگنہ" بھی کہتے تھے، اور ہر سمت میں کئی محال یا موضعے ہوتے تھے۔ ان چھوٹی سمتوں کا نظم و نسق بالکل وہی تھا جو صوبوں کا تھا۔ صرف فرق یہ تھا کہ یہاں طرفدار یا سرلشکر کی جگہ فوجدار ہوتے تھے اور سمتوں و محالات میں امنِ عامّہ کی حفاظت کے لیے حوالدار مقرر تھے۔ مدراس، مسولی پٹم، پلی کٹ جیسے اہم ساحلی قصبوں پر جہاں مغربی اقوام کی تجارتی منڈیاں تھیں ذی اختیار حوالدار مقرر تھے جو مغربی تاجروں کی نگرانی کرتے تھے۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ عدالتی فیصلوں کے لیے تو قاضی و پنڈت تھے، مگر ایک نیا عہدہ دار بھی تھا جس کو خطیب کہتے تھے۔ یہی عہدہ دار اپنے علاقے میں شاہی فرامین کی تشہیر بھی کرتا تھا۔ ان سب عہدہ داروں کی تنخواہیں خزانۂ شاہی سے وصول ہوتی تھیں جس کی وجہ سے مرکزی حکومت کو مقامی عہدہ داروں پر کافی گرفت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ اور ان کے وزرا بھی

اپنے اضلاع اور قصبات کا دورہ کر کے مقامی حالات کا خود معاینہ کرتے تھے تاکہ مرکزی حکومت مقامی حکومتوں سے وابستہ رہے۔ چنانچہ ابوالحسن قطب شاہ اور اس کے وزیر مادنا نے چار[1] مرتبہ صوبۂ کرناٹک کا دورہ کیا تھا۔

طریقۂ مالگزاری قطب شاہی سلطنت میں وصول مالگزاری کا ایک بے ڈھنگا طریقہ رائج تھا یعنی مقامی حکام خود رعیت سے براہ راست مالگزاری وصول نہیں کرتے تھے بلکہ سرکار یعنی اضلاع ایک مقررہ رقم کے لیے اجارہ داروں کے سپرد کر دیے جاتے تھے جو موعودہ رقم وصول کر کے خزانے میں داخل کرتے تھے۔ یہ اجارہ دار جو اکثر ہندو ہوتے تھے ایک سال کے لیے مقرر ہوتے تھے اور سال ختم ہونے پر ان کا تعلق منقطع ہو جاتا، اور ضلعے ہراج کیے جاتے تھے اور جو شخص بڑی بولی لگاتا اس کو ضلع سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اس میں دوسری خرابی یہ تھی کہ اضلاع کی طرح بندرگاہیں بھی اجارہ داروں کے سپرد کر دی جاتی تھیں۔ سال بھر اجارہ دار اپنے مقبوضہ ضلعے کے مالک ہوتے تھے کہ جو چاہے سو کریں۔ ان کو اضلاع میں فوجداری اور دیوانی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ رعیت سے زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرتے تھے۔ حکومت کو تو موعودہ رقم ادا کرتے تھے کیونکہ اس رقم کے وہ پابند تھے لیکن فاضلات سے اپنا جیب بھرتے تھے، اس کے علاوہ ان کو جمع بندی کا معاوضہ علحدہ ملتا تھا گو مالگزاری تین قسطوں میں ادا ہوتی تھی لیکن بہت سختی سے وصول کی جاتی تھی۔ جب اجارہ دار اپنی موعودہ رقم ادا کرنے میں تساہل کرتے تو ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور کبھی ہاتھی کے پیروں کے نیچے کچلا جاتا تھا۔ چنانچہ مسولی پٹم کا اجارہ دار وسویلی راؤ نے اپنی مقررہ رقم ادا نہیں کی تو اس کو شاہ راہ عام پر کوڑے لگائے گئے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس بے ڈھنگے انتظام کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک زرخیز ہونے کے باوجود مفلس تھا اور رعایا تنگ دست تھی[1] اور بہت سے قصبات ویران ہو گئے تھے۔ یا غالباً یہ لوگ لالچی حکام اور ٹھیکہ داروں سے بچنے کے لیے اپنا اندوختہ چھپاتے تھے۔ لیکن ابوالحسن قطب شاہ کے عہد حکومت میں جبکہ مادنا دیوان تھا اس بے ڈھنگے طریقے کو مسدود کر دیا گیا۔ اجارہ داروں کے بجائے جن سے ملک کو نقصان پہنچ رہا تھا

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۱۔

حصول مالگزاری کے لیے تنخواہ یاب حکام مقرر کیے گئے۔ اس جدید انتظام سے ملک کو بہت فروغ ہوا۔

صوبوں اور سرکاروں کی تقسیم حسب ذیل تھی۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کے چھ[1] صوبے سینتیس[37] سرکار اور پانچ سو سترہ[517] سمت بنائے گئے تھے:۔

صوبہ ۱۔ سرکار محمد نگر۔ سرکار میدک۔ سرکار کولاس۔ سرکار ملنکور

صوبہ ۲۔ سرکار ایلگندل۔ سرکار ورنگل۔ سرکار کھم میٹ۔ سرکار دیورکنڈہ

صوبہ ۳۔ سرکار پانگل۔ سرکار مصطفےٰ نگر۔ سرکار رھونگیر۔ سرکار آکرکرا

صوبہ ۴۔ سرکار کویل کنڈہ۔ سرکار گھن پورہ۔ سرکار مرتضےٰ نگر۔ سرکار مچھلی پٹن

صوبہ ۵۔ سرکار نظام پٹن۔ سرکار ایلور۔ سرکار راج بندری۔ سرکار سیکاکول

صوبہ ۶۔ کرناٹک، یعنی ارکاٹ، اس میں ۱۶ سرکار تھے

فوجی تنظیم

قطب شاہوں کی فوجی تنظیم بھی خاطر خواہ تھی۔ تمام قطب شاہی فوج دارالسلطنت اور صوبوں و اضلاع میں پھیلی ہوئی تھی تاکہ جہاں ضرورت ہوتی اس سے کام لیا جاتا تھا اگرچہ دارالسلطنت میں عین الملک وزیر فوج کا ذمہ دار تھا مگر اس کے علاوہ ایک اور عہدہ دار بخشی الممالک کے خطاب سے اس غرض کے لیے مقرر ہوتا تھا کہ وہ فوج بھرتی کرے اور ان کی تنخواہیں تقسیم کرے۔ نیز میر جملہ فوج کی تنقیح کرتا تھا، تاہم بادشاہ بھی براہ راست فوج کا معاینہ کرتے اور اس سے وابستہ رہتے تھے۔ یہ روایت مشہور ہے کہ ہفتے میں دو تین مرتبہ گولکنڈے میں تمام فوج مشرقی دروازے سے داخل ہو کر شاہی سلام کی عزت حاصل کرتی تھی اور بادشاہ شاہ نشین پر بیٹھ کر سلام لیا کرتے تھے۔ پہلے قطب شاہ تو

ؔ۔ یہ تقسیم ابوالحسن قطب شاہ کے عہد کے ایک گوشوارے سے لی گئی ہے۔ اس میں سوائے کرناٹک کے اور صوبوں کے نام درج نہیں ہیں۔ یہاں امتیاز کے لیے ۱۔۲۔۳ کے ہندسوں سے واضح کیے گئے ہیں۔ تاریخ ظفرہ ص ۱۷۴۔

خود فوجوں کی کمان کرتے تھے۔ سلطان قلی ۔ جمشید ۔ ابراہیم اور محمد قلی قطب شاہ نے اکثر موقعوں پر خود فوجوں کی رہنمائی کی اور میدانِ کارزار میں غنیم کا مقابلہ کیا تھا۔ جو فوجیں صوبوں میں متعین تھیں وہ متعلقہ صوبہ داروں کی نگرانی اور قیادت میں تھیں کیونکہ صوبہ دار سرلشکر بھی تھے۔ بعض صوبوں میں جہاں فوجی نقل و حرکت زیادہ ہوتی تھی کثیر فوجیں متعین تھیں۔ چنانچہ کرناٹک میں جب محمد سعید میر جملہ اور نیک نام خاں طرفدار تھے چالیس ہزار فوج تھی محمد سعید نے اپنے ذاتی خرچ سے پانچ ہزار فوج علٰحدہ نوکر رکھی تھی۔ غالباً شمالی اور مغربی صوبوں میں بھی جہاں سرحدی بندوبست کا سوال تھا زیادہ فوجیں متعین ہوں گی۔ مرکزی اور صوبہ داری فوجوں کی جملہ تعداد کوئی پانچ لاکھ بتائی جاتی ہے[1]۔ یہ فوجیں دو طرح کی تھیں۔ فوج کا ایک حصہ نظام جاگیری کی رو سے اُمراء اور جاگیرداروں کے ذمے تھا کہ جب سلطنت کو ضرورت ہو یہ فوج کی مقررہ تعداد بہم پہنچائیں اور فوج کے مصارف کے لیے ان کو زمینیں اور جاگیریں دی جاتی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالعموم اتنی فوج نہیں رکھتے تھے جو ان کے ذمے مقرر تھی بلکہ اس سے کم یا صحت کے ساتھ کہا جائے تو بالعموم اس کی آدھی فوج رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ قطب شاہی سلطنت میں مستقل فوج بھی تھی۔ یہ فوج عبداللہ قطب شاہ اور اس کے پیشرو عہد ہائے حکومت میں بھی پائی جاتی ہے۔ تھیونو کہتا ہے کہ عبداللہ اپنی فوج کی تنخواہ ادا کرتا ہے۔ ابوالحسن قطب شاہ نے چالیس ہزار کی تعداد میں اپنی ایک خاص فوج بنائی تھی جن کی تنخواہیں وہ خود دیا کرتا تھا[2]۔ اس کے وزیر مادنا نے دس ہزار سواروں کا ایک علٰحدہ رسالہ تیار کیا تھا۔

---

[1] ۔ تھیونو کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی فوج کی تعداد پانچ لاکھ ہے لیکن اسی کا بیان یہ ہے کہ اُمراء اتنی فوج نہیں مہیا کرتے جتنی ان کے ذمے ہوتی ہے بلکہ آدھی فوج مہیا کرتے ہیں تو اس لحاظ سے تقریباً ڈھائی لاکھ فوج ہوئی (سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم ص ۱۰۲ ـ ۱۰۳)۔

[2] ۔ ابوالحسن نے اپنے خسر عبداللہ قطب شاہ کے خزانے سے ایک بڑی رقم حاصل کی تھی اور اس رقم سے چالیس ہزار کی ایک بڑی فوج نوکر رکھی تھی اور اس کی تنخواہ ماہ بہ ماہ وہ خود دیا کرتا تھا (ماہ نامہ ص ۲۱۷)۔

ابوالحسن قطب شاہ کی فوج کی تعداد جو مرکز میں تھی پچپن ہزار (۵۵۰۰۰) سوار، چھیانو ہزار (۹۶۰۰۰) پیدل اور باقی یورپی سپاہی تھے اوران کی تنخواہوں کا خرچ :-

سوار ۔ ایک کروڑ [illegible]

پیدل [illegible] لک [illegible]

اور رکابہ فرنگ ۔ ایک لک [illegible]

ہوتا تھا۔[1] فوج کو باضابطہ قواعد پریڈ سکھائے جاتے تھے۔[2] فوج میں مسلمان اور تلنگی سپاہی ہوتے تھے اور غالباً تلنگوں کی کثرت تھی۔ مسلمانوں میں زیادہ تر مغل اور ایرانی تھے اور یہ مرکزی فوج میں زیادہ پائے جاتے تھے ان کی تنخواہ دس ہون ماہانہ ہوتی تھی تو تلنگوں کی دو ہون ماہانہ تھی، لیکن اول الذکر کو دو گھوڑے اور چار پانچ نوکر رکھنے پڑتے تھے۔[3] سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں تلنگے سپاہیوں کی تنخواہ زیادہ تھی کیونکہ اس زمانے میں مغل اور ایرانی بہت کم تھے۔ لیکن عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل اور ایرانی بہت جمع ہو گئے۔[4] ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں یورپی سپاہی بھی فوج میں مامور تھے۔ مسلمان سواروں کی وردی قبا، اور سرخ پگڑی ہوتی تھی، اوپر سے زرہ اور سر پر خود پہنتے تھے اور تلوار و نیزے سے مسلح ہوتے تھے۔ پیادے پتلون نما سرخ رنگ کے پائجامے پہنتے تھے اوران کے سر پر سیاہ کلاہ ہوتی تھی اور تلوار، بھالوں سے مسلح ہوتے تھے۔ کرناٹکی سواروں کی وردی، پائجامہ زانو تک،

---

[1] ۔ تاریخ ظفرہ ص ۱۷۵۔

[2] ۔ حدیقۃ السلاطین ص ۲۷۔ نصیر الملک جو سر خیل شاہی تھا" لشکر را ورزش سواری کہ در معرکہ کارزار مفید است میفرمود"۔

[3] ۔ سیاحت نامہ تھیونو جلد سوم ص ۱۰۰۔

[4] ۔ تھیونو کہتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں اکثر امراو ایرانی ہیں یا ان کی اولاد ہیں۔

سیاہ رنگ کا کچھہ اور سر پر سُرخ رنگ کی پگڑی ہوتی تھی اور یہ تلوار سے مسلح ہوتے تھے۔ تلنگی سپاہی دھوتی، کچھہ اور پگڑی پہنتے تھے۔ اور نائکواڑیوں کی وردی زیادہ اچھی ہوتی تھی کیونکہ یہ افسر ہوتے تھے۔ تمام سلطنت میں (۶۶) قلعے تھے[1] اور یہ سب بلند پہاڑیوں پر بنائے گئے تھے، منجملہ ان کے کونڈ بیر۔ کونڈ پلی۔ کویلکنڈہ۔ گھنپورہ۔ پانگل۔ کہم میٹھ کے قلعے بہت مستحکم تھے۔ ہر قلعے میں (۱۲۰۰) سپاہی رکھے جاتے تھے۔ کوندپلی اور کوندبیر میں جو بڑے قلعے تھے تین ہزار، چار ہزار سپاہی پائے جاتے تھے[2] اور سب تلنگے تھے اور قلعہ دار نایک ہوتے تھے۔ ان قلعوں کا اس قدر باضابطہ انتظام اور نگرانی تھی کہ رات کو قلعہ دار نایک بھی شاہی احکام کے بغیر اندر نہیں آسکتے تھے جب کبھی نایک دن کو باہر جاتا تھا اور اس کو یہ ڈر ہوتا تھا کہ رات ہونے سے پہلے اندر نہیں آسکے گا تو اس کی وہ بادشاہ سے خاص اجازت لیتا تھا، اور اجازت بھی خاص مواقع پر دی جاتی تھی ورنہ نہیں۔ راتوں کو ایک قلعے سے دوسرے قلعے کو مشعلوں کی حرکت سے خبریں پہنچائی جاتی تھیں[3]۔ مرکزی قلعہ گولکنڈے کی مدافعت کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ اس کی مثال ہندوستان بھر میں نہ تھی۔ چنانچہ اس کے آخری محاصرے کے وقت اس کی اچھی خاصی آزمایش ہوگئی اور مغل محاصرین ہار مان گئے۔

گولکنڈے کی معاشرت

گولکنڈے کی معاشرت بہت بلند اور پاکیزہ تھی۔ چونکہ قطب شاہ خود بہت پاکیزہ معاشرت کے دلدادہ تھے، اس کا اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ بادشاہوں کی خانگی اور درباری زندگی اس قدر شاندار تھی کہ دوسرے ہمعصر شاہی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے ان کے عظیم الشان دربار، شاندار جلوس، فلک بوس محل اور پُرلطف علمی و سماجی محفلیں ان کی عظمت کا ثبوت دیتی تھیں۔ ایک طرف بادشاہ کا

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات سیلکٹ سوسائٹی ص ۱۱۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۹۔

[3] گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۲۔

اندازہ کسی قدر ان کی عمارتوں سے ہوتا ہے۔ بعض عمارتیں اس وقت موجود ہیں اور بعض کی صفحات تاریخ پر تعریف رہ گئی ہے۔ شاہی بارگاہ تو کجا ان کے رہنے کے قصر بھی اس قدر بلند تھے کہ ان کی مشکل سے مثال ملے گی۔ اندر سے بہترین قالینوں کا فرش اور چینی و بلوریں آلات کی سجاوٹ اور باہر سے عمارتوں کی رفعت و باغبانی بڑی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ ایک مغل شہزادے نے جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا لکھا تھا کہ ان محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ شاہی درباروں کا حال ہم اُوپر پڑھ آئے ہیں شاہی جلوس بھی اسی قدر شان دار ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتے تھے اور ان کے ساتھ بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ اُمراء اور وزراء گھوڑوں اور پالکیوں میں جلوس کے ساتھ رہتے تھے اور ایک بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا۔[۱] بادشاہوں کے مقبرے بھی بڑے شان دار بنائے جاتے تھے جو اب تک موجود ہیں۔ قبروں پر بہترین غلاف پہنائے جاتے تھے اور قبروں کے ارد گرد قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے اور سونے چاندی کی شمعیں روشن کی جاتی تھیں اور ہر روز غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔[۲] اُمراء کی زندگی بھی کچھ کم شان دار نہ تھی۔ یہ بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے تھے جو کئی منزل بلند ہوتی تھیں۔ ان کا جلوس بھی ایسا ہی شان دار ہوتا تھا کہ گویا خود بادشاہوں کا جلوس ہے۔ جب یہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ہمراہ بھی ہاتھی اور اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں اور بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا، اور سب کے پیچھے ان کا ہاتھی یا پالکی ہوتی تھی۔[۳]

۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۶۔

۲۔ سیاحت نامہ تھیونو ص ۱۰۳۔

۳۔ سیاحت نامہ تھیونو۔ ٹیورنیر نے اس جلوس کی بڑی تفصیل لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے دس بارہ ہاتھی ہوتے ہیں اور یہ تعداد ان کے رتبہ امارت کے مطابق ہوتی ہے ان پر ہودے یا عماریاں ہوتی ہیں اور ایک ہاتھی پر جھنڈا ہوتا ہے۔ ہاتھیوں کے پیچھے اونٹوں کی قطار ہوتی ہے ان کے پیچھے گاڑیاں آتی ہیں جن کے ساتھ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ بھی بہت پاکیزہ اور پُر تکلف زندگی بسر کرتا تھا۔ شہر حیدرآباد میں دو لاکھ مکانوں کی گنتی کی گئی تھی اور ہر مکان کے رہنے والے اوسط دو آدمی قرار دیے جائیں تو شہر کی چار لاکھ آبادی ہونی چاہیئے۔ اس لحاظ سے یہ قرونِ وسطیٰ کا بہت بڑا شہر تھا۔ اسی آبادی اور بلند عمارتوں کو دیکھ کر ایک مغل مورخ نے "آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال" اور "عمارات رفیع تر از پایہ اندیشہ" کہا تھا[۱] جو قطب شاہی تمدن کی بہت بڑی دلیل ہے۔ غالباً شمال کے شہنشاہی شہر بھی اتنے آباد نہیں تھے، اور آبادی میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ تاجر۔ عہدہ دار۔ قانون داں۔ مہاجن۔ صناع اور جوہری،[۲] لیکن اس میں باہر کے لوگ، یعنی مغل، ایرانی، ترک زیادہ تھے جو حیدرآبادی تھے، ان کی معاشرت بے حد پُر تکلف تھی، اول تو ان کے رہنے بسنے کے مکانات نہایت شاندار اور بلند ہوتے تھے پھر ان کے در و دیوار سے بلند پایہ تمدن ٹپکتا تھا۔ سونے اور چاندی کی اشیاء کے علاوہ چینی کے ظروف، روشنی کے جھاڑ استعمال ہوتے تھے جن کو مورخ "چینی آلات" کہتے ہیں۔ شیشے اور بلوریں ظروف باہر سے جہازوں میں بھر کر آتے تھے اور مسولی پٹم و حیدرآباد کے بازاروں میں بہ کثرت فروخت ہوتے تھے۔[۳] چنانچہ جب ۱۰۹۵ھ ۱۶۹۷ء میں حیدرآباد کی لوٹ ہوئی تو ہزار ہا قسم کی چیزیں ظروف اور کپڑے باہر نکلے اور قالین کے بہترین فرش راستوں پر نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر خود مغلوں کو حیرت ہوئی[۴] اور ان اشیائے تمدن سے گھر اتنے بھرے ہوئے تھے کہ لوٹ مار کے باوجود یہ خالی نہ ہوتے۔[۵] حالانکہ چار پانچ کروڑ کی لوٹ ہو چکی تھی۔ ان حقیقتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے کا

پیدل ملازم ہوتے ہیں پھر ان کے پیچھے صاحب جلوس آتے ہیں اور ان کے پیچھے سوار اور پیدل ہوتے ہیں (منوچی جلد اول ص ۱۲۶)

[۱] ۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۲۔

[۲] ۔ سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم۔ [۳] ۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۲۔

[۴] ۔ خافی جلد دوم ص ۳۰۶۔

[۵] ۔ مآثر الامراء جلد دوم ص ۳۴۳۔

متوسط طبقہ جس قدر متمدن تھا اس کی مثال اور جگہ نہ تھی۔

لباس چونکہ گولکنڈے کی آبادی میں ہمیشہ باہر سے اضافہ ہوتا رہا، یعنی ایرانی اور مغل بہت آتے تھے اس لیے یہ لوگ تو اپنا وطنی لباس اور وضع قطع قایم رکھتے تھے، لیکن اہل گولکنڈے کے لباس و وضع قطع پر مقامی رنگ چڑھ رہا تھا، تین چار پشتوں کے بعد تو خود بادشاہوں کی وضع قطع اور لباس بالکل بدل گیا، اور اس میں دکنی رنگ غالب ہوگیا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ نے جو قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ ہے اپنے بدن سے تاتاری لباس بالکل اُتار پھینک دیا تھا۔ سر پر تیمور کی کلاہ کے بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی۔ پوستین اور بارانی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا، ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہوتے تھے اور ڈاڑھی منڈھاتا تھا[1] جو بالکل دکنی بلکہ تلنگانے کی طرز تھی۔ اور اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دکن کے رسوم و روایات سے کس قدر شغف تھا۔ اُمرا، اور عوام بھی جو متناسب بدن، بلند قامت اور خوش رنگ ہوتے تھے تقریباً[2] یہی لباس پہننے لگے تھے، یعنی بجائے قبا، اور پوستین کے جو ترکستان اور ایران سے آئی تھی، جامہ اور نیمہ پہنتے تھے، اور کم درجے کے لوگ ململ کا انگرکھا اور جو بغلہ پہنتے تھے جو خاص دکن کا ہوتا تھا، اور سر پہ دکنی وضع کی سفید یا رنگین پگڑی باندھتے تھے اور پیر میں آپشاہی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ جب عام لوگ بھی باہر نکلتے تھے تو کمر بستہ اور مسلح ہوتے تھے اور تقریباً ہر شخص تلوار اور لکڑی کے ہاتھ جانتا تھا جو دکن کا خاص فن ہے۔ جب اُمرا دربار میں جاتے تھے تو سر پر دکنی دستار پہنتے تھے اور کمر میں بگلوس باندھتے تھے۔ جہاں تک ہندو آبادی کا تعلق ہے خواہ وہ سپاہی ہوں یا غیر سپاہی ان کا لباس وہی تھا جو آج صدیوں پہلے تھا۔ کرناٹک کے

---

[1] مضمون مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد رسالہ اردو ۱۹۲۱ء۔ یہ وضع قطع محمد قلی کی ایک تصویر سے معلوم ہوتی ہے جو برٹش میوزیم میں ہے۔

[2] ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۸۔

باشندے سر پر لمبے بال چھوڑتے تھے اور عورتوں کی طرح اُوپر جوڑا باندھتے تھے۔[1]

اخلاقی حالت

اگرچہ اس زمانے کی اخلاقی حالت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن قرائن یہ ہیں کہ ہر طبقے کی اخلاقی حالت اچھی تھی اور متوسط طبقے میں علمی سرگرمی بھی پائی جاتی تھی کیونکہ حیدرآباد کی جب لُوٹ ہوئی تو اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ کتابیں بھی برآمد ہوئی تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کا بھی عام شوق تھا کیونکہ شہر اور اس کے نواح میں مساجد اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ شمار میں نہیں آتیں اور یہ سب قطب شاہی دَور کی ہیں۔ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ شہر حیدرآباد کی ترقی کے ساتھ اہلِ شہر میں تعیشات کی بھی کثرت تھی اور ہر جگہ عیش وعشرت کا سامان جمع ہوگیا تھا جو شہری زندگی کا خاصہ ہے۔ چونکہ قطب شاہی سلطنت میں اُمراء بہت تھے اور مالدار تھے اس لیے ان کی بے کاری اور فارغ البالی کی وجہ سے ملک میں عیش وعشرت کا سامان ہونا ضروری تھا۔ اس میں خود باشاہوں کی زندگی بھی اثر انداز تھی۔ یہ کچھ خلافِ قیاس نہیں ہے کہ شہری تعیشات محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوگئے ہوں کیونکہ بادشاہ خود عیش وعشرت کی طرف زیادہ مائل تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے اس کی رفتار بہت دنوں تک سُست رہی، کیونکہ سلطان محمد اپنے زمانے کے بڑے زاہد اور پارسا تھے چنانچہ ان کے دن رات مذہبی فرائض کی ادائیں گزرتے تھے، ان کا اخلاقی اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں یہ بات باقی نہیں رہی، بلکہ اس عہد میں پھر عیش وعشرت کے دروازے کُھل گئے اور یہ شاہی زندگی کا لازمہ قرار دیا گیا۔ عبداللہ کو رقص وسرود کا بہت شوق تھا چنانچہ مقامی عیش وعشرت سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ لاہور، آگرہ اور برہان پور سے عیش وعشرت کا سامان جمع کیا جاتا تھا۔[2] ظاہر ہے کہ اس شاہی زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑتا ہے،

---

[1] ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۷۔

[2] حدیقۃ السلاطین کا مولف کہتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں تلنگانہ۔ کرناٹک۔ احمد آباد۔ کابل۔ لاہور۔ آگرہ و برہان پور سے

چنانچہ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں رقص و سرود کی محفلیں عام ہونے لگیں اور عیش و عشرت کی گرم بازاری ہوگئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو، مسلمانوں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی بغیر طوائف اور رقص و سرود کے نہیں ہوتی تھی[1] جو ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں بھی جاری رہی۔ غالباً انھیں مناظر کو دیکھ کر لوگ ابوالحسن اور اس کے عہد سے متعلق غلط رائے قایم کر لیتے ہیں۔

طوائف بلائی جاتی تھیں (حدیقۃ السلاطین ص ۳۶) یہ طوائف اکثر حیدرآباد میں قیام پذیر ہوگئیں اور ان سے عام اخلاق خراب ہوتے تھے، چنانچہ عبداللہ کے عہد میں ٹیورنیر نے ان طوائف کی تعداد بیس ہزار بتائی ہے، داروغہ کے رجسٹر میں ان کے نام درج ہوتے تھے (سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۷)۔ غالباً ان کو خاص مشاہرے بھی ہوتی ہوں گی۔ تھیونو نے بھی ان عورتوں کی تعداد کچھ اسی کے لگ بھگ بتائی ہے، یہ رنگ ابوالحسن کے عہد میں بھی قایم رہا۔ چنانچہ اس عہد میں طوائف کو سرکار سے تین لاکھ چوبیس ہزار روپیے دیے جاتے تھے (تاریخ ظفرہ ص ۱۷۵)۔

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۷۔

بائیسواں باب

معاشی حالت

دکن کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت زیادہ مالدار و خوش حال تھی۔ کیونکہ اس سلطنت کو آمدنی کے جو قدرتی اور انتظامی ذرایع حاصل تھے وہ دوسری سلطنتوں کو میسر نہ تھے! اول تو یہ سلطنت بہت وسیع تھی! ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے جوں جوں کرناٹک کے اضلاع سلطنت میں ضم ہوتے جاتے تھے یہ سلطنت بہت پھیلتی گئی اور ان فتوحات کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا، یہاں تک کہ یہ ساحل کارومنڈل کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگئی چنانچہ زمینوں کی نوعیت کے اعتبار سے اس سلطنت کے دو حصے کیے جاسکتے ہیں، ایک تو ساحل کارومنڈل کا مستطیل حصہ جو سمندر کے متوازی چلا گیا تھا، اسی میں دریائے کرشنا اور گوداوری کی سیراب زمینیں بھی شامل تھیں اور اس کے بعد ملک کا اندرونی حصہ تھا جس میں مشرقی گھاٹ اور دکن کی سطح مرتفع داخل تھی۔ یہ دونوں خطے زرخیز اور بہت سیر حاصل تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں "یک قطعہ زمین بے مزرعہ نیست"[1]۔ نیز باہر کے سیاح بھی اس سلطنت کی زرخیزی کے بہت مدح سرا ہیں[2]۔ اگرچہ طریقۂ مالگزاری کی خرابی سے رعیت کو نقصان پہنچتا تھا تاہم آخری زمانے میں اس کی بہت کچھ اصلاح ہوچکی تھی۔ ویران دیہات آباد ہوئے اور نئے تالاب و باؤلیاں کھدوائی گئی تھیں اس سلطنت میں

---

[1] یہ اورنگ زیب کا فقرہ ہے جو اس نے بہ حیثیت ناظم دکن کے لکھا تھا (رقعات عالمگیری)۔

[2] ٹیورنیر کہتا ہے کہ گولکنڈے کی سلطنت بہت زرخیز ہے (سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۱) گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۸۔

ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا تھا گیہوں۔ چاول۔ جوار۔ باجرا۔ مونگ۔ چنا۔ مسور۔ تور۔ تل بہتات سے پیدا ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کپاس۔ تمباکو اور ارنڈی کی بہت پیداوار تھی۔ تمباکو اور تاڑی سے بہت محصول وصول ہوتا تھا۔ پھلوں میں آم۔ موز۔ لیمو۔ انار۔ انناس بہت پیدا ہوتے تھے ان کے علاوہ سنگترے اور امرود بھی پیدا ہوتے تھے[1]۔ مزروعہ زمینوں کے علاوہ اس سلطنت میں جنگلات بھی بہت تھے جس کی لکڑی اور جانوروں سے بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی جنگلات میں شیر۔ ہاتھی۔ ریچھ۔ چیتے۔ بندر۔ ہرن اور چیتل پائے جاتے تھے جو اب بھی ہیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کو اپنے چھ صوبوں کی زرعی پیداوار سے جن میں (۳۷) سرکار اور (۵۱۷) پرگنے تھے کافی محاصل وصول ہوتے تھے۔

معدنیات

مزروعہ و غیر مزروعہ زمینات کے علاوہ قطب شاہی سلطنت کو معدنیات سے بھی غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی اور خصوصاً گولکنڈہ اپنے ہیرے کی کانوں کی وجہ سے نہ صرف دنیا میں مشہور تھا بلکہ بہت مالدار تھا، اور دکن کی کوئی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ہیروں کی بہتات کی وجہ سے جو اس سلطنت میں پیدا ہوتے تھے اس کو بالعموم "ہیروں کا ملک" کہتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سلطنت کے حدود میں ہیروں کی کانیں کب دریافت ہوئی تھیں اور کس زمانے سے ہیرے زمین سے کھودے جانے لگے۔ ایک روایت یہ ہے کہ سولھویں صدی کے اوائل میں ایک اتفاق سے یہاں ہیروں کا پتا چل گیا[2]۔ قرائن یہ ہیں کہ یہ معدن سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں دریافت ہوئے ہیں، اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس دریافت میں ترقی ہوگئی اور ایک کان سے دوسری کان کا پتا چل گیا اور حکومت نے

---

[1] ۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۵۔

[2] ۔ انگریزی کمپنی کا ملازم ولیم میتھو لڈ جو ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آیا تھا بیان کرتا ہے کہ ایک روز اتفاق سے ایک چرواہے کا پیر ایک پتھر سے ٹکرایا، اس نے پتھر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ وہ چمک دار ہے، اس نے معمولی داموں میں فروخت کر دیا۔ (گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۰) یہ سلطان محمد قطب شاہ کا عہد تھا، غالباً اسی عہد میں یہ معدن دریافت ہوئے تھے۔

ان کی نگرانی شروع کر دی پھر تلنگانہ سے آگے بڑھ کر کرناٹک میں یہ معدن دریافت ہوگئے، کھودنے والوں کو اتنی مشق اور مہارت ہوگئی تھی کہ ٹیلے کی نوعیت، بُو اور زمین کے رنگ سے ان کا پتا چلا لیتے تھے۔ چنانچہ جب محمد سعید میر جملہ نے کڑپا سدھوٹ۔ کھڈی کوٹ مسخر کیے تو یہاں بھی بے شمار معدن دریافت ہوئے اور لاکھوں روپیوں کے ہیرے برآمد ہوئے اور اتنے ہیرے نکلے کہ ایک دو کی گنتی کرنے کی بجائے تھیلیوں سے انکی گنتی کی جاتی تھی۔ محمد سعید نے شاہجہاں کی خدمت میں اپنی کمائی سے کوئی چالیس لاکھ کے ہیرے پیش کیے تھے اور ایک بہت بڑا ہیرا اندر کیا تھا جس کا وزن (۳۶۰) قیراط تھا[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کرناٹک سے کتنے ہیرے جمع کیے تھے۔ اگر ہیروں کی خوبی اور قیمت کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کے بڑے بڑے ہیرے گولکنڈے کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کے جواہر خانوں میں بے شمار ہیرے تھے جو (۳۰۰) قیراط سے کم وزنی نہ تھے بلکہ اس سے زیادہ تھے۔ عبداللہ کے تاج میں بہترین ہیرے تھے۔[3]

قطب شاہی سلطنت میں (۲۳) کانیں پائی جاتی تھیں، یہ کچھ تلنگانے میں تھیں اور کچھ کرناٹک میں۔ کونڈپلی جو دریائے کرشنا سے بہت قریب ہے؛ ورنرساپور جو راج مندری سے جانب جنوب (۳۹) میل کے فاصلے پر واقع ہیں ہیروں کے مخزن تھے، یہاں متعدد کانیں دریافت ہوئی تھیں۔ نرساپور میں تو ہیروں کی بہترین کانیں تھیں جہاں سے عمدہ اور بڑے ہیرے حاصل ہوتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب گولکنڈہ مغلوں کے زیر اثر آگیا تو مغل شہنشاہ کی نظر اسی نرساپور پر پڑنے لگی، چنانچہ اسی خوف سے یہاں کی

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۴۲۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے کولور میں ہیرے دریافت ہوئے تھے اور اس کا باعث میر جملہ تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

[2] منوچی جلد اول ص ۲۳۷۔

[3] سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم۔ یہ بادشاہ کے تاج کے ہیروں کی بہت تعریف کرتا ہے۔

کانیں بہت دنوں تک بند کرادی گئیں[1]۔اس کے علاوہ کندی کوٹ اور کولورمیں جو کرناٹک میں ہیں بے شمار کانیں تھیں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کانوں میں بیس ہزار آدمی کام کرتے تھے، منجملہ ان کے بعض مزدور کان کھودتے تھے اور بعض مٹی نکالتے تھے اور بعض پانی خارج کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان مقامات میں جو پہلے ویران تھے اب بہت آباد ہو گئے تھے[2]۔ اکیلے کندی کوٹ کی کانوں میں محمد سعید نے کان کنی کے لیے بارہ سو آدمی مقرر کیے تھے[3]۔ان کانوں سے بہت آمدنی ہوتی تھی، اور قطب شاہی سلطنت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا بعض کانوں کو بادشاہ نے محض اپنے استعمال کے لیے مختص کر لیے تھے، یا ولیم میتھولڈ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو دس قیراط سے زیادہ وزنی ہیرے سب بادشاہ کے لیے مختص تھے اور ان کی نگرانی کے لیے کہ ان میں کوئی چوری نہ جائے بادشاہ اپنے حاکم مقرر کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ہیرے چوری جاتے تھے[4]۔اور باقی معدن تاجر اور ٹھیکہ داروں کے سپرد کر دیے جاتے تھے کہ وہ شاہی محصول کے تحت کان کنی کر کے ہیرے حاصل کریں اور بازار میں فروخت کر لیں، یعنی جو لوگ ان کانوں سے ہیرے نکالنے کا ٹھیکہ لیتے تھے، سرکار ان سے ہر کان میں فی گھنٹہ ایک ہون شاہی معاوضہ لیتی تھی خواہ انھیں ہیرے دستیاب ہوں یا نہ ہوں[5]۔ یا بعض کانیں تین لاکھ ہون سالانہ معاوضے پر دی جاتی تھیں[6]۔ ہیروں کے علاوہ معدنیات میں

---

[1] ۔گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۴۔

[2] ۔گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۱۔

[3] ۔سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۲۳۰۔

[4] ۔گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۰۲-۳۰۳۔ یہ ۲۳ کانیں ۲۳ مختلف مقامات میں واقع تھے۔ طوالت کے لحاظ سے یہ ترک کر دیے گئے ہیں۔

[5] ۔سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم ص ۱۰۳۔

[6] ۔گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۲۔

لوہا۔ فولاد سیسہ بھی ملتا تھا اور باہر بھیجا جاتا تھا۔ گولکنڈے کا لوہا اور فولاد تو بہت مشہور تھا۔ سیّاح کہتے ہیں کہ گولکنڈے میں لوہا بے حد پیدا ہوتا تھا اور اس کے فولاد کی دُور تک شہرت تھی اور یہ پنجاب۔ لاہور۔ ایران جایا کرتا تھا، اسی کی دمشقی تلواریں بنتی تھیں۔[1]

صنعت گو یہ صحیح ہے کہ گولکنڈہ ایک زرعی مُلک تھا تاہم اس میں صنعت و حرفت کو بھی بہت فروغ تھا۔ کیونکہ جوں جوں قطب شاہی تمدن ترقی کرتا گیا اس کی متمدن زندگی کے لیے بے شمار مصنوعات کی ضرورت ہوئی اور بادشاہ سے لےکر غریب آدمی تک ہر صاحب ذوق نے اس میں اضافہ کیا چنانچہ جب شہر حیدرآباد آباد ہوا تو اس کے پُرانے اور نئے تمدن کے لیے بے شمار مصنوعات تیار ہونے لگیں اور مُلک میں صناع اور اہلِ حرفہ جمع ہونے لگے۔ ایک مغل مورخ کہتا ہے کہ حیدرآباد میں اتنے "ہُنرورواں۔ پیشہ وراں۔ کارگراں" تھے کہ ان کی تفصیل کے لیے ایک جلد کی ضرورت ہے۔[2] مصنوعات میں کپڑا گولکنڈے کی خاص پیداوار تھی۔ کپڑا تمام مُلک میں بُنا جاتا تھا۔ غالباً یہ پہلے پہل مقامی ضروریات کے لیے بُنا جاتا تھا لیکن بعد کو اس کی باہر بھی برآمد ہونے لگی۔ اہلِ گولکنڈہ کے لطیف ذوق نے اس صنعت میں بڑا اضافہ کیا، ایسے اچھے کپڑے تیار ہوتے تھے کہ دوسری جگہ ان کی مثال نہیں تھی۔ جولاہے کسی کارخانے میں کام نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے گھر میں کام کرتے تھے اور خریدار پیشگی روپیہ دے کر اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق اچھے کپڑے تیار کرواتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر روز نیا کپڑا تیار ہوتا تھا، بافت و رنگ اور وضع میں ہر روز نت نئی اختراعیں پیدا ہوتی تھیں۔ کپڑے کی دو بڑی قسمیں تھیں، ایک سادہ اور دوسرے وضع دار۔ سادہ میں تن زیب اور کلف دار ہوتے تھے کلف دار کپڑے بھی مختلف قسم اور دبازت و رنگ کے تیار کیے جاتے تھے اور بعض بہت مضبوط بھی ہوتے تھے۔ تن زیب جو پتلا کپڑا ہوتا ہے مختلف رنگ کا تیار ہوتا تھا، اور ورنگل میں بنا جاتا تھا اور

---

[1] ۔ سیاحت نامہ تھیونیر جلد اول ص ۱۲۷۔

[2] ۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۲۔

یہ دونوں کپڑے سمندر کے راستے سے دوسرے ملکوں کو بھی جاتے تھے۔ ان کے علاوہ وضع دار کپڑے مختلف نقش و نگار کے ساتھ بنائے جاتے تھے جن کو چھینٹ کہتے ہیں، ان پر بڑی محنت اور ترکیب کرنی پڑتی تھی۔ یہ تن زیب اور کلف دار کپڑے سے بنائے جاتے تھے لیکن ان پر رنگارنگ کے چھاپے کیے جاتے تھے اور سادے کپڑوں پر قلمکار ہوتا تھا جو اپنے زمانے کی نایاب چیز تھی اور ایسا کہیں نہیں تیار ہوتا تھا۔ اگرچہ رنگین نقش و نگار ہاتھ اور قلم سے بنائے جاتے تھے لیکن یہ اس قدر پکے ہوتے تھے کہ دُھلنے سے کبھی بدرنگ نہیں ہوتے تھے بلکہ کپڑا پھٹنے تک رہتے۔ یہ کپڑے بالعموم ساحلی علاقوں میں اور بالخصوص مسولی پٹم اور نرساپور میں تیار ہوتے تھے اور ہندوستان میں مشہور تھے مسولی پٹم کا قلمکار اس قدر مشہور تھا کہ ہندوستان میں کہیں نہیں پیدا ہوتا تھا[1]، اور اس کی دُور دُور تک مانگ تھی۔

دوسری مصنوعات میں لوہے کے اوزار اور اسلحہ شامل ہیں۔ گولکنڈے کی سلطنت میں اچھا فولاد تیار ہوتا تھا، اور اس کے ہتھیار بنائے جاتے تھے۔ نرمل اور اندور میں جو گولکنڈے کے شمال میں واقع ہیں فولاد کی اچھی صنعت قایم تھی؛ یہاں اچھا فولاد تیار کیا جاتا تھا[2]۔ تھیونو کہتا ہے کہ اندلوائی میں جو اندور یا نظام آباد کے قریب ہے تلوار، خنجر اور نیزے تیار ہوتے ہیں اور تمام ہندوستان میں جاتے ہیں[3]۔ لکڑی کی صنعت بھی اچھی ہوتی تھی اور اس کے عمدہ صندوق، قلمدان اور دوسرا گھریلو سامان تیار ہوتا تھا، اور ان پر اچھی پالش کی جاتی تھی۔ یہ صنعت ابھی تک کونڈپلی میں جاری ہے۔ نرساپور پیٹ جو دریائے گوداوری پر واقع تھا اپنی صنعت کی وجہ سے بہت مشہور تھا، یہاں جہاز تیار ہوتے تھے، چنانچہ یہاں متعدد کارخانے تھے جن میں مسلمان۔ ہندو

---

[1] - گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۵۔ منوچی جلد دوم ص ۴۳۱۔

[2] - بلگرامی اور ولموٹ جلد اول ص ۳۹۹۔

[3] - سیاحت نامہ تھیونو جلد سوم ص ۲۳۵۔

اور پرتگالی اپنے جہاز تیار کرواتے تھے اور انھیں جہازوں کے ذریعے مختلف سامان ندیوں کے راستے سے باہر بھیجا جاتا تھا۔ یہاں بحری سفر کے قابل بڑے جہاز بھی بنتے تھے۔ چنانچہ انگریز کمپنی کا ملازم شورر کہتا ہے کہ انگریزوں نے بھی یہاں "گلوب" نامی اپنا ایک جہاز تیار کروایا تھا[1]۔ اس کے علاوہ ناگلو نچا میں نیل تیار کی جاتی تھی اور اس کی برآمد ہوتی تھی[2]۔ مسولی پٹم میں بارود اور کارتوس بھی بنتے تھے اور جہاز کے بادبان بھی تیار ہوتے تھے[3]۔ مسولی پٹم میں نمک بھی بنایا جاتا تھا۔

تجارت یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس زمانے میں سلطنت گولکنڈہ قایم ہو رہی تھی مغربی اقوام ہندوستان کا راستہ دریافت کر رہی تھیں! ان اقوام نے بھی چند ہی دنوں میں ہندوستان کے ساحلوں پر اپنے قدم جمالیے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کے آنے سے ہندوستان کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ گولکنڈے کی سلطنت مشرق میں واقع تھی اور جب یہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مشرقی ساحل کارومنڈل پر قابض ہوئی تو اس کے سامنے تجارت کی بہت سی راہیں کھل گئیں۔ سولھویں صدی میں صرف پرتگالی یہاں آئے تھے لیکن سترھویں صدی میں انگریز اور ولندیزی بھی یہاں متمکن ہو گئے، چنانچہ انھوں نے پلی کٹ، سان تھوم اور مسولی پٹم میں اپنی کمپنیاں قایم کریں۔ جب یہ بندرگاہیں قطب شاہی عملداری میں آگئیں تو ان سے قطب شاہی سلطنت کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن کے عہد میں مسولی پٹم نے اتنی ترقی کر لی کہ یہ اس زمانے کی بمبئی ہو گئی۔ یہ نہ صرف صنعت و حرفت کا بڑا مرکز تھا بلکہ انگریز اور ولندیزی کمپنیوں کی وجہ سے جو یورپ اور مشرقی ممالک سے تجارت کرتی تھیں اس کی حیثیت بین اقوامی تھی اور اسی بندرگاہ کی وجہ سے جس کو مچھلی بندر بھی کہتے تھے قطب شاہی سلطنت کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا۔ یورپ اور ایشیا کے لوگ اس سلطنت سے واقف ہوئے اور یہاں کی مصنوعات اور معدنیات باہر بہت فروخت ہوتیں اور

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۳۔

[2] ناگلو نچا، کھمم میٹ میں جنوب مشرق بارہ[12] میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

[3] گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۴۔

استعمال کی جاتی تھیں۔ گولکنڈے کی تجارت خشکی اور سمندر دونوں راستوں ہوتی تھی۔ ایک طرف ملکی تاجر غلہ اور مصنوعات بازار میں فروخت کرتے تھے اور ممالک غیر کی اشیاء اور مصنوعات کی درآمد کرتے تھے مگر ان تاجروں کی تجارت میں زیادہ فروغ اس وقت ہوا جبکہ مغربی تاجروں کی بدولت ملک کی مصنوعات اور پیداوار خام ملک کے باہر جانے لگی اور بیرونی مصنوعات باہر سے آنے لگیں۔ چنانچہ یہ تاجر اپنا سامان بندرگاہوں پر لے جا کر فروخت کرتے تھے اور مغربی تاجروں سے بیرونی سامان حاصل کرتے تھے قطب شاہی سلطنت بیرونی تاجروں کے مقابلے میں ملکی تاجروں کے ساتھ زیادہ رعایت کرتی تھی اور ان سے بالعموم محصول نہیں لیتی تھی۔ اور آخری زمانے میں مغربی تاجروں پر یہ شرط عائد تھی کہ وہ ملکی تاجروں پر کوئی محصول عائد نہ کریں۔ اس سے ملکی تجارت کو بہت فروغ ہوا لیکن ملکی تاجروں میں زیادہ تر ایرانی تھے اور غالباً مذہبی یگانگت کی وجہ سے ایرانیوں پر شاہی عنایات کی بوچھار ہوتی تھی۔ ساحلوں پر یہ ایرانی تاجر بھرے ہوئے تھے اور غالباً شاہی عنایات کی وجہ سے یہ بد اطلاق اور بد دماغ ہو گئے تھے[1]۔ لیکن دوسری طرف جو بحری تجارت ہوتی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ مسولی پٹم کے ساحل سے ہر سال بنگال۔ اراکان پیگو، اور تناسرم، اور جزائر ملایا کو جہاز جایا کرتے تھے۔ ان جہازوں میں ہر قسم کا کپڑا۔ لوہا۔ فولاد۔ سفید و رنگین سوت۔ تمباکو، اور نیل جایا کرتا تھا جو گولکنڈے کی برآمد تھی، اور جب یہ جہاز واپس آتے تھے تو ان میں شکر، بعض قسم کے کپڑے۔ یاقوت نیلم۔ لاکھ۔ سونا۔ ٹین، مختلف قسم کی لکڑی۔ مرتبان۔ ریشم۔ سیاہ مرچ آتی تھی[2]۔ بعض جہاز سیلون، اور مالدیو کو بھی جایا کرتے تھے اور وہاں کی خاص اشیاء لایا کرتے تھے اور یہ تمام اشیاء مسولی پٹم میں فروخت ہوتیں، اور ملکی تاجران کو خرید کے بازاروں میں لاتے تھے۔ درآمد میں یہ چیزیں بھی تھیں:۔ سیاہ مرچ۔ صندل کی لکڑی۔ سیسہ۔ چین کا ریشم۔ شکر۔ مشک۔ مسام دار، مٹی کے برتن۔ سرخ کپڑے۔

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۶۔ ۵۸۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۰۔

چین کا مخمل۔ لاکھ۔ بلوریں ظروف، وغیرہ۔ درآمد و برآمد پر ۱/۲ ۳ فی صدی محصول بہ شکل جنس یا عہدہ دار کی صوابدید سے بہ شکل زر محصول لیا جاتا تھا، یہ محصول سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ اِن محاصل درآمد و برآمد کے علاوہ مدراس اور مسولی پٹم کے تو طن کا کرایہ بھی وصول کیا جاتا تھا۔ پلی کٹ میں درآمد، برآمد کا محصول ۲ فی صدی تھا لیکن ہر جہاز سے جب وہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتا پندرہ ہون زاید محصول لیا جاتا تھا۔ یہ جہاز بالعموم سپٹمبر میں مشرق اور جنوری میں مغربی ممالک کو جایا کرتے تھے، ان میں دیسی تاجروں اور مخصوصاً مسلمانوں کے جہاز بھی تھے اور مغربی کمپنیوں کے جہاز یہ سامان یورپ لے جاتے تھے[1]۔

ملک کی خوش حالی

ان قدرتی اور انتظامی ذرایع کی بدولت جن کا اُوپر ذکر ہوا، قطب شاہی سلطنت کی آمدنی خاطر خواہ تھی۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد کے ایک گوشوارے سے سلطنت کی آمدنی دو کروڑ سیتالیس لاکھ پچاس ہزار پانچ سو تیرہ روپیے معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل سرکار اور پرگنوں کے اعتبار سے حسب ذیل ہے:۔

صوبہ ۱۔ سرکار محمد نگر ۱۲ پرگنے — [illegible] ۱۳/ر
سرکار میدک ۱۳ پرگنے — [illegible] ۶
سرکار کولاس ۵ پرگنے — [illegible] ۸/ر
سرکار ملکور ۳ پرگنے — [illegible]

صوبہ ۲۔ سرکار ایلگندل ۲۱ پرگنے — [illegible] ۱۴/ر
سرکار ورنگل ۱۶ پرگنے — [illegible] ۸/ر
سرکار کھمم میٹ ۱۱ پرگنے — [illegible] ۱۳/ر
سرکار دیورکنڈہ ۱۳ پرگنے — [illegible] ۱۴/ر

صوبہ ۳۔ سرپانگل ۵ پرگنے — [illegible] ۱۴/ر
سرکار مصطفےٰ نگر ۲۴ پرگنے — [illegible] ۱۵/ر
سرکار بھونگیر ۱۱ پرگنے — [illegible] ۹/ر
سرکار اکرکرا ۶ پرگنے — [illegible] ۱۲/ر

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۴ - ۵۵۔

صوبہ ۴۔ سرکار کویل کنڈہ ۱۳ پرگنے　سرکار گنپورہ ۸ پرگنے　سرکار مرتضےٰ نگر ۲۹ پرگنے　سرکار مچھلی پٹن ۸ پرگنے

[illegible]　[illegible]　[illegible]　[illegible]

۱۴ ار　۴ ر　۴ ر

صوبہ ۵۔ سرکار نظام پٹن محال　سرکار ایلور ۱۲ پرگنے　سرکار راج بندری ۲۴ پرگنے　سرکار سیکاکل ۱۵ پرگنے

لکان [illegible]　[illegible]　[illegible]　[illegible]

۱۵ ار　۱۱ ر

سرکار کانات

لکان [illegible]

صوبہ ۶۔ کرناٹک، یعنے ارکاٹ ۱۶ سرکار ۱۲۲ پرگنے

[illegible] ہون[1]

لیکن یہ صرف زمینات کی آمدنی تھی، معدنیات اور تجارت کی آمدنی اس کے علاوہ ہونی چاہیئے، کیونکہ اکیلے سرکار کونڈپلی کا محصول چالیس ہزار ہون، مسولی پٹم کا محصول اٹھارہ ہزار ہون اور نظام پٹن کا محصول پانچ لاکھ پانچ ہزار سے لے کر چھ لاکھ چھ ہزار تک وصول ہوتا تھا، یہ تجارتی مرکز تھے! اس طریقے سے سلطنت کی مجموعی آمدنی پانچ کروڑ روپیے ہونے چاہئیں[2] اور قرینہ یہ ہے کہ مصارف سلطنت منہا ہونے کے بعد تقریباً

---

[1] تاریخ ظفرہ ص ۱۷۳-۱۷۴-

[2] منوچی نے جو گولکنڈے کے آخری زمانے میں آیا تھا، سلطنت کی آمدنی پانچ کروڑ روپیہ بتائی ہے (منوچی جلد دوم ص ۴۱۵)۔ انگریزی کمپنی کے ملازم ولیم میتھولڈ نے سلطنت کی آمدنی پچیس ۲۵ لاکھ ہون یا ایک کروڑ روپیے، اور شورر نے

ایک کروڑ روپیے شاہی خزانے میں فاضل رہتے تھے، گو ایک انگریز نامہ نگار شورر نے صرف انیس[19] لاکھ ہون، یا تقریباً اسّی لاکھ روپیے سلطنت کی بچت بتائی ہے۔[1] اس میں بالکل شبہ نہیں ہے کہ سلطنت کی بچت بہت تھی اور شاہی خزانے ہمیشہ فاضلات سے بھرے رہتے تھے، گو یہ فاضلات اکثر خارجی سیاست کے نذر ہوئے، یعنی ایک طرف مغل حکومت کو پیش کش، خراج اور تاوان کی صورت میں ادا کیے گئے تو دوسری طرف مرہٹوں کو دیے گئے، لیکن اس کے باوجود شاہی خزانے میں بہت رقم تھی جو قلعے کے فاتحوں کو ملی، اس کے علاوہ قلعے میں بے شمار دفینے تھے جن سے بعد کی حکومتوں نے فائدہ اُٹھایا۔

اُمراء و عوام اُمراء اور عوام بھی بہت مال دار تھے۔ اُمراء کو دو طرح کی زمینیں و جاگیریں حاصل تھیں، ایک مدد معاش دوسرے فوجی خدمت کے لیے مشروط تھیں، لیکن آخر الذکر جاگیروں سے بھی ان کا ذاتی فائدہ بہت تھا۔ اس طرح ان کی مالی حالت بہت اچھی ہونی چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عوام میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے دو طرح کے لوگ تھے:۔ تاجر پیشہ جو اندرونِ ملک اور بندرگاہوں میں مغربی اقوام کے ساتھ تجارت کرتے تھے، بہت خوش حال اور مال دار تھے، لیکن ایسے تاجر زیادہ تر ایرانی تھے، یہ ایرانی سود پر روپیے کی لین دین بھی کرتے تھے اور چار فی صد سود لیتے تھے، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ بے حد مال دار ہو گئے تھے۔[1] لیکن دوسرے مسلمان سرکاری نوکری پر گذارہ کرتے تھے، گویا ان کی روزی سب شاہی خزانے سے ملتی تھی،[2] ممکن ہے کہ یہ لوگ اس زمانے کی ارزانی کی وجہ سے خوش حال ہوں، لیکن ان کا ذریعۂ معاش ناپائیدار تھا ہندو آبادی میں

---

[1] انیس[19] لاکھ اور دوسوں نے سترہ[17] لاکھ ہون بتائی ہے۔ آخر الذکر دو اعداد بہت پہلے کے ہیں، ممکن ہے سترھویں صدی کے اوائل میں آمدنی کم ہو، لیکن اس کو فاضل آمدنی سمجھنا چاہیئے۔ شورر نے تو اس کو واضح کر دیا ہے کہ انیس[19] لاکھ ہون فاضل آمدنی ہے۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۰ - ۵۶ - ۷۷۔

[1] ۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۷۔ [2] ۔ ایک انگریز نامہ نگار کہتا ہے کہ تقریباً تمام مسلمان شاہی خزانے سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۷۔

ملازم پیشہ و تاجر دونوں طرح کے لوگ تھے سلطنت کی مقامی حکومت اور وہی نظم و نسق سب انھیں کے ہاتھ میں تھا، نہ صرف اضلاع کے گورنر بلکہ تمام ساہوکار جو اضلاع ٹھیکے پر لیتے تھے اور مالگزاری ادا کرتے تھے سب ہندو تھے، تاجر اور کان کن بھی اکثر ہندو ہوتے تھے اور حکومت کی طرف سے معدنوں کی نگرانی بھی انھیں لوگوں کے سپرد تھی۔ ذیلی طبقے میں جو کاشتکار اور مزدوروں پر مشتمل تھا معاشی حالت کا پتا چلانا بہت مشکل ہے۔ قیاس یہ ہے کہ اجارہ داری کے قبیح عمل در آمد کی وجہ سے جو شروع سے ابو الحسن کے عہد تک جاری تھا کاشتکاروں کو بہت نقصان پہنچا تھا، اور یہ بے حد مفلس نظر آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثر دیہات ویران ہو گئے تھے، لیکن غالباً یہ بات بھی خلافِ قیاس نہیں ہے کہ یہ لوگ دراصل اتنے مفلس نہیں تھے جس قدر وہ نظر آتے تھے، ممکن ہے کہ یہ گورنروں اور اجارہ داروں کے ڈر سے اپنا اندوختہ زمین میں چھپا رکھتے ہوں[1]۔ لوہا، سونا و چاندی کا کام کرنے والوں کو تجارت گھروں سے تنخواہ ملتی تھی۔ لوہار و سنار کو سارے دن کی تین آنے مزدوری ملتی تھی، اور ان کے ملازم اور پالکی اٹھانے والے کہار ایک آنہ پاتے تھے، لیکن ان لوگوں کا یہ فرض تھا کہ اپنی کمائی میں سے مقامی حکام کی بھی خدمت کریں[2]۔ اس طریقے سے ذیلی طبقے کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی۔

قطب شاہی سلطنت میں غلہ اور دوسری اشیاء مندرجہ ذیل قیمتوں پر فروخت ہوتی تھیں جن سے اس زمانے کی طلب و رسد کا اندازہ ہو سکتا ہے:—

گیہوں۔ ۳ تا ۴ ہون ایک کھنڈی	بیل۔ ۱ تا ۲ ہون
چاول۔ ۱ تا ۱½ ″	بکرا۔ ۱ تا ۲ فنم
مکھن۔ ۷ تا ۱۰ فنم[3] ایک من (۲۱ اسیر)	مرغیاں۔ ۱ ہون ۶۰-۷۰ یا کبھی ۸۰

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۷۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۲۷

[3] فنم یا پنم مقامی سکہ تھا جو ہون کا سولھواں حصہ تھا قطب شاہی سلطنت میں چار قسم کے سکے رائج تھے، سب سے

انڈے - ۱ فنم ۸۰

سیاہ مرچ - ۲۵ ہون ایک کھنڈی

جوز - ۳۳ تا ۶۰ 〃 〃

لونگ - ۵½ تا ۱۰ 〃 ایک من

صندل کی لکڑی - ۱۰ تا ۱۲۰ ہون ایک کھنڈی

سیسہ - ۷ تا ۲۰ ہون 〃

ٹن - ۵۴ تا ۸۰ 〃 〃

پھٹکری - ۱۲ ہون 〃

چین کا خام ریشم - ۴۰ تا ۵۴ ہون ایک من

مشک - ۱۰ تا ۱۲ ہون ایک سیر

پارا - ۲۰ تا ۲۵ 〃 ایک من

کافور - ۵ تا ۲۰ 〃 ایک سیر

چینی مخمل - ۱ تا ۱¼ 〃 ایک گز

بلوریں سامان - ایک 〃 ۲ یا ۳ عدد

لاک کا سامان ¾ تا ایک ہون ایک عدد

آئینے بھی فروخت ہوتے تھے۔[1]

بڑا ہون تھا، یہ سونے کا سکّہ تھا جو مغل سلطنت کے تقریباً چار روپیوں کے برابر تھا۔ اس سے چھوٹا فنم یا پنم تھا جو ہون کا سولھواں حصہ ہوتا تھا، غالباً یہ بھی سونے کا سکّہ تھا، اور فنم آٹھ حصوں میں تقسیم تھا، اس آٹھویں حصے کو نول کہتے تھے، اور نول کے چار حصے ہوتے تھے اور اس کو تار کہتے تھے جو سب سے چھوٹا سکّہ ہوتا تھا۔

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۲-۶۳۔

تیئسواں باب

علمی سرپرستی

بیجاپور کے ساتھ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بھی علم و فن کی سچی پرستار تھی۔ اس سلطنت نے علم و فن کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک ایسا علمی سرمایہ چھوڑا جو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا گو یہ ایک حقیقت ہے کہ دکن کی تمام علمی سرگرمیاں بہمنیوں کی یادگاریں تھیں جنہوں نے اپنے بلند پایہ علمی ذوق سے دکن کو جگمگا دیا تھا۔ اور یہ کہنا صحیح ہے کہ گولکنڈے کا علمی شغف بہمنی سلطنت سے ورثہ میں ملا تھا چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین گلبرگہ اور بیدر کے علمی خزانوں کے ریزہ چیں تھے۔ تاہم اس خاندان کے بانی بھی ترکستان کے ایک ذی علم و شایستہ خاندان کے سپوت تھے اور اپنے ساتھ ایک اچھا علمی ذوق لے کر آئے تھے چنانچہ جب گولکنڈے کی سلطنت قایم ہوئی تو ان قطب شاہوں کی بہ دولت تلنگانے میں بھی علم کی بسا بچھ گئی، اور حیدر آباد بھی علم کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کے تمام فرماں روا سب کے سب تعلیم یافتہ اور علم و حکمت کے دل دادہ تھے جس طرح ان لوگوں نے بے لوث جہانبانی کو اپنا فرض منصب سمجھا تھا، اسی طرح علم و حکمت کی بھی سرپرستی کو اپنا شعار بنایا۔ علما و شعرا کو اپنے گھر میں دعوت دی، خود شاعری کی اور بڑی تصنیفیں لکھیں اور اس طریقے سے اپنی ذاتی دلچسپیوں سے علمی مشغلوں میں تازہ روح پھونک دی۔ ذاتی دلچسپیوں کے علاوہ اپنی رعایا کی ذہنی تربیت کا بھی انتظام کیا کہ وہ اس نعمت سے محروم نہ ہوں۔ ملک میں جگہ جگہ مدرسے بنائے اور بیش قرار معلم مقرر کیے اور مقامی زبان تلنگی کی اس طرح سرپرستی کی کہ گویا یہ خود ان کی زبان تھی تاکہ ملک کا ہر طبقہ دولتِ علم سے مالا مال ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب شاہوں کی اس علم دوستی کی وجہ سے تمام تلنگانے میں علم کی لہریں دوڑ گئیں اور اکتسابِ علم کا

عام شوق پیدا ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو پشتوں کے بعد ہی تمام ملک میں ایک علمی چہل پہل پیدا ہوگئی تھی مسلمان نو تمام تعلیم پاتے تھے اور کتب خانے جمع کرتے تھے، کیونکہ شاہی کتب خانوں کے علاوہ جن میں ہزار ہا کتابیں تھیں عام لوگوں کے بھی بے شمار کتب خانے تھے۔ لیکن ہندو رعایا بھی اس شوق سے خالی نہ تھی۔ ہندو طبقوں میں لکھنے پڑھنے اور حساب دانی کا خاطر خواہ مشغلہ تھا۔ سرکاری محکموں میں ان سے کام لیا جاتا تھا[1]، لیکن یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ مقامی زبان کے علاوہ ہندو، فارسی بھی پڑھتے تھے جو سرکاری زبان تھی چنانچہ مادنا کا تمام خاندان فارسی جانتا تھا، یہ شاہی فرامین لکھنے اور پڑھنے کے قابل تھا۔ قراین یہ ہیں کہ ملک میں ایسے متعدد خاندان ہوں گے جو اپنے کو ملک اور حکومت کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے تلنگی زبان کی ترقی اس کے علاوہ تھی، کیونکہ حکومت اس کی بھی بڑی سرپرست تھی۔

سلطان قلی کے عہد میں جبکہ سلطنت کی تاسیس ہو رہی تھی کسی علمی سرگرمی کی توقع رکھنا بے معنیٰ ہوگا، کیونکہ اس ابتدائی زمانے میں سلطنت کو بہت کچھ سیاسی و دفاعی کام کرنا تھا جو ہر نوخیز سلطنت کو کرنا پڑتا ہے۔ ہر سلطنت میں علمی و تمدنی کام اس وقت ہوتے ہیں جبکہ وہ چاروں طرف سے مستحکم ہو جائے اور ملک کے دل و دماغ ٹھنڈے دل سے علمی جستجو کر سکیں، اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ کے جانشین جمشید نے اپنے علمی شغف کا کافی ثبوت دیا تھا، لیکن گولکنڈے کی اصل علمی سرگرمیاں ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئیں جبکہ یہ سلطنت چاروں طرف سے مستحکم ہوگئی اور اس کو سانس لینے کا موقعہ ملا۔ چنانچہ اس کے جانشین محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد کے عہد حکومت جو بہت پُر امن تھے علمی و تمدنی ترقیوں کے لیے مختص تھے۔ قطب شاہوں کا تمام علمی سرمایہ انھیں دو عہدوں کا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قطب شاہی سلطنت اپنے زوال کے زمانے میں بھی جبکہ مختلف دشمن اس کے گھات میں لگے ہوئے تھے اپنا علمی و تمدنی سرمایہ اسی رفتار سے جمع کرتی رہی جیسے پہلے کرتی تھی۔ اور یہ کہنا خلاف واقعہ نہیں ہے کہ یہ اپنے آخری گھڑیوں تک عمرانی خدمت کرتی رہی، اس کا آخر تاجدار اپنی نظربندی میں بھی شعر و سخن کا مشغلہ رکھتا تھا، اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں کوئی علمی کام نہیں ہوا تاہم اس کا پائے تخت اہل علم سے خالی نہیں تھا، اتنا تو معلوم

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات۔ ہیکلت سوسائٹی ص ۱۵۔

ہوتا ہے کہ اس نے "آتش خانہ" کے نام سے ایک حلقہ بنا رکھا تھا جہاں علما جمع ہوتے تھے[1] اس کے جانشین جمشید قطب شاہ نے شعر و سخن میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، یہ اچھا شاعر تھا اور جمشید تخلص کرتا تھا بعض مرتبہ اس نے فی البدیہہ اشعار بھی کہے تھے، چنانچہ احمد نگر میں جب برہان نظام شاہ کی طرف سے جو شاہی اعزاز پیش کیے گئے تو نظم میں اس کا فی البدیہہ جواب دیا تھا، اس کے علاوہ فرصت کے موقعوں پر بھی اس نے بہت سے قصیدے اور غزلیں کہی تھیں۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے منجملہ ان کے چند قصیدے اور غزلیں نقل کی ہیں، ان کے چند نمونے یہ ہیں، ان سے سلاست زبان کا پتا چلتا ہے :-

قصیدہ

اے بتو ختم ملک زیبائی کار عشق از تو یافت بالائی

کاکل و چین زلف و خال لبت ہر یکے در کمال رعنائی

در رہِ عشق ہر کہ پا بہ نہاد آخر او سر کشد بہ رسوائی الخ

غزل - ۱

بے لبِ لعل بتان بادہ حرام است مرا لبِ میگون بنما چون سرِ جام است مرا

با سرِ زلفِ تو سودائے سیاہے دارم اینچہ سود است کہ با زلفِ چو شام است مرا

. . . .

. . . .

ترک این کار نخواہم من بیدل کردن من کہ جمشیدم و این کار تمام است مرا الخ

غزل - ۲

اشک از دیدہ بہ بینید کہ چون می آید قاصدے ہست کہ از شہر جنون می آید الخ

---

[1] شہپارے - ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

چند در عشقِ بُتان شہرہ شوی اے جمشید　گر کند غیر تو این کار زبون می آید

غزل-۳

آن پری روئے بہ بینید چسان می آید　دل زمن بُردہ کنون از پے جان می آید

جان بہ سودائے تو دادیم کہ سودے ببریم　نتیجہ سوداست کہ دایم بہ زیان می آید

....　..............

چون بہ بینند بتان از سر نازم گویند　عاشقِ دل شدہ جمشید جہان می آید الخ

غزل-۴

اے بہ رُخ نور دہ دیدۂ صاحب نظران　خون شد از محنت ہجرت دلِ خونین جگران

عمر ہا رفت کہ رفتی و براہ تو ہنوز　ہمچنان چشم ترم ماند بہ حیرت نگران الخ

غزل-۵

سر بلندی من از بالائے رعنائے تو شد　این پریشانیم از زلفِ سمن سائے تو شد

غزل-۶

سرو روانِ خویش را کردم درونِ دیدہ جا　تا پرورش باید دگران سرو زآب چشمِ ما

غزل-۷

بارِ جفائے جز تو نگارے نمی کشیم　غیر از جفا و جورِ تو بارے نمی کشیم

ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جبکہ سلطنت کی صحیح معنوں میں تعمیر ہوئی تھی علم و فن کی شاہی سرپرستی شروع ہوگئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو علم کا بڑا چسکا تھا چنانچہ اس نے اپنے اردگرد بڑے علما و فضلا جمع کر رکھے تھے اور ان کے ساتھ بادشاہ کی دلچسپ صحبتیں ہوتی تھیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ اہلِ علم سفر میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور ان سے مختلف مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں، چنانچہ تاریخ قطب شاہی کا مورخ کہتا ہے :-

"در سفر و حضر ہموارہ اہل فضل و ہنر در خدمتش می بودند، در مجلس ہمایون در مباحثہ علوم دینی
پرداختہ در تحقیق مسائل یقینی شرائط اہتمام بجائے می آوردند"[1]

یہ علما شاہی عنایات سے سرفراز ہوتے تھے۔ ابراہیم کے درباری علما کے چند نام یہ ہیں:۔ امیر شاہ محمد انجو۔ امیر عماد الدین محمود شیرازی۔ جالینوس الزماں قاسم بیگ شیرازی اور حسین قلی مرزا جو علم و منطق کے بڑے عالم تھے۔
ابراہیم نے مساجد اور دوسری عمارتوں کے علاوہ مدرسے بھی بنائے تھے:"مساجد و مدارس رفیعہ و عمارات رفیعہ کہ بریمن آن حضرت اتمام یافتہ"[2] اس عہد میں تالیف کا کام بھی شروع ہوگیا تھا، چنانچہ خور شاہ بن قباد الحسینی نے تاریخ قطب شاہی کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی[3]۔ اس کے جانشین محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں یہ علمی سرگرمی بہت بڑھ گئی اور اس کی علم دوستی اور قدر دانی کی وجہ سے بے شمار اہل علم گولکنڈے میں جمع ہوگئے، چنانچہ علامہ میر مومن استرآبادی جو بعد کو سلطنت کے پیشوا ہوگئے، اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے، غالباً علمی تبحر اور ان کی اخلاقی زندگی کی وجہ سے وہ "مرتضائے ممالک اسلام" کے لقب سے موسوم تھے، یہ فارسی کے بڑے شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔
ان کا فارسی دیوان بھی پایا جاتا ہے، ان کے علمی حلقوں سے حیدرآباد میں تعلیم و تعلم کی بڑی گرم بازاری تھی۔ ان کے علاوہ قاضی ہمدانی۔ میرک معین سبزواری۔ مرزا محمد امین سیستانی علمائے دربار تھے۔ مرزا محمد امین نے "خمسہ نظامی" کے جواب میں چار مثنویاں لکھی تھیں:۔ شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ فلک البروج اور مطلع الاشعار[4]۔ محمد قلی قطب شاہ نے مسجد شغلخانوں

---

[1] ماخوذ از مخطوطات مولفۂ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔
[2] تاریخ قطب شاہی ورق ۲۲۵۔ کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر۔
[3] یہ تاریخ عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۳۵ھ میں جاکر ختم ہوئی، اس میں قطب شاہوں کا حال نہیں ہے، اس کا ایک اچھا نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ہے۔
[4] مخطوطات۔ مولفۂ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔

اور حماموں کے ساتھ مدرسے بھی بنائے تھے جن کے آثار اب تک موجود ہیں، اور اس بادشاہ کی علم دوستی کا پتا دیتے ہیں۔ یہ خود بھی فارسی کا اچھا شاعر تھا، اور فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا، اس کے کلام کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں، یہ استادانہ کلام معلوم ہوتا ہے :۔

غزل ۔ ۱

با شمع بگو گرمیٔ دیوانۂ خود را — کاتش زند از رشک تو پروانۂ خود را
ہوش و خرد از پائے در افتند چو مستاں — چون سرمہ کشی نرگسِ مستانۂ خود را

غزل ۔ ۲

ملک محبت کہ داد خواہ ندارد — ملک چنین ہیچ بادشاہ ندارد

. . . . — . . . .

تکیہ کہ قطب شاہ کہ چون دگران نیست — جز کرم دوست تکیہ گاہ ندارد

غزل ۔ ۳

حرفے ز لب یار شنیدیم شنیدیم — صد شکر کہ این بادہ چشیدیم چشیدیم

. . . . — . . . .

اے قطب شاہ از درد دل خویش چہ گوئیم — مشتاق ترا از خویش ندیدیم ندیدیم

غزل ۔ ۴

بہ دور خط ز چشمت کم نشد شوخی و صیادی — کہ این دام دگر شد بہر دل بے خطہ آزادی

. . . . — . . . .

اگر چہ نیست زیبے بہ ز عدل و داد شاہان را — ازان زیبندہ تر باشد بہ عاشق از تو بیدادی[1]

---

[1] تاریخ قطب شاہی ۔ ورق ۲۸۳ ۔ ۲۸۴ ۔

سلطان محمد قطب شاہ اپنے باپ دادا سے زیادہ علم پرور بادشاہ ثابت ہوا، جیسے یہ مذہب پرست تھا ویسے وہ بہت بڑا عالم بھی تھا، اور تاریخ کے الفاظ یہ ہیں:۔ "از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام ایشان را حاصل است۔" تاریخ سے اس کو خاص دلچسپی تھی، چنانچہ نظام الدین کہتا ہے کہ سلطان محمد ہمیشہ کتب سیر و تواریخ پڑھتا تھا، اور اس کا حافظہ اس قدر زبردست تھا کہ ایک مرتبہ پڑھی ہوئی چیز اس کو ازبر ہو جاتی تھی اور جو واقعہ اس کے سامنے بیان کیا جاتا تھا وہ اپنے معلومات سے اس کی وضاحت کر دیتا تھا، اور یہ جو کتاب پڑھتا تھا اس کی پشت پر اپنے ہاتھ سے مصنف یا مولف کا حال اور ضروری توضیح کر دیتا تھا، چنانچہ اس وقت شاہی کتب خانے کی کئی کتابیں ایسی موجود ہیں جن پر سلطان محمد کے ہاتھ کی تحریریں پائی جاتی ہیں۔ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو ان سے سلطان محمد کے عہد کی اچھی تاریخ ہو سکتی ہے۔ ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد اپنے ہمعصر علما سے کسی طرح کم نہیں تھا بلکہ:۔ "فضلائے پائے سریر و فصحائے خویش تقرر بہ کمالات و استعداد آن مغفور و مبرور را اعتراف داشتند۔"[1] یہ اچھا شاعر بھی تھا اور فارسی میں ظل اللہ تخلص کرتا تھا، کلام سے شاعری کا صحیح ذوق اور بلند خیالی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دربار میں سید کمال الدین مازندرانی۔ میر قطب الدین نعمت اللہ جیسے لایق لوگ تھے۔ اس عہد میں کئی بلند پایہ تصنیفیں لکھی گئیں۔

---

[1] ۔ حدیقۃ السلاطین قطب شاہی ص ۲۲ ۔ ۲۳ ۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے ان الفاظ میں سلطان محمد کی علمیت پر روشنی ڈالی ہے:۔

"از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام ایشان را حاصل است۔ و استحضار آن حضرت در تواریخ بہ مرتبہ است کہ مورخان زمان ہرگونہ حکایتے را کہ ابتدا نمایند آن حضرت بہ اختلاف روایات بہ اتمام رسانند۔ و ہموارہ بہ ارباب فضل و حکمت صحبت داشتہ بہ افادات دانشمندانہ اہل مجلس را مستفیض می گردانند۔ و بے شائبہ تکلف ہر شخصے کہ در فنے از فنون دانشوری چہ از حکمت پرستان بالغ نظر و چہ از صنعت پردازان

تاریخ قطب شاہی جو قطب شاہی خاندان کی مستند تاریخ ہے اسی عہد میں اور اسی بادشاہ کے ایما سے لکھی گئی تھی[۱]۔ یہ بات کچھ خلافِ قیاس نہیں ہے کہ خود بادشاہ نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا تھا، چنانچہ ذیل کی نو کتابیں اسی بادشاہ سے منسوب کی جاتی ہیں:۔

(۱) روح القدس (۲) ظفر القلوب (۳) قدرت نامہ (۴) مصباح الارواح (۵) احکام المجبین

(۶) نہایت الحکم (۷) ہدایتہ المحبنہ (۸) ہدایت المعرہ (۹) فتح ابواب۔

کتابوں کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف علوم مثلاً تصوف۔ اخلاقیات۔ سائنس اور فلسفہ ان کے موضوع تھے اگر یہ درحقیقت سلطان محمد کی تصنیفیں تھیں تو ان سے اس کا علمی تبحر معلوم ہوتا ہے، اور اگر یہ اس کی نہیں ہیں تو یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ سب تصنیفیں کم از کم اسی عہد میں اور اسی بادشاہ کی سرپرستی میں تالیف ہوئی تھیں اور اس سے سلطان کی علمی سرپرستی معلوم ہوتی ہے[۲]۔ یہ بڑا شاعر بھی تھا، اس نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی تھی، ظل اللہ اور

صاحبِ ذوقی سالہائے دراز پیشِ کاملان مشق آن علم کردہ باشد چو بشرف ملازمت نکتہ یاب دقیقہ فہم می رسد از مشاہدہ کمال دانش خود را گم کردہ در مقام حیرت می آید و بدائع آنکہ در مشارب مختلفہ و مدارج متنوعہ در یک مجلس آرا سر می فرمایند کہ بر طبع عالم دشوار نمی آید .... نیز آن حضرت را در نظم و نثر پایۂ اعلیٰ است۔

ظل اللہ تخلص اشرف می فرمایند۔"

تاریخ قطب شاہی ورق ۳۰۲ کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر۔ اس اقتباس کا ایک ٹکڑا سب سے پہلے میں نے مخطوطات مولفہ ہاشمی صاحب میں دیکھا تھا۔

[۱] ماس کا مولف نامعلوم ہے، اس میں ۱۰۲۶ھ کے حالات درج ہیں۔

[۲] ان کتابوں کا مجموعہ نواب سر سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کے سرورق پر "لعبد الخالق

سلطان تخلص کرتا تھا۔ اس کا فارسی کلام بھی بہت ملتا ہے جو مختلف اصناف پر مشتمل ہے یعنی قصیدہ۔ رباعی۔ غزل۔ مرثیے اس نے متعدد لکھے تھے۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زبان اور خیالات پر بڑی قدرت تھی۔ فارسی کلام کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں:۔

حمد حضرت باری تعالیٰ

یارب چہ برتری تو ز وصفِ لسانِ ما پنہان شدہ ز شرم زبان در دہانِ ما

در حضرتت یقین و گمان راچو راہ نیست حیران وصف تست یقین و گمانِ ما

. . . .

. . . .

ظل اللہ از شر بدان در پناہ تست اے درگہ جلال تو دارالامانِ ما الخ

نعت و منقبت

مصطفیٰؐ و مرتضیٰؑ چون نیستند از ہم جدا نعت و مدح ہر دو شہ را می کنم با ہم ادا

آن یکے فرماں روائے ہر نبیؐ و ہر ولی وان دگر مسند نشینِ بارگاہ کبریا

. . . .

. . . .

ہمچو ظل اللہ یابی شاہ راہے از بہشت گر بدانی بعد پیغمبرؐ علیؑ را مقتدا الخ

منقبت حضرت چہار دہ معصوم

بعد ذکر مصطفیٰؐ و ذکر شاہ اولیا خوش بود ذکر و درود جملہ خاصان خدا

السلطان محمد قطب شاہ" کے الفاظ درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں سب سلطان محمد کی تصنیفیں ہیں۔

. . . .

. . . .

شکر این نعمت چسان گویم کہ از لطف اله — ہمچو ظل اللہ ندانم غیر ایشان مقتدا الخ

غزل۔۱

یافت وصل تو دلم صدق و صفا را دریاب — اثر مہر نگر فیض و فا را دریاب

رہنمایان ہمہ در عشق تو رہ گم کردند — اندرین رہ دل بے راہ نما را دریاب الخ

غزل۔۲

قرب یارم زِ عشق و دولت اوست — این ہمہ حشمتم بہ ہمتِ اوست

نعمتِ عشق کم نمی دانم — شرمساری زِ حق نعمت اوست الخ

رباعی۔۱

اے در گہ تو سجدہ گہ شاہ و گدا — در خورد تو توحید کہ دارد یارا

از امر مطاع قل ہو اللہ احد — شد جرأت این بیان دلکش مارا

رباعی۔۲

ہر چند کہ حق داد عطا خواہد بود — روزے کہ ز نیک و بد سزا خواہد بود

در عرصہ میار آنچہ لیلیٰ نہ بود — کز لطفِ کریما نہ خدا خواہد بود

مرثیہ۔۱

آمد محرم و غم دل بر ملا ست باز — در دہر شور و زلزلۂ کربلا ست باز الخ

مرثیہ۔۲

دوران غم زِ ماہ محرم رسیدہ است — ہنگام آہ و نالہ و ماتم رسیدہ است

مرثیہ ۔۳

اے چرخ از تو رنج و بلائے عجب رسید شرمے کہ فتنۂ تو بجائے عجب رسید

مرثیہ ۔۴

آن دورِ ماتم است کہ از غم زباں نماند آن عہدِ غم کہ طاقت تاب و توان نماند

مرثیہ ۔۵

در کربلا ہجومِ بلا را نظر کنید جمعیتِ بلا ہمہ یکجا نظر کنید

عبداللہ قطب شاہ کا عہدِ حکومت بھی علمی سرگرمیوں کا بہت بڑا منبع تھا۔ اپنے اسلاف کی طرح یہ بادشاہ بھی بہت بڑا علم دوست تھا، اس کی تعلیم و تربیت بڑے اچھے پیمانے پر ہوئی تھی، اس کے دربار میں بھی بڑے عالم جمع تھے اور وہ یہ ہیں :۔ علامی میر مجدالدین۔ مولانا رونقی۔ قاضی احسن میرمیراں حکیم عبدالجبار گیلانی۔ شیخ عبداللطیف۔ نور اللہ۔ مرزا محمد جو ہر تبریزی۔ مرزا حمزہ استرآبادی۔ میر فضل اللہ شیرازی۔ شیخ ہارون۔ مُلّا تفتائی شیرازی۔ ملا عرب خوشنویس۔ ان شعرا، اور علما کے ساتھ بادشاہ کی رات رات بھر علمی محفلیں گرم رہتی تھیں جہاں استادوں کے کلام پڑھے جاتے تھے اور ان پر بحث ہوتی تھی اس عہد میں مختلف علوم کی کتابیں تصنیف ہوئیں جن سے قطب شاہی خاندان کو بہت بڑا امتیاز ہے۔ نظام الدین احمد نے اس عہد کی حدیقۃ السلاطین قطب شاہی کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی علامہ ابن خاتون نے کتاب الارشاد، اور جامع عباسی پر حواشی لکھے اور اربعین کا ترجمہ کیا۔ علامہ جمال الدین نے المصباح کا اور مُلّا علی ابن طیفور نے عیون اخبار رضا کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولانا حسین آملی نے نہج البلاغہ کی شرح لکھی۔ مُلّا فتح اللہ سمنانی نے امام یافعیؒ کی کتاب روض الریاحین کا ترجمہ کیا[1]۔ اس کے علاوہ ابن عماد روزبھان نے خرقۃ العلما کے نام سے ایک فاضلانہ تصنیف لکھی تھی جس میں مختلف علوم و فنون مدون کیے گئے اس میں چھ جلدیں ہیں :۔ جلد اول تفسیر۔ جلد دوم

---

[1] ہاشمی صاحب۔

حدیث جلد سوم فقہ۔ اس جلد کا نام مجمع الدقائق ہے۔ جلد چہارم علل اشیا، اس جلد کا نام کاشف الاسرار ہے۔ جلد پنجم حکمت جلد ششم علوم متفرقہ۔ غرض اس ایک کتاب میں سائنس فلسفہ۔ دینیات، تمام علوم پر بحث کی گئی ہے جو قطب شاہی دور کی بہت بڑی یادگار ہے[1]۔ برہان قاطع کے نام سے ایک مشہور فارسی لغت بھی لکھائی گئی جواب بھی متداول ہے۔ اس کا مولف محمد حسین ہے جو برہان تخلص کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے عبداللہ قطب شاہ کی سرپرستی میں ایک لغت لکھی تھی۔

اُردو کی سرپرستی

اُردو زبان کی سرپرستی قطب شاہی خاندان کا بہت بڑا طغرائے امتیاز ہے۔ دوسرے دکنی درباروں کی طرح قطب شاہوں نے بھی اُردو یا دکنی کو سنوارنے میں پورا حصہ لیا۔ ان بادشاہوں نے دکنی زبان اور اس کے شاعروں کو وہ درجہ دیا جو مغل شہنشا فارسی شاعروں کو دیتے تھے۔ مغل دربار میں فیضی اور ابوطالب کلیم ملک الشعرا تھے تو دکنی درباروں میں وجہی، غواصی جیسے دکنی شاعروں کو ملک الشعرا ہونے کی عزت حاصل تھی۔ بلکہ بادشاہوں نے اسی زبان میں شاعری کر کے دکنی زبان کو ایسا اجاگر کر دیا کہ وہ شاہی زبان ہوگئی اور لوگ اس کو اپنی زبان کہتے ہوئے فخر کرنے لگے، ورنہ عادل شاہی اور قطب شاہی سرپرستی سے پہلے دکنی کو کون پوچھتا تھا۔ اس سرپرستی کے غالباً دو محرکات تھے، ایک تو سلطنتِ گجرات کا مغل سلطنت میں الحاق تھا جب ۹۸۰ھ ۱۵۷۲ء میں شہنشاہ اکبر نے گجرات فتح کیا تو یہاں کے اُردو شاعر سب بھاگ کر دکنی درباروں میں پناہ گزیں ہوگئے اور ان کی سرپرستی حاصل کی حضرت شاہ میراںؒ جی کا ورود بیجاپور میں جو دکنی زبان کے بہت بڑے قائد تھے اس تاریخ کا پہلا باب سمجھنا چاہیئے۔ دوسرا محرک دکن کی شمال سے تمدنی کشمکش تھی۔ شمال و دکن کی آویزش بہ ظاہر سیاسی معلوم ہوتی تھی، لیکن اگر اس کے اجزائے ترکیبی ایک کیے جائیں تو اس میں تمدنی کشمکش کے بھی

---

[1] اس کتاب کا صرف ایک نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے اور بہت بوسیدہ ہے۔

بہت سے مناظر دکھائی دیں گے۔ جس طرح دکنی دربار اپنے دست و بازو سے مغل سطوت کا مقابلہ کرتے تھے کچھ اسی طرح اپنی تمدنی برتری ظاہر کر کے اپنی ہستی قایم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور چونکہ زبان تمدن کا بہت بڑا عنصر ہے اس لیے اس ہتھیار سے بھی شمالی طاقت کا مقابلہ کیا جاتا تھا یعنی شمال میں فارسی کی سرپرستی ہوتی تھی تو اہل دکن اس کے علی الرغم دکنی زبان کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتے تھے اور دکنی ملّت قایم رکھنے کا یہی ایک ذریعہ تھا، ورنہ مغل دربار کی طرح یہاں بھی فارسی کا بول بالا ہوتا تو دکنی انفرادیت ختم ہو جاتی اور مغل سیلاب میں ڈوب جاتی۔ کچھ اس طریقے سے اُردو کے پیچھے جذباتی اور قومی تائید تھی جو اس کے حیاتِ جاوید کا باعث ہوئی۔

اس سرپرستی کا پہلا سہرا غالباً عادل شاہی دربار کے سر ہے کیونکہ اسی خاندان کو گولکنڈے سے پہلے مغلوں کے ساتھ کشمکشِ حیات کرنی پڑی۔ اس کے علاوہ گجرات کی بساط الٹی تو اُردو کا تمام سرمایۂ حیات پہلے بیجاپور آیا، کیونکہ یہ احمد آباد کے پڑوس میں تھا اور جو شاعر یہاں جمع ہوئے تھے وہ سب عادل شاہی دامانِ فیض سے چمٹے ہوئے مخلصانہ اُردو ادب کی خدمت کرنے لگے اور دکنی کو مختلف اصنافِ سخن سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ وہ فارسی سے بہت آگے بڑھ گئی۔ اس طریقے سے یہ کہنا چاہیئے کہ گولکنڈہ اس میدان میں بیجاپور سے کچھ پیچھے تھا، اور غالباً یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ قطب شاہی سرپرستی بیجاپور کی نقشِ ثانی تھی، کیونکہ اس کی زمین دوز لہریں شاید بیجاپور سے ہی یہاں آئی تھیں۔ تاہم قطب شاہی دربار نے اُردو کی کم خدمت نہیں کی۔ جو اصنافِ سخن، بلکہ مضامین بیجاپور نے پیدا کیے تھے وہ گولکنڈے نے بھی کیے۔ گولکنڈے کو یہ امتیاز ہے کہ اس کے سلاطین سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علم دوست تھے، انھوں نے اُردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اس میں شاعری کی اور بڑے دواوین چھوڑے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ قطب شاہی دربار کا بیجاپور پر بھی اثر پڑتا تھا۔ اگر پہلی منزلوں میں گولکنڈے نے بیجاپور کی شاگردی کی تھی تو آگے چل کر اس نے استادی کا بھی فخر حاصل کیا۔ بیجاپور کے شاعر مقیمی نے اپنے کلام میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ غواصی کا خوشہ چیں ہے۔ اس کے علاوہ بیجاپور کا آخری دَور جس میں مُلّا نصرتی اور اس کے ہمعصر طبع آزمائی کرتے تھے قطب شاہی رہنمائی کا ممنون تھا، کیونکہ علی عادل شاہ ثانی کی

ماں خدیجہ سلطانہ جو بیجاپور کی تاریخ میں حاجی بڑے صاحب کے نام سے مشہور ہے، تمام ادبی سرگرمیوں کی روحِ رواں تھی، اسی نے بیجاپور میں پھر علمی اور ادبی سرگرمیوں کا سامان پیدا کیا۔ ٹوٹے ہوئے شاعروں کی دستگیری کی اور ظاہر ہے کہ یہ رہنمائی گولکنڈے سے آئی تھی، کیونکہ خدیجہ سلطانہ عبد اللہ قطب شاہ کی بہن تھی۔

سلطان قلی قطب شاہ اور جمشید قطب شاہ کے عہد میں تو دکنی کی کوئی خدمت نہیں ہوئی مگر ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جبکہ قطب شاہی سلطنت مستحکم ہوگئی تو دکنی کا شوق پیدا ہو گیا چنانچہ اس عہد میں فیروز، و، محمود دو اُردو شاعروں کے نام آتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے شاعر تھے، گو ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا، اور ان شاعروں کے حالات بھی معلوم نہیں ہوتے تاہم ان کے وجود سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں اُردو ادب کی خدمت کا پایہ پڑ گیا تھا، اور جب اس کے جانشین بر سرِ حکومت ہوئے تو ان کو ترقی کرنے کا موقع ملا کیونکہ محمد قلی اور سلطان محمد کے عہد میں سلطنت چاروں طرف سے بہت پُر امن تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے تیس سالہ عہد حکومت میں اُردو کی اتنی خدمت کی کہ اس کو ارتقائی منازل پر پہنچا دیا، اُردو ایک شایستہ زبان ہوگئی، یہ خود بھی ایک قادر الکلام شاعر تھا، اور اُردو میں معانی تخلص کرتا تھا، اس کے کلام کا ایک وسیع مجموعہ موجود ہے جس میں قصیدے۔ غزلیں اور مرثیے اور قطعات کے سے کئی اصنافِ سخن پائے جاتے ہیں۔ سیاسی۔ معاشرتی اور سماجی ہر مضمون پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کے کلام میں ادبی روانی اور بہت گھلاوٹ پائی جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا۔ غالباً دُنیا کے بادشاہوں میں اتنا پُر گو شاعر جس کو زندگی کے ہر پہلو سے مس ہو نہیں پیدا ہوا۔ اُردو کی ادبی تاریخ اس پر جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ کلام کے چند نمونے یہ ہیں:-

قصیدہ عید نوروز

کہ نس دن عید ہور نوروز منج کون نت خدا دیتا

میرے دل مرغ کی خاطر پھولان عشرت نوا دیتا

رباعی

اپ دوست سوں مل پنتہ کہ میں جام منگوں اس ہونٹ شکر ایسے تھے میں کام منگوں
آرام دل آرام تھے ہے دل کو ن سدا میں اپنے دل آرام تھے آرام منگوں

نظم جلوہ

پرم پیاری کا جلوہ گاو سارے اسے چند سورسوں پر یان سنگارے
سہاگان بھاگ پھل مستک کھلے ہیں سہیلیاں آرتی نارے نوارے
رچا و و تخت جلوے کا خوشی سوں کہ چو ند ہر چوک موتیاں سوں سنوارے

غزل ۔ ۱

ہے عشق ہر اک دہات ہر اک دل میں پیارا مج عشق پیاری کا ابے جیو کا ادہارا

. . . .

اے قطب معانی کہ ترا قطب خطا ہے کر شکر خدا پر کہ قرار ہے سو ستارا

غزل ۔ ۲

باغ دل میں تج محبت کا اچنبا پھل لگیا باس سنگ پھولاں عرق کلیں ہوا ہوں ڈلگیا
بے علم ہور بے کتب ہور کس تھے پوچھیا جائے نا عالمان بچارہ دکھ کر اسکی تک میں رہے تھکیا

. . . .

تم معانی کے گناہاں کا رقم کرتے ہیں کی میں محمد نانوں تے دونوں جہاں میانے جگیا[1]

محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں اُردو کے اکثر شاعر تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس وقت صرف

---

[1] ماخوذ از کلیات محمد قلی قطب شاہ اس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور شایع کر رہے ہیں ۔

دو شاعروں کے حال معلوم ہوتے ہیں، ایک وجہی اور دوسرے احمد۔ وجہی ایک بلند پایہ شاعر تھا جو غالباً ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا، لیکن اس کا شاعرانہ کمال سب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ظاہر ہوئے اور اس کی بڑی شہرت ہوئی، اس نے نظم میں قطب مشتری اور نثر میں سب رس کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ دونوں قصے ہیں جو بڑے لطیف اور استادانہ انداز میں لکھے گئے ہیں، یہ ادبی تاریخ کا بہت بڑا اضافہ ہے۔ احمد نے بادشاہ کے حکم سے لیلیٰ مجنوں لکھی تھی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ محمد قلی کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اُردو کے کوئی شاعر منظر عام پر نہیں آئے، حالانکہ خود سلطان محمد نے اُردو میں ایک دیوان لکھا تھا[1]، اور اس میں وہ قطب شاہ تخلص کرتا ہے۔ اپنے چچا کے کلام کو بھی اسی نے مرتب کیا، اور اس پر مقدمہ لکھا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اُردو سے زیادہ فارسی اور عربی سے دلچسپی تھی اس لیے اس کے عہد میں فارسی میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ حالانکہ اُردو کے نوخیز شاعر جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں منظرِ عام پر آئے تھے سلطان محمد کے عہد میں موجود تھے لیکن ان کی دربار سے آؤ بھگت نہیں ہوئی، اس لیے جہاں تک اُردو کا تعلق ہے سلطان محمد کا عہد بالکل خالی معلوم ہوتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں جو پچاس سال طویل ہے اُردو نے انتہائی ترقی کرلی اس کو اُردو ادب کا سنہری زمانہ کہنا چاہیئے۔ اول تو خود بادشاہ نے جو بڑا عالم و شاعر تھا، اُردو ادب میں دلچسپی لی، ایک دیوان لکھا۔ اس کا طرز بیان سلطان محمد سے زیادہ صاف اور سلیس سمجھا جاتا ہے گو اس کے کلام میں اتنی روانی اور لوچ نہیں ہے جیسے اس کے دادا محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ عبداللہ تخلص کرتا تھا، اس کے کلام کے چند نمونے یہ ہیں:۔

غزل۔ ۱

منجے نور و زر تھے اگلا صفا تم لکھ جدا دیتا　　　صفا جیسا جو منگتا تھا سو ویسا منج خدا دیتا

---

[1] سلطان قلی قطب شاہ کا اُردو دیوان اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

ترا قد پھول کی ڈالی نمن کھل مکمکانے تھے | خوشی پا جیو کا بلبل سو غم کون سب و دا دیتا
ودا ع

. . . .

نبیؐ کے صدقے عبد اللہ سدا توں شکر کر اس کا | جکوئی تج کون نوازیا ہور شاہی کا ہدا دیتا
ہدایت

غزل۔ ۲

اثر عشق کا آ میرے سر چڑ یا | تو میں وصل سون ل برہ سوں لڑ یا
واق
ہوا ہوں ترے روپ پر مبتلا | تو تج سوں منجے کام آ کر پڑ یا

. . . .

بنی صدقے عبد اللہ سلطان کے | ہر اک بول کو میں سنے پیں مڑیا[1]
سونے

دوسرے اس کی سرپرستی میں اُردو کے بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی اور بڑا ادبی سرمایہ چھوڑا۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عبد اللہ کے عہد میں اُردو ایک مستند زبان ہوگئی، اس عہد میں غواصی اور ابنِ نشاطی دو[2] بڑے شاعر گزرے ہیں۔ غواصی نے سیف الملوک بدیع الجمال اور طوطی نامہ کی مشہور مثنویاں لکھی ہیں، یہ دونوں قصّے ہیں اور اپنے فن کا کمال سمجھے جاتے ہیں۔ ابن نشاطی کی تصنیف پھول بنؔ خاص شہرت رکھتی ہے، یہ بھی ایک قصّہ ہے جو کسی فارسی قصّے کا ترجمہ ہے، لیکن اپنے اسلوب بیان اور قصّے کی ترتیب کے لحاظ سے یہ قطب شاہی دَور کی بہت بڑی یادگار ہے۔ ان مشہور شاعروں کے علاوہ طبعی اور امین بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اول الذکر نے بھرام و گل اندام کے نام سے ایک دلچسپ قصّہ لکھا تھا جس میں زبان اور اسلوب بیان کا لحاظ کرتے بہت دل کش ہے۔ عبد اللہ کے انتقال کے بعد یہ ادبی سرگرمی ختم نہیں ہوئی بلکہ برابر جاری رہی چنانچہ ابوالحسن قطب شاہ جو بہت تعلیم یافتہ صاحبِ ذوق آدمی تھا، اُردو کا بڑا مُربی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں

---

[1] کلیات عبد اللہ قطب شاہ۔ اس کو سید محمد صاحب ام اے لکچرار سٹی کالج شایع کر رہے ہیں۔

شاعری کی تھی اور قید میں بھی شعر و سخن کے مشغلے کو نہیں چھوڑا تھا لیکن دو ایک اشعار کے سوا اس کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ نمونے کے لیے ذیل میں ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

کس در کھوں جاوں کہاں مجھ دل پہ پھل پہاڑ ہے
یک بات کے ہونگے سجن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے[۱]

لیکن بادشاہ کے علاوہ اس بدنصیب عہد میں کئی شاعر بھی ہوئے تھے جو شعر و سخن کے مشغلے میں مصروف تھے چنانچہ فائز۔ لطیف۔ شاہی۔ نوری۔ مرزا غلام علی مشہور شاعر تھے۔ ان میں فائز اور شاہی بلند پایہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ مرزا ابوالحسن کا بہت وفادار درباری تھا۔ ان سب کا کلام قصوں اور مثنویوں کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے اور اس طریقے سے کہا جا سکتا ہے کہ ابوالحسن کا عہد اُردو شعر و سخن کی خدمت سے خالی نہیں تھا۔

تلنگی کی سرپرستی قطب شاہوں نے تلنگی زبان اور ادب کی بھی اسی گرمجوشی سے سرپرستی کی تھی جیسے وہ اُردو اور فارسی کی کرتے تھے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ قطب شاہ تلنگانے کو اپنا وطن، اور تلنگی زبان کو اپنی زبان سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے اس مقامی زبان کی مخلصانہ خدمت کی، اس کے زبان دانوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کرکے اس کے ادب کو بہت بڑھایا۔ یہ خود تلنگی جانتے تھے اور اس میں شاعری کرتے تھے۔ اگر قطب شاہی دَور کو آندھرا دیش اور تلنگی ادب کا سُنہری زمانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ قطب شاہوں سے پہلے اور پھر ان کے بعد تلنگی کو ایسی شاہانہ سرپرستی نہیں نصیب ہوئی اور ظاہر ہے کہ ہر زبان بادشاہوں کے درباروں میں پروان چڑھتی ہے۔ ابراہیم قطب شاہ تلنگی کا سب سے پہلا سرپرست ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی دیورکنڈے میں گذری تھی اور اس کے بعد یہ سات سال وجیانگر میں جلا وطن رہا۔ غالباً اسی ماحول میں اس نے مقامی اثرات اپنے میں جذب کیے اور تلنگی کا ذوق حاصل کیا، یہ تلنگی خوب جانتا تھا اور اس کا

---

[۱]۔ دکنی مخطوطات مولفۂ نصیر الدین صاحب ہاشمی۔

استادانہ کلام سمجھتا تھا۔ اس کے دربار میں عربی و فارسی کے علماء کی طرح تلنگی زبان کے کئی شاعر تھے اور ان کو شاہانہ سرپرستی حاصل تھی۔ منجملہ ان کے ادنکی گنگا دھر نامی تلنگی کا ایک مشہور شاعر تھا جو ادبیات تلنگی کا بڑا قائد سمجھا جاتا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی میں اس نے تلنگی ادب کی مشہور کتاب تپتی سمورن پا کھیانم[۱] جو بلند پایہ تصنیف ہے لکھی تھی ابراہیم کے درباری اُمرا بھی تلنگی ادب کے بڑے سرپرست تھے۔ چنانچہ اس کے ایک سردار امین خاں کو لوگ اب بھی جانتے ہیں جس نے ایک مشہور شاعر پنا گنڈی تلگنا آریہ کی سرپرستی کی تھی، اس شاعر نے جو پٹنچرو کا رہنے والا تھا ادب کی ایک زبردست کتاب لکھی تھی جس کا نام "یے یاتی چیرترا" ہے۔ اس کتاب سے اس زمانے کے رسم و رواج، سماجی زندگی اور تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح امین خاں نے جو پٹنچرو کا گورنر تھا شیو پرستی کی رہبانیت کو توڑنے کی کوشش کی تھی اور اس کی بیوی شکر بی بی نیچ ذات غربا میں گھوم کر ان کو کھانا کپڑا دیتی تھی۔

خاندان قطب شاہی کا بڑا قومی معمار محمد قلی قطب شاہ نے آندھرا دیس کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اگر اس کے باپ دادا تھوڑے بہت غیر مُلکی تھے تو محمد قلی تو بالکل تلنگانے کا آدمی تھا، کیونکہ اگر ماہ نامے کے مولف کا خیال صحیح سمجھا جائے تو اس کی رگوں میں تلنگی خون دوڑتا تھا، اس کو تلنگانہ اور اس کی قومی و معاشرتی روایتوں سے جو اُنس ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کی قوم پرورتحریکوں کی بدولت تلنگانے کے طول و عرض میں نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ قومی تعمیر کے سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ کا قابلِ قدر کام یہ تھا کہ اس نے تلنگی زبان کی خاطر خواہ قدر کی۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے عہد میں تلنگی زبان میں بہت سی ادبی کتابیں لکھی گئی ہونگی۔ محمد قلی قطب شاہ خود بھی تلنگی زبان کا بڑا اول دادہ تھا، اور یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے تلنگی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کیا تھا لیکن یہ دیوان اب دستیاب نہیں ہوتا تاہم اس کی دوسری نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مقامی زبان سے کتنی دلبستگی تھی۔

---

[۱] یہ کتاب سبا راؤ صاحب پروفیسر تلنگی جامعہ عثمانیہ نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شایع کی ہے اور تلنگی کی سرپرستی سے متعلق جو معلومات درج ہیں وہ سب پروفیسر موصوف کے مقالے سے ماخوذ ہیں۔

اس کے اُردو دیوان میں اکثر تلنگی کے الفاظ ملتے ہیں جو بلاتکلف استعمال ہوئے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اُردو نظموں میں مقامی ہندو تہواروں اور معاشرتی دلچسپیوں کا ذکر ہے اور ان کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، چنانچہ بسنت کی عید۔ ساون، بھودون کی موسمی روایات۔ تلنگن کا سراپا، اور بھوکڑی بھو کے کھیل کو اس نے ایک شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے اسلامی روایات کے ساتھ مقامی روایات کو بھی خاطر خواہ جگہ دی تھی اور اس طرح دونوں روایتوں کے امتزاج سے ایک جدید قوم تعمیر کی گئی اس کی چند اردو کی نظمیں یہ ہیں۔

بسنت کی عید

پیارے بسنت کا ہوا آئیا   سکیاں تن مشک زعفراں لائیا

. . . .

پیارے لکھ میانے کھیلیا بسنت   پھولاں حوض تھے چرکے چھڑکیا بسنت الخ

بھوکڑی بھو

سکی تال دے منج ٹنکتی کھڑی   کہ ڈہاں ڈہکنی کھل کو ہنکنی کھڑی الخ

تلنگن

پیاری جو وتی میں ہنت تج پیم   منجے جیو دیوانا ہے پیم میں نیم

. . . .

. . . .

بنی صدقے قطب شہ سا تو لی سون   بچن ہندی سون بولے ایم مریم[1]

ایم رے ایم

---

[1] کلیات محمد قلی قطب شاہ۔

چوبیسواں باب

شہر وعمارات

شہر حیدر آباد کی تعمیر

شہر وعمارات کی تعمیر بھی قطب شاہوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ان کا پاکیزہ ذوق، سلیقہ جو شہر وعمارات کی تعمیر میں ظاہر ہوا، قرونِ وسطیٰ کی بہت بڑی یادگار ہے، دوسری جگہ اس کی مثال نہیں ملتی! اگر ایک مؤرخ کے الفاظ دہرائے جائیں تو "تاجدارانِ قطب شاہی درعلوہمت فراخی حوصلہ و قابلیت درتمامی دُنیا داران دکن ممتاز بودند"[1]۔ اکیلا شہر حیدر آباد اور اس کی تعمیر قطب شاہوں کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے اس شہر نے تلنگانے کے طول وعرض میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس وقت حیدر آباد واحد شہر ہے جو پورے آندھرا کی تمدنی خدمت کر رہا ہے اور یہ قطب شاہوں کا عطیہ ہے۔ اس شہر کی تعمیر کے بہت سے محرکات تھے[2]۔ بات یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد تک سلطنت کا مستقر صرف گولکنڈہ تھا جہاں مرکزی حکومت تھی

---

[1] ماہ نامہ ص ۳۰۔

[2] اس شہر کی آبادی کا سب سے بڑا محرک یہ بتایا جاتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کو بھاگ متی یا بھاگیا متی نامی ایک تلنگن سے عشق تھا جو موضع چچلم میں رہتی تھی۔ یہ اپنے زمانۂ شہزادگی میں اس عورت کی خاطر اس موضع میں آیا کرتا تھا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پُرانے پل کی تعمیر بھی اسی عشق ومحبت کی یادگار ہے۔ جب یہ خود بادشاہ ہوا تو اسی عورت کی کشش میں اس نے شہر حیدر آباد کی بنیاد ڈالی اور اسی عورت کے نام سے بھاگ نگر نام رکھا۔

حصار کے اندر عام آبادی تھی، اگرچہ اس کی بنیاد سلطان قلی نے رکھی تھی لیکن اس کی تمام تعمیر و استحکام ابراہیم قطب شاہ نے کیا، اور سلطنت کی ترقی کے ساتھ یہ بھی ایک بہت بڑا شہر ہو گیا تھا، اور اس میں تمام شہری ضرورتیں بہم پہنچائی گئی تھیں چنانچہ ایک مؤرخ کے الفاظ میں "از وسعت آن بمرتبہ نقل می نمایند کہ تا چہل ہزار سوار اندرون حصار می گنجید عمارتہائے عالی دل نشین با فضا داشت"[1] لیکن اس کی آبادی ہر روز بڑھ رہی تھی اور آبادی کی کثرت سے نہ صرف تنگی محسوس ہوتی تھی بلکہ آب و ہوا خراب ہو رہی تھی، چنانچہ ایک مؤرخ کہتا ہے کہ "بہ سبب کثرت آبادی و ازدہام مردم ہوائے آنجا تغیر یافتہ بہ فساد گرائیدہ موجب ابتلائے مردم بہ آلام و اسقام گردید"[2] اس کے علاوہ خود سلطنت کے اغراض و مقاصد اس قدر وسیع ہوتے جا رہے تھے کہ ان کے رو براہ کرنے کے لیے گولکنڈے کا مستقر کافی نہیں تھا۔ باہر کے سفراء جو مختلف سلطنتوں کی طرف سے

تقریباً ہر مؤرخ اور ہر سیاح نے یہ روایت بیان کی ہے۔ مآثر عالمگیری ص ۳۰۲۔ خافی خاں جلد سوم ص ۳۸۴۔ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۲۔ اس طرح اس روایت میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ماہ نامہ کا مولف کہتا ہے کہ محمد قلی نے یہ شہر اپنی ماں بھاگ رتی کی خواہش سے آباد کیا تھا، اور اسی کے نام سے بھاگ نگر موسوم کیا تھا۔ وہ اس کی معشوقہ نہ تھی۔ ماہ نامہ ص ۲۸۸۔ یہ روایت کچھ بحث طلب ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے جو اس عہد کی مستند تاریخ ہے اس کا سرے سے ذکر نہیں کیا، اور وہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ موضع چچلم میں جہاں اب شہر حیدر آباد ہے شکار کے لیے آیا تھا، یہ جگہ اس کو بہت پسند آگئی اور اس کو شہر کے لیے منتخب کر لیا۔ لیکن اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولف بھاگ متی کے قصے کو چھپانا چاہتا ہے۔

[1] خافی خاں جلد سوم ص ۲۸۷۔

[2] حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۲۱۴۔ خافی خاں جلد سوم ص ۳۸۴۔

آیا کرتے تھے گولکنڈے میں قطب شاہوں کے شایان شان خیر مقدم نہیں ہوسکتا تھا۔ ایشائی مملکتوں کے علاوہ مغربی ممالک کے سیاح بھی یہاں آتے تھے اور برسوں رہتے تھے نیز سلطنت کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے علما اور تاجروں کا علحدہ جمگھٹا ہو رہا تھا خود حکومت ان سے کام لیتی تھی اور ان نو واردوں کی وجہ سے گولکنڈے کے باہر چرچے ہوتے تھے خود محمد قلی قطب شاہ کی بلند خیالی ایک وسیع اور متمدن شہر کی طالب تھی گولکنڈے کا پُرانا شہر اس بلند ہمت بادشاہ کے حوصلوں کا جواب نہیں تھا چنانچہ ان حالات میں شہر بھاگ نگر یا حیدر آباد کی مبارک تاسیس بہت ضروری ہوگئی۔

شہر حیدر آباد کی بنیاد محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ سال کے بعد رکھی گئی تھی۔ یہ آندھرا دیش کی مبارک گھڑی تھی جبکہ ۹۹۹ھ ۱۵۹۰ء میں شہر بھاگ نگر یا حیدر آباد کی بنیاد رکھی گئی[1] گو اس کی تکمیل کئی سال کے بعد ہوئی لیکن جس اہتمام اور سلیقے سے اس شہر کی تعمیر کی گئی تھی وہ قرونِ وسطیٰ کا اعجوبہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کو شہر کی تاسیس اور آبادکاری کا خاص ذوق اور سلیقہ تھا۔ شہر کا ایسا اچھا ڈھنگ ڈالا گیا کہ قرونِ وسطیٰ میں اس کی نظیر نہ تھی پہلے دریائے موسیٰ کی خوشگوار وادی میں اس کا ڈھنگ ڈالا گیا، اس سے نہ صرف پانی کی ضرورت پوری ہوئی بلکہ شہر کی رونق بھی بڑھی۔ دوسرے شہر کے بیچ میں

---

[1] بھاگ متی کے اصل نام سے اس شہر کا نام بھاگ نگر رکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بادشاہ نے بھاگ متی کو بہت عزت دی، اس کے جلوس کے لیے بارہ ہزار سوار مقرر کیے اور اس کو حیدر محل کا خطاب دیا، اور اسی خطاب کے مطابق شہر کا نام بھی حیدر آباد کر دیا گیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے حیدر محل کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی تھی، اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

حیدر محل میانے نا بات گھول ساجے	دن دن انند سینے طبلان مدن کے باجے
اس سرو قد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا	عشق کے پاتران سب اس کاں دیکھ لاجے

چارمینار کی سڈول عمارت قایم کر کے چاروں طرف سیدھی سڑکیں بنائی گئیں۔ چارمینار کی بنیاد سے اس شہر کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ وہ عجیب دلفریب منظر تھا کہ موضع چچلم کے چھوٹے بڑے معمار تلنگی گیتوں کے کورس میں چارمینار کی تعمیر کرتے تھے اور اس کا مسالہ جمع کرتے تھے، غالباً یہ ڈیڑھ دو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ اخذ ہوتی ہے۔ خود چارمینار کی عمارت تعمیر کاری کا بہترین نمونہ ہے اور دُنیا میں ایسی عمارتیں بہت کم پائی جاتی ہیں اور فرانسیسی سیاح تھیونو کے الفاظ میں یہ ایک مہتم بالشان عمارت ہے[1]۔ اور اس کے چاروں طرف چار سیدھی سڑکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی تعمیر میں خاص ضابطہ اور سلیقہ ملحوظ تھا، اور شہروں کی طرح یہ شہر بھاگ نگر خود رو نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص نقشہ کے مطابق بنایا گیا۔ سڑکوں کے دونوں طرف عمارتوں کی تعمیر کا خاص اسلوب مقرر کیا گیا، چوراہے متساوی الاضلاع بنائے گئے اور بازار بنائے گئے تو ان میں دُکانوں کا یہ انتظام تھا کہ ہر دُکان کے سامنے ایک برآمدہ بنایا گیا تھا تاکہ خوش نمائی بھی ہو، اور تاجروں و گاہکوں کو دھوپ اور پانی سے آرام ملے۔

لیکن شہر کی تعمیر صرف اس مختصر خاکے پر منحصر نہ تھی۔ قطب شاہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ملک میں ایک اجتماعی زندگی پیدا ہو تاکہ اہلِ شہر ایک جگہ رہ کر اپنے ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ترقی دے سکیں اور اس کا اثر تمام ملک میں پھیلے اس لیے اہلِ شہر کی بود و باش کے لیے خاطر خواہ سہولت اور اُن کی عمرانی ضرورتیں بہم پہنچائی گئیں۔ چنانچہ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں، چنانچہ اس شہر میں چار بازار بنائے گئے جہاں اہلِ شہر کی تمام مایحتاج میسر آتی تھیں۔ ان بازاروں میں چودہ ہزار دُکانیں تھیں۔ دُکانوں کی ان تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تمدن معاشرت کی

---

[1] تھیونو، حصہ سوم ص ۹۵۔ اس اکیلی عمارت کی تعمیر میں تین لاکھ ہون صرف ہوئے تھے۔

ہزار ہا اشیا فروخت ہوتی ہوں گی اس کے علاوہ اہلِ شہر کی معاشرتی اور مذہبی ضروریات کے لیے بے شمار محلے۔ حمام۔ خانقاہیں۔ مدرسے۔ مسجدیں لنگر خانے۔ مہمان خانے اور کارواں سرائیں بنائی گئیں ان عمارتوں کی تعداد کوئی بارہ ہزار بتائی جاتی ہے اور غالباً اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے محلات کو چھوڑ کر محمد قلی قطب شاہ کے عہد کی اکثر عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ چارمینار کے پاس جو جامع مسجد بنائی گئی تھی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ تعمیر کاری کا بہت اچھا نمونہ ہے، اس کے احاطہ میں ایک حمام بنایا گیا جو اب تک موجود ہے۔ چھوٹے مہمان خانوں کے علاوہ بڑے کاروان سرائے بنائے گئے جہاں ایک وقت میں بڑے قافلے ٹھیر سکتے تھے۔ پرانے پل کے پاس ایک بڑی کاروان سرائے موجود ہے۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ خود شہر میں چار پانچ کاروان سرائیں موجود ہیں جو دو منزلہ ہیں۔[1] تعلیم کے لیے مدرسوں کا انتظام تھا۔ بیماروں کے لیے ایک بہت بڑا اسپتال "دارالشفا" کے نام سے تعمیر کیا تھا جس کے بوسیدہ در و دیوار اب تک موجود ہیں اور محمد قلی قطب کی تمدنی عظمت کی یاد تازہ کرتے ہیں، اس میں شاہی طبیب اور جرّاح کام کرتے تھے۔ مریضوں کو دوا و غذا مفت دی جاتی تھی[2] اس کے علاوہ شہر میں ہر جگہ پانی کی نہریں دوڑتی تھیں اور راستوں پر سایہ دار درخت نصب کیے گئے تھے۔[3]

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیر ص ۱۲۳۔

[2] تاریخ ظفرہ ص ۱۳۱۔

[3] حیدر آباد کے ایک مؤرخ نے شہر کے اس تعمیری اہتمام کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔

"شہرے مشتمل بر چہار بازار و چہار طاقہائے رفیع۔ در ہر بازارے چند چہار سو کہ بہندی چوراہہ گویند متساوی الاضلاع و سوائے آن بازار ہائے دیگر و در اکثر بازار ہا دو طرف جداول آب روان۔ بر کنار جداول درختان سایہ دار۔ دکاکین چہار دہ ہزار گفتہ اند در پیش ہر دکان ایوانے و ما ورائے این از محلہ ہا و حمام ہا و خانقاہ و مدرسہ و

اس شہر میں شاہی بود و باش اور امورِ سلطنت کے سرانجام کے لیے بے شمار محلات بنائے گئے تھے، ان کی بہت بڑی تفصیل ہے انھیں سے شہر کی عظمت تھی۔ چار مینار کے شمالی رُخ میں مساوی فاصلوں پر چار بلند کمانیں بنائی گئیں اور ان کے درمیان گلزار حوض بنایا گیا، اور اس کی مغربی سمت میں عام شاہی محلات کی تعمیر ہوئی۔ دادمحل جو عدل گستری کے لیے بنایا گیا تھا وہ بہت عظیم الشان تھا، اُس کی کئی منزلیں تھیں اور ہر منزل میں بڑے بڑے ایوان تھے۔ یہ اس قدر عظیم الشان محل تھا کہ بیرونی سیاح بھی اس کی تعریف کرتے ہیں موسٰی ندی کے کنارے ندی محل کے نام سے ایک عظیم الشان محل بنایا گیا تھا جہاں سے ندی کا اچھا نظارہ ہوتا تھا اس کے بہترین موقع و محل اور نفیس تعمیر کاری کی بہت تعریف کی جاتی ہے اگرچہ اب وہ باقی نہیں رہا لیکن اس کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے اس کے الفاظ سے اس کی عظمت کا پتا چلتا ہے :-

قصیدہ

این مقام خوش کہ مستغنی است از نقش و نگار	ہست با جنات تجری تحتہا الانہار یار
فرخ آن منزل کہ شاہی را بود در روے نشست	روشن آن محفل کہ ماہی را بود بر روے گلزار

مسجد و لنگر و مہمان خانہا و دوازدہ ہزار مکان بر لوح عمارت کشیدند و جانب شمال را مرکز دولت و مستقر سلطنت قرار دادہ ایوانہائے عالی و قصرہائے رفیع نمودار گردانیدند و در احسن اوقات و یمن ساعات بنائے این شہر فرخندہ اثر نہادہ مجموع عمارات کوچہ و بازار وغیرہ را از سنگ و آہک بہ تکلف ہرچہ تمامتر بر آوردند و منازل بادشاہی بہ نوعے ساختند کہ مسافران اقالیم سبعہ نظیر آن در ہیچ ملک نشان ندیدہ اند۔ بالجملہ چو خسرو زمان چنان شہر را کہ در تمام مملکت ہندوستان شرقاً و غرباً جنوباً و شمالاً باعتبار مطبوعیت عدیلے ندارد و طرح افگند۔" (حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۲۱۵)۔

بیقراران قرار دل فزاید چون در آن | جائے آن دارد کہ باشد نام او دار القرار
چون دل دانا درو پیداست صورتہائے غیب | بسکہ معقول است دیوار و درش آئینہ دار

ان محلات کے علاوہ داد محل کے قریب ایک اور محل خداداد محل بنایا گیا تھا جو بلند ترین تھا، اس کی سات منزلیں تھیں، چونکہ ہر منزل اتنی بڑی اور عظیم الشان تھی کہ بجائے خود ایک محل تھا، اس لیے ہر منزل کا نام علٰحدہ رکھا گیا۔ ساتویں منزل الٰہی محل۔ چھٹی منزل محمدی محل۔ پانچویں منزل حیدری محل، چوتھی منزل حسنی محل۔ تیسری منزل حسینی محل۔ دوسری منزل جعفری محل اور پہلی منزل موسوی محل کے نام سے موسوم تھی، اور اس میں بزرگوں کے نام سے تقدّس بھی پیدا کیا گیا تھا، میرک معین سبزواری نے جو احمد نگر کا حاجب تھا ذیل کی رباعی میں اس کی تعریف کی تھی ؎

این قصر کہ ہست رشک افزائے بہشت | ایام بہ آب زندگانیش نوشت
تاریخ مرتب شدن اش کلک قضا | برلوح بقا بنائے جان بخش نوشت

نبات گھاٹ باغ محمد شاہی اور کوہ طور کی تعمیر یں ایک علٰحدہ مضمون کی طالب ہیں اور ان سے محمد قلی کا بلند حوصلہ ظاہر ہوتا ہے۔ کوہ طور کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی:۔

قطعہ

ازان ایوان چہ گویم کز لطافت | جہان رانسخۂ خلد برین است
خم طاق بلندش چون مہ نو | ز رفعت تا فلک پہلو نشین است

جب اس محل کی جو کوہ طور میں ترتیب دیا گیا تھا تکمیل ہوئی تو اس میں بڑی مسرت کا اظہار ہوا، اور تمام اُمراء و روساء سلطنت کو خلعتِ فاخرہ عطا ہوئے تھے۔ میر ابو طالب جو محمد قلی قطب شاہ کا ناظر تھا بیان کرتا ہے کہ حیدر آباد اور اس کی عمارتوں کی تعمیر میں ستّر لاکھ ہون صرف ہوئے تھے۔[۱] گولکنڈے کے اُمراء بھی شہر کو سجانے میں

---

[۱] تاریخ ظفرہ ص ۱۲۱۔

حصہ لیتے تھے۔

شہر و عمارات کی یہ خوش اسلوبی اور عظمت کے مدِ نظر تاریخ کے یہ الفاظ کہ: "در تمامی ہندوستان عدیلے ندارد" صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ بیرونی سیاح اور مؤرخوں نے جو بالکل غیر جانبدار تھے شہر حیدرآباد اور اس کی عمارتوں کی اس سے زیادہ تعریف کی تھی۔ فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے جو گولکنڈے میں کئی مرتبہ آیا تھا بہت تعریف کرتا ہے: "شہر نہایت سلیقے سے بنایا گیا ہے اور اس میں بڑے بڑے راستے ہیں"[1] ولیم متھولڈ کہتا ہے کہ: "شہر حیدرآباد اپنی خوشگوار آب و ہوا، اور پانی کی بہتات کی بدولت ہندوستان کا بہترین شہر ہے"[2] یہ سیاح شمال کے تمام شہنشاہی شہروں سے واقف تھے۔ مؤرخ فرشتہ نے جس کو قطب شاہی سلطنت سے کوئی واسطہ نہ تھا ان الفاظ میں تعریف کی تھی: "شہرے کہ در تمامی ہندوستان شرقاً و غرباً شمالاً و جنوباً مثل آن در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"[3] فرشتہ کے عہد میں جو محمد قلی قطب شاہ کا ہمعصر تھا شہنشاہی شہر آگرہ اور لاہور آباد تھے، خصوصاً فتح پور سیکری جو اکبر اعظم کا آباد کیا ہوا تھا بڑا بارونق شہر تھا، اور فرشتہ ان سے ناواقف نہ تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد کے مؤرخ حیدرآباد کی اس سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ خافی خاں کہتا ہے کہ: "حوضہائے آن شہر لطافت و آب و ہوائے آن سرزمین و حسن ہائے نمکین آن سبز فام و سیر حاصلی آن مرز بوم اگر بہ دازم از سر رشتہ سخن باز می مانم"[4] محمد ساقی نے جو شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مؤرخ تھا، اور گولکنڈے کے محاصرے کے وقت حیدرآباد میں موجود تھا اس کی پُر زور الفاظ میں تعریف

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۴۳۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۹۔

[3] تاریخ فرشتہ مقالۂ سوم روضۂ چہارم ص ۱۷۳۔

[4] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۸۔

کی ہے: "آرامگاہے است بر قطعۂ زمین و بہشت، راحت جسم و آرام جان۔ آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال عمارات رفیع تر از پایۂ اندیشہ۔ رطوبت ہوا و عذوبت روانی چشمہا شادابی سبزہ بہ مرتبہ کہ پنداری گل و سبزہ این سرزمین را آب و رنگ زمرد و لعل است"[1]۔ یہ دونوں مؤرخ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے اور اس زمانے کے لوگ تھے جبکہ مغل تمدن و شہریت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی تھی، اس کے باوجود شہر حیدر آباد کی ان الفاظ میں تعریف کرنا قطب شاہی تمدنی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ خود شہنشاہ گولکنڈے کی تسخیر کے بعد شہر حیدر آباد میں آئے تو اس کی رونق اور شاہی عمارات کی عظمت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اس قدر دلچسپی ہوئی کہ یہاں بہت دنوں تک رہ گئے۔ اس زمانے میں خود اہلِ حیدر آباد بھی یہ سمجھتے تھے کہ شہرِ حیدر آباد کے مقابلے میں ہندوستان کے شہنشاہی شہر بے حقیقت ہیں۔ جب کبھی حیدر آباد کی تعریف کی جاتی تو ایران کے شہروں کی مثال دی جاتی تھی۔ آگرہ۔ لاہور، اور شاہجہاں آباد کا کسی نے نام نہیں لیا۔ چنانچہ حضرت میر مومنؒ نے قصیدۂ تہنیت میں لکھا تھا ؎

حیدر آباد از نوشد شاہا صفاہانِ نوے　　　چو صفاہان نوشد از شاہجہاں عباس شاہ

شاہی عمارتیں

قطب شاہی عمارتیں بھی بڑے ذوق و سلیقے سے بنائی گئی تھیں، اگرچہ ان عمارتوں میں وہ لطافت نہیں ہے جو عادل شاہی عمارتوں میں پائی جاتی ہے، تاہم یہ بہت بلند اور مضبوط ہیں، ان سے قطب شاہوں کی بلند خیالی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت وہ تمام شاہی قصر موجود ہوتے جو حیدر آباد میں بنائے گئے تھے تو ان سے قطب شاہوں کی حقیقی عظمت ظاہر ہوتی، تاہم جو آثار اس وقت پائے جاتے ہیں وہ بھی اس حقیقت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قطب شاہی عمارتوں پر لاکھوں روپیہ اور بڑی محنت صرف ہوئی۔ بعض عمارتیں ایسی بنائی گئیں جو کئی عہدوں میں جا کر تیار

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۰۲۔

ہوئیں۔ اگرچہ ان عمارتوں کے بنانے والے جانتے تھے کہ یہ ان کی مختصر زندگی میں ختم نہ ہوسکیں گی لیکن ان کی بلند خیالی اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی کہ کوئی چیز ان کے حوصلے سے کم بنے۔ چار مینار اور مکہ مسجد تو ایسی عمارتیں ہیں جو دُنیا کے عجائبات میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان کی رفعت و عظمت کا دُنیا میں کوئی جواب نہیں۔ مکہ مسجد دُنیا کی بہت بڑی عمارت ہے، سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ رنگیا میستری اور فیض اللہ بیگ انجینیر نے اس کا کام شروع کیا تھا، لیکن ۷۷ سال میں یہ کام ختم ہوا، اور یہ اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا جبکہ اورنگ زیب کی عملداری قایم ہوگئی۔ ہزاروں آدمیوں نے اس پر کام کیا ہے، اس کی اکیلی محراب جو صرف ایک پتھر سے تراشی گئی ہے پانچ سال میں تیار ہوئی تھی، اور پانچ ہزار آدمیوں نے اس پر کام کیا تھا۔ جس وقت فرانسیسی سیاح ٹیورنیر گولکنڈہ آیا تھا ابھی یہ مسجد ناتمام تھی۔ اس نامکمل مسجد کو دیکھ کر اس نے کہا تھا کہ "اگر یہ پوری ہوجائے تو دُنیا میں سب سے بڑی اور ایشیا میں سب سے بہترین عمارت ہوگی"[1]۔ اگر اورنگ زیب کی کفایت شعاری حائل نہ ہوتی تو اس کے مینار آج سلطان محمد کی حقیقی بلند خیالی ظاہر کرتے، لیکن اس کوتاہی کے باوجود حیدرآباد کا یہ "بیت العتیق" قطب شاہوں کی اصل عظمت کو یاد دلاتا ہے۔ آج بھی حیدرآباد میں یہ واقعہ سب کو یاد ہے کہ زہد و تقویٰ کے بڑے دعوے کے ساتھ اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، چوبیس گھنٹوں میں کبھی یہ مسجد عبادت گزاروں سے خالی نہیں رہتی۔ غالباً اسی وجہ سے یہ مکہ مسجد کہلاتی ہے۔ ایک شاعر نے کہا تھا ؎

طوافِ خانۂ اشرف گرت میسر نیست — بیا بہ کعبۂ مُلکِ دکن عبادت کن

قطب شاہوں کی حقیقی عظمت ان کے محلات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے دوسو سال کی تاریخ میں قطب شاہوں نے اتنے قصر اور محل بنائے تھے جو غالباً دُنیا کے کسی شاہی خاندان نے نہیں بنائے۔ خود گولکنڈے کے اندر جو سلطنت کا اصلی مستقر تھا بے شمار محل بنائے گئے تھے۔ اس کی ابتدا غالباً ابراہیم قطب شاہ نے کی تھی اس کے عہد میں سب سے پہلے

---

[1] سفرنامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۴۔

ایک ایوانِ شاہی بنایا گیا جو دولت خانۂ عالی کے نام سے موسوم ہے اس کے علاوہ چند اور محل۔ باغ اور عمارتیں بنائی تھیں، چنانچہ باغ گلشن، ابراہیم باغ۔ لنگر دوازدہ امام۔ بارہ دری مشہور ہیں لیکن قطب شاہی سلطنت کی حقیقی تعمیر کاری محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہوئی جو اس خاندان کا بڑا معمار ہے اس کی مشہور عمارتیں دادمحل اور خدادادمحل تھیں جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ خدادادمحل کی محمد قلی قطب شاہ نے ان الفاظ میں تعریف کی تھی ؎

خدادادمحل کوں محمد سنوارے — نو اس میں جنت کے نگاراں نگارے

بلندی محل کا ہے اسمان جیسا — سورج، چاند، تارے سو اس تھے سنگارے

نہ اس جگ میں دیکھے کوئی ایسے محل کوں — گرو ہرت پر قدسیاں لاکے ٹھارے الخ

سجن محل اور اعلیٰ محل ان کے علاوہ تھے جن کی بادشاہ نے ان الفاظ میں تعریف کی تھی ؎

سا جنی سجن محل میں ساج کر چھنداں سو آتی — جان جانی ہو کے جاں کا پیالا سو مجکوں پلائی الخ

اعلیٰ محل اعلیٰ وسے اعلیٰ خوشیاں مھتر گھڑی — اعلیٰ سکی اعلیٰ دسے جوبن کھڑی دو دان بھری الخ

اور دریائے موسیٰ کے کنارے ندی محل کے نام سے ایک پُر فضا محل بنایا گیا تھا جو ندی کی روانی کے ساتھ عجیب منظر پیدا کرتا تھا۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کی مشہور عمارتوں میں "کوہ طور"، "بنات گھاٹ" بھی شامل ہیں۔ یہ عمارتیں شہر سے قریب بلندی پر تعمیر کی گئی تھیں اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی تھیں اور ان کے اطراف نہریں اور آبشاریں تھیں۔ چوطرف فوارہ دار حوض تھے[1]۔ محمد قلی قطب شاہ نے خود ایک نظم میں "کوہ طور" کی یوں تعریف کی تھی

کہہ طور پر سدا ہے سبحان کا اُجالا — تو خلق سرمہ کرتی رحمان کا اُجالا

اس طور کا سو ٹھارا مانند ہشت بہشت ہے — اس نور تل چھپیا ہے اسمان کا اُجالا

---

[1] تاریخ ظفرہ ص ۱۸۔

مشک محل اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے علحٰدہ شہرت رکھتا تھا، اور گولکنڈے کی ایک تاریخ کے الفاظ میں "مثل آن قصرہا بروے زمین بنا، نشدہ" سلطان محمد قطب شاہ نے خود کئی محل تعمیر کیے تھے، اس کا بنایا ہوا امان محل اکیلا بہت بڑی تفصیل کا محتاج ہے، محل کی آرائش اور اس کے ساتھ جو باغ محمد شاہی بنا تھا اس کی دلچسپیاں سلطان محمد کے حقیقی ذوق کو ظاہر کرتی تھیں، اس کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا تھا کہ ؎

وہ چہ قصرے کہ زرفعت تا فلک بوسد درش　　وہ چہ باغے کز لطافت ہست چون باغ جنان

عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی بڑی بڑی عمارتیں بنی تھیں۔ نظام الدین ایک بہت بڑے محل کا ذکر کرتا ہے جو چار منزل بنایا گیا تھا. گو اس کا نام نہیں معلوم ہوتا اس میں صندل کی لکڑی اور ہاتھی دانت استعمال کیے گئے، اور اندر دیواروں پر رنگ کا کام کیا گیا تھا، اور اس میں تصویریں بھی تھیں اس نظم میں اس محل کی تعریف کی گئی تھی ؎

قصر عالی بنائے شاہنشاہ　　ہست بر کلہ زمین چو کلاہ
تاج بر سر نہادہ شخص زمین　　میکند فخر بر سپہر برین الخ[1]

اس کے علاوہ عبد اللہ قطب شاہ نے نبی باغ اور باغِ لنگم پلی بنائے تھے، دونوں باغ شہر کے شمال میں واقع تھے۔ باغ لنگم پلی میں تین منزلہ محل بھی بنایا تھا جس کے آثار اب تک موجود ہیں ان باغوں میں بڑے سلیقے کے ساتھ درخت اور پودے لگائے گئے اور کیاریاں بنائی گئیں اور ان میں آب رسانی کا اچھا انتظام تھا۔ ابو الحسن قطب شاہ نے بھی ندی کے کنارے ایک بہت بڑا محل بنایا تھا جو "چار محل" کے نام سے موسوم تھا۔ اس میں چار عمارتیں تھیں اور ان کے بیچ میں ایک بڑا حوض تھا، اور ندی کے کنارے بلندی کی وجہ سے دل فریب منظر پیدا کرتا تھا۔ شہر کے شمالی جانب "گوشہ محل" کے نام سے ایک اور محل تعمیر ہوا تھا جس کے

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۴۷۔

آثار اب تک موجود ہیں اور اس کے قریب ایک بہت بڑا حوض بنایا گیا تھا۔

اگرچہ زمانے کی ستم ظریفی نے ان عمارتوں کا خاتمہ کر دیا، اور جو باقی ہیں وہ بھی فنا ہو رہی ہیں۔ لیکن ان کی بوسیدہ در و دیوار سے قطب شاہوں کی تمدنی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عمارتوں کے مسلسل وسیع دالان۔ بادشاہوں اور بادشاہ بیگموں کی رہائش کا شان دار انتظام اور شاہ نشین کا تزک و احتشام الفاظ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا، اور جب شہرِ حیدر آباد میں شاہی قصر تعمیر ہوئے تو پُر عظمت لوازم سے ان کی رونق بڑھائی گئی۔ کمان سحر باطل، شاہی دولت سرا کا در داخلہ تھا، اس کمان میں ایک عظیم الشان دروازہ تھا جس پر سونے کا کام تھا، اور اس کے مقابل کالی کمان کے پاس نوبت بجتی تھی اور ان دونوں کمانوں کے درمیان شاہی حفاظت کے لیے فوجیں کھڑی ہوتی تھیں اور ہاتھی جھومتے تھے اور ایک عجیب حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام شاہی عمارتوں میں آب رسانی کا عجیب انتظام تھا تمام محلوں کے اندر نلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بلند دیواروں اور چھتوں پر پانی پہنچایا گیا چھتوں پر بھی پانی کے چشمے تھے۔[1] ہر محل کے ارد گرد باغبانی کا بڑا اچھا انتظام تھا ان کے علاوہ جو مستقل باغ تھے ان کی رونق و شادابی ایک پُر لطف منظر پیدا کرتی تھی۔ ان میں ہر جگہ نہریں دوڑتی تھیں اور حوض و فوارے تھے اور جا بجا سیدھی اور خوشنما روشیں بنی ہوئی تھیں جن کی دونوں جانب گل داودی کی قطاریں ہوتی تھیں اور موقع کی مناسبت سے کھجور اور ناریل کے درخت نصب کیے جاتے تھے[2] اور غالباً یہ خاص ذوق و سلیقہ قطب شاہوں کے لیے

---

[1] تھیونو ان محلات کی بہت تعریف کرتا ہے، اس کا بیان ہے کہ ان بلند محلوں کی آخری منزلوں پر بھی پانی پہنچایا جاتا ہے، نیز وہ یہ بھی کہتا ہے کہ چار مینار کی بلندی پر بھی پانی پہنچتا ہے (تھیونو حصہ سوم ص ۹۴-۹۵) قلعۂ گولکنڈے میں اس وقت جو عمارتیں موجود ہیں ان میں نلوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔

[2] تھیونو حصہ سوم ص ۹۵۔

مختص تھا، اور جگہ اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ خود مغل شہنشاہ اور شہزادے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے جب شہنشاہ اورنگ زیب کا چھوٹا بیٹا شہزادہ محمد کام بخش حیدر آباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قطب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنی سکونت کے لیے ایک علحدہ مکان تعمیر کر لیا جس کو شہنشاہ اسراف سمجھتے تھے۔ لیکن شہزادے نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ قطب شاہی محلوں میں رہنا اس سے زیادہ اسراف ہے قطب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پر عظمت ہیں کہ ان کی کما حقہٗ پرداخت تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے[1]۔ ایک تیموری شہزادے کے یہ الفاظ جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا بہت معنی خیز ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی قصر مغل عمارتوں سے کم نہیں تھے۔ دوسرے سیاحوں کے بیان سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے[2]۔

رفاہ عام

باغات و محلات کے علاوہ قطب شاہوں کے رفاہ عام کے کام بھی قابل ذکر ہیں اور سب سے پہلے ابراہیم قطب شاہ نے مساجد، مدارس اور تالاب تعمیر کیے۔ اس کے بنائے ہوئے تالاب حسین ساگر، ابراہیم پٹن اور بدویل بہت مشہور ہیں جو آب پاشی اور آب رسانی کے کام آتے تھے۔ حسین ساگر کی تعمیر جو حضرت حسین شاہ ولی کی نگرانی میں ہوئی تھی آٹھ مہینے میں ختم ہوئی اور اس پر دو لاکھ ہون صرف ہوئے۔ شہر حیدر آباد اور گولکنڈے کی آمد و رفت کے لیے ایک پل بنایا گیا جو پرانا پل کہلاتا ہے اور ابراہیم کے جانشینوں کے عہد میں متعدد مدارس، کارواں سرائیں اور حمام و شفا خانے اور لنگر خانے بنائے گئے لیکن قطب شاہی دور میں حیات بخشی بیگم کی تمدنی خدمات جو اکثر رفاہ عام کی صورت میں ظاہر ہوئے ناقابل فراموش ہیں۔ حیدر آباد میں حیات ماں نے اپنی اسّی سالہ عمر میں تلنگانے کی اس قدر تمدنی خدمات انجام دیں کہ ان کا صحیح موازنہ مشکل ہے۔ پانچویں محرم کا لنگر حیات ماں کی

---

[1] گلزار آصفیہ ص ۴۔

[2] ولیم متھولڈ جو انگریز کمپنی کا ملازم تھا کہتا ہے کہ قطب شاہی محلوں کی تعریف نہیں ہو سکتی، یہ مغل محلوں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں (گولکنڈے کے تعلقات ص ۹۔

مشہور یادگار تھا جس دلچسپ اور سنسنی خیز واقع سے اس کی ابتدا ہوئی تھی وہ ابھی تک سب کو یاد ہے اور محرم میں تقریباً ہر گھر میں دہرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حسینی علم، بی بی کا علم اور بی بی کا چشمہ حیات ماں کی یادگار ہیں لیکن حیات ماں کی بہت بڑی یادگار اس کا آباد کیا ہوا حیات آباد ہے جس سے حیات بخشی بیگم کا صحیح ذوق تعمیر و آبادکاری معلوم ہوتا ہے، یہ ۱۰۳۵ھ میں عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے پہلے سال تعمیر کیا گیا، غالباً اس کا مقصد اس تخت نشینی کی یادگار قایم کرنا تھا، اور یہ ایک اچھی یادگار ہے۔ اول تو یہ حیدرآباد کے مشرق میں بہت قریب واقع ہے جہاں شاہی تفریحیں اور تقریبیں ہو سکتی تھیں، دوسرے مسولی پٹم کی شاہ راہ پر آباد کیا گیا تھا تاکہ جو مسافر مشرقی بندرگاہوں سے اور ملک کے مشرقی اضلاع سے حیدرآباد آتے تھے وہ یہاں ٹھیرتے تھے اور اس طریقے سے شہر سے قریب ایک اچھی منزل تھی حیات آباد میں شاہی قصر بنایا گیا، مسافروں کے لیے ایک کاروان سرائے بنائی گئی جو "سرائے ماں صاحب" کے نام سے موسوم ہے، اس کے کئی دروازے ہیں اس کے احاطہ میں ایک مسجد ہے جو قطب شاہی تعمیر کاری کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کے قریب جو "خاص باغ" بنایا گیا تھا اب تک موجود ہے اور بچوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا، اس سے حیات ماں کے عہد کی رونق اور چہل پہل کا اندازہ ہو سکتا ہے، چنانچہ اس کے عہد کے ایک مورخ نظام الدین صاعدی نے ان الفاظ میں حیات آباد کی تعریف کی تھی:۔

"حیات آباد کہ قطعہ ایست از بہشت برین و بقعہ ایست جنت آئین و در دو فرسخ جانب شرق دارالسلطنت حیدرآباد صانہا اللہ فی ظل دولت ..... والفساد۔ در ابتدائے سال جلوس شرافت مانوس خانقاہ یوسف جمال بہ طرح دلنشین و طرز فردوس قرین احداث فرمودہ اند۔ از وفور اہل صنعت و حرفت و جمعیت اصناف طبقات انام و کثرت ابنیہ و عمارات رفیعہ و بسیارے باغات بساتین متشابہ بہ شہر شدہ"

تمت

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۱	گولکنڈے	گولکنڈہ	۴۳	۱۷	رہان	برہان
۱۱	۴	مبیر	امیر	۴۴	۱۵	اسدخال	اسدخاں
۱۲	۴	نصب	نسب	۴۹	۷	پڑتا	پڑے گا
"	۱۲	صلع	صلح	"	۱۱	ہوئے	ہوئی
۱۴	۲	تھا	تھی	۵۰	۱۲	سنہ ۵۴۳ء	سنہ ۱۵۴۳ء
"	۱۳	نیرد	یزد	۵۴	۲	بیجاپور	وبیجاپور
۱۷	۷	قبایل	قبائل	۵۶	۵	ڑھے	بڑھے
۱۸	۱۳	کے	کو	"	۷	اینے	اپنے
۱۹	۹	بنادے	بنادیا	"	۲	بنایا	بنادیا
۲۰	۱	سے	نے	۶۲	۱۳	کوئل گنڈہ	کوئل کنڈہ
۲۳	۸	فرشتے	فرشتہ (ہر جگہ درست فرمالیا جائے)	۶۳	۱۴	تگنلھانہ	تلنگانہ
۲۵	۱۶	بجوائے	بجوائی	۶۹	۶	بیچیدہ نہیں تھے	پیچیدہ تھے
۲۶	۵	ترعیب	ترغیب	۷۰	۱۲	گلبرگے	گلبرگہ (ہر جگہ درست فرمالیا جائے)
۲۸	۱۶	سایہ	سائر	۷۱	۱	رام راج سے	رام راج کی
۳۴	۴	اسی	ایسی	"	۱۲	ابراہیم عادل شاہ	ابراہیم نے عادل شاہ
۳۷	۳	مزاج	مزاجی	۷۲	۱۴	حسین نظام شاہ نے	حسین نظام شاہ بھی
۳۸	۳	بےچیبی	بےچینی	۷۸	۹	نقصان پہنچا	نقصان بھی پہنچا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۹	۷	ہوئی تھیں اس قدر	ہوئی تھیں اس کی اس قدر	۹۱	۱۱	تھے	رہے
〃	۸	حوصلہ افزا ثابت ہوئی	حوصلہ افزائی ہوئی	۹۲	۶	اس قابلیت	اس کی قابلیت
۸۰	۴	ضلاح	صلاح	〃	۱۴	تنہا ذمہ دار	تنہا سیاسی ذمہ دار
۸۱	۱۴	لیکن اس بات کی	لیکن اس کو اس بات کی	۹۴	۶	ناحق شناسی	حق ناشناسی
۸۲	۸	خبر نہیں ہوئی	خبر نہ ہوئی	۹۸	۲	لیلئے	کیلئے
〃	۹	ہوگئی	ہوگئی ہیں	۱۰۱	۲	ہٹالیں	ہٹالے
۸۳	۷	روبہ رو	روبرو	۱۰۲	۱۰	نی	کی
۸۶	۲	پوری	پورے	۱۰۳	۱۷	دشمو ن	دشمنون
〃	۴	پتا نہیں چلنا	پتہ نہ چلنا	۱۰۶	۱۷	بے بناد	بے پناہ
۸۷	۱۲	تلنگانے کے	تلنگانے کی	〃	۱۹	گر	مگر
۸۸	۱۶	طرح طرح	طرح طرح سے	۱۱۰	۱۷	میر مومن جو	میر مومن میں جو
〃	۱۷	کرنے تھے	کرتے	۱۱۴	۱۲	شاہزاۂ	شاہزادہ
〃	۱۸	زہزنان	رہزنان	۱۱۵	۶	کو دی جاتی	کی کی جاتی
				۱۱۶	۵	اس وجہ	اسی کی وجہ
۸۹	۷	شمال	شمالی	〃	۱۱	صحت اہم	صحت اوہم
〃	۸	چوری نرتکاب	چوری کا ارتکاب	۱۲۲	۳	جو آئینہ	جو آئینہ
〃	۱۴	علاذ	علاوہ	〃	۱۲	بے بدشگون	لئے بدشگون
۹۰	۵	صحبت سے فائدہ	صحبت سے وہ فائدہ	〃	۱۷	حسین شیرازی نجو	حسین شیرازی جو
〃	۷	سال نفی	سال کی نفی	۱۲۳	۸	رت	رتہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲۳	۱۶	بہ دولت	بدولت	۱۵۳	۱۸	ان میں اکثر	ان میں سے اکثر
۱۲۹	۱۰	بعدہی	بعد بھی	۱۶۷	۵	غداری کی پہلی	غداری کی یہ پہلی
۱۳۰	۳	بڑھائی	بڑھاتی	۱۸۴	۳	الواسطہ	بالواسطہ
″	۱۷	آمد ورفت کی	آمد و رفت شروع کی	″	۷	ابوالحسن	سید احمد
۱۳۱	۴	حلاف	خلاف	۱۸۶	۱۸	سے ابوالحسن	سے وہ ابوالحسن
″	۷	دوسرے	دوسری	۱۸۹	۲	ریلا نہیں آتا	ریلا نہ آتا
۱۳۲	۳	لیت ولعل کیا	لیت و لعل کی	۱۹۹	۵	حملہ ہی کردیا	حملہ کر ہی دیا
۱۳۳	۳	جنیز	جنیر	″	۱۸	اور وہاں سے گولکنڈے کا	پھر گولکنڈے کا
۱۳۷	۵	ستّارہ	ستارہ	۲۰۱	۵	ہوکر اپی جاگیر	ہوکر اپنی جاگیر
۱۳۹	۶	خلفائے راشدین کو	خلفائے راشدین کے بعد	″	۶	مطابق ہوکا	مطابق ہوگا
″	۱۲	صفویوں کی	صفویوں کو	″	۱۴	گذارا ند	گذارند
″	۲۰	رہنے لگتے	رہنے لگے	۲۰۳	۸	اہل ملک	اہل ملک
۱۴۹	۲	لیت ولعل کیا	لیت و لعل کی	″	۱۲	معلوم ہوتا ہے	معلوم ہوتا ہے
۱۵۰	۱۱	بہچیا لو	بہچیا لوٹے	۲۰۴	۷	باوجود ایک اپنا	باوجود اپنا ایک
″	۱۷	نذرانہ	نذرانے	″	۱۱	اب رہا	اب رہا
۱۵۱	۱۷	جانا تھا	جاتا تھا	۲۰۵	۱	کناس آباد	کناٹس آباد
۱۵۲	۱۴	لرلی	کرلی	″	۲	بخار نکالتے	بخار نکالا
۱۵۳	۱۴	میکن سیواجی	لیکن سیواجی نے	″	۹	اس پر وہ توجہ	اس پر توجہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۶	۱۰	کابدفرجام	کافرید فرجام	۲۱۴	۱	سوو ہاتھی	سونا ہاتھی
۲۰۹	۲	باب	باپ	؍؍	۲	حاجب بھی	حاجب بھی
۲۱۰	۲	ہ	یہ	؍؍	۴	شمال شمالی	شمال اور شمالی
؍؍	۳	حالا تحت	حالات کے تحت	؍؍	۷	مرلزی حکومت	مرکزی حکومت
؍؍	۳	امک مستقل	ایک مستقل	؍؍	۱۷	ابراہیم مرشکر	ابراہیم سرلشکر
؍؍	۳	مسلک وراردینا	مسلک قرار دینا	۲۱۵	۴	اورحب	اورجب
؍؍	۴	بڑامعصوبہ	بڑا منصوبہ	؍؍	۱۳	بقابہ	بقایا
؍؍	۵	وکس	دکن	؍؍	۱۳	ایک نہیں سنی	ایک نہ سنی
؍؍	۶	ندھادھند	اندھادھند	؍؍	۱۴	عبداللہ بارہہ	عبداللہ بارہہ
؍؍	۷	ہندو ان	ہندوستان	؍؍	۱۷	لقب	لقب تھا
؍؍	۱۱	ذہں میں	ذہن میں	۲۱۶	۱	ہاتھی وگھوڑے	ہاتھی اور گھوڑے
؍؍	۱۶	سنہ ۱۶۸۳ء ۱	سنہ ۱۶۸۳ء ۱۰۹۵ھ	۲۱۷	۱۵	شمشیرپہ نومائی	شمشیر آزمائی
؍؍	۱۸	چھوٹی موٹی	چھوٹی چھوٹی	۲۱۹	۳	پیدا ہوگئی	پیدا ہوگئی تھی
۲۱۱	۳	گرو سال	گردو سال	۲۲۰	۱۴	محمد تقی محمد داؤد	محمد تقی اور محمد داؤد
؍؍	۴	مدد کرلی	مدد کرنی	؍؍	؍؍	نے سلطنت سے	نے بھی سلطنت سے
؍؍	۱۳	بنایا تھا	بنا دیا تھا	۲۲۵	۴	بہادر خاں کی ملامت	بہادر خاں کو ملامت
۲۱۲	۴	اس لیے ابوالحسن	چنانچہ ابوالحسن	؍؍	۱۴	آہستہ سفر	آہستہ آہستہ سفر
؍؍	۹	فرانر	فرائر	۲۴۱	۲	ابوالحسن	بوالحسن

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۱	۶	جامہ	جا بہ				
۲۴۶	۶	گھٹ گئی	گھٹ گئی تھی	۲۵۰	۹	ہے شاہ	ہے شبہہ
"	۱۱	اورنگ کو	اورنگ آباد کو	۲۵۱	۱۳	اثنا عشرہ	اثنا عشر
"	۱۱	پائے بنالیا	پائے تخت بنالیا	۲۵۴	۱۱	کہ ایک مقامی	کہ یہ ایک مقامی
۲۴۷	۸	بہ آں حدلے	بہ آں حدے	۲۵۸	۱۵	تو اس قدر	تو اتنی قدر
"	۱۳	افتادن نان	افتادن ناں	۲۶۲	۶	اعضائے املا	اعضائے عاملہ
"	۱۵	عالم مردم	عالم عالم مردم	۲۶۴	۲	بہ دولت	بدولت
"	۱۶	ثمرہ	شمردہ	"	۱۴	سمنوں ومحالات	سمنوں اور محالات
"	"	ازآن	ازاں	۲۶۶	۱۰	صوبوں و اضلاع	صوبوں اور اضلاع
"	۱۸	بعضے قائم	بعضے جا قایم	"	۱۵	پچھلے	پہلے
"	۱۸	دحوالی حیدرآباد	داحوال حیدرآباد	۲۷۲	۱۵	آج صدیوں	آج سے صدیوں
۲۴۸	۱	نماید	نماند	۲۷۶	۴	جنگلات	جنگلوں
"	۵	گولکنڈہ	گلکنڈہ	۲۷۸	۶	کرلیے تھے	کرلیا تھا
۲۴۹	۱۴	کے انتقال	کے سنہ انتقال	۲۸۰	۷	پیدا ہوتا تھا	تیار ہوتا تھا